قدیم تاریخِ تھل

اور

روڑاں کے آثارِ قدیمہ

ملک محمد شفیع

اللہ کے نام سے جو مہربان اور رحیم ہے

زیرِ مطالعہ کتاب ملک محمد شفیع کے ایما پر شائع کی گئی ہے اور اس کے جملہ حقوق اور ذمہ داری انہی کو مستحسن ہے۔ ادارہ اردو سخن ڈاٹ کام اور ادارہ بہارِ نو پبلیکیشنز کی ہمیشہ سے یہ کوشش رہی ہے کہ قارئین تک بہترین اور اغلاط سے پاک ادبی مواد پہنچایا جائے اور اس ضمن میں ہر امکانی کوشش کو بروئے کار لایا جاتا ہے تاہم غلطی کی نشاندہی کا خیر مقدم کیا جاتا ہے تاکہ آئندہ اشاعت میں اس کی درستی کی جائے۔ (ادارہ)

(قبل از تاریخ تا ۵۴۵ء)

قدیم تاریخِ تھل

اور

روڑاں کے آثارِ قدیمہ

مصنف:

ملک محمد شفیع

urdusukhan@urdusukhan.com --- www.urdusukhan.com

آرٹ لینڈ، گرلز کالج روڈ، اردو بازار چوک اعظم (لیہ) فون: 0302-7844094

قدیم تاریخِ تھل اور روڑاں کے آثارِ قدیمہ

ملک محمد شفیع

نواں کوٹ ضلع لیہ (پنجاب۔ پاکستان)

فون:0301-5490329

واٹس اپ:0333-5638385

ناشر: اردو سخن پاکستان، چوک اعظم (لیہ)

نمودِ اول: 2023ء

کمپوزنگ: شہریار ناصر

اہتمام: ناصر ملک

طباعت: شیرِ ربانی پریس، ملتان

قیمت: 1200 روپے (20 یورو، 25 ڈالر)

u اردو سخن

انتساب

اپنے بزرگوں کے نام!

جو اس دھرتی کی تاریخ میں جگمگاتے کردار ثابت ہوئے

فہرست

یونانی باختری اپالوڈوٹس ۲ اور گمنام بادشاہ سوٹرمگس کے عہد کے سکے

کشان بادشاہ کنشک اور واسودیو کے سکے
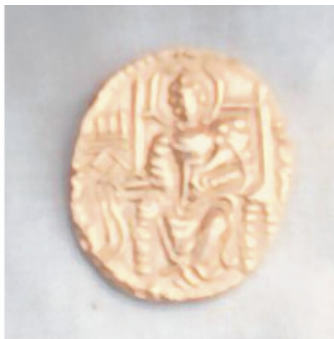
آخری کشان بادشاہ کے عہد کے طلائی سکے

آخری کشان بادشاہ (گریمبنس) کے عہد کے تانبے کے سکے

ہندوشاہی دور چھٹی صدی عیسوی کے سکے

کمار گپت، سمدر گپت (گپت خاندان ہندی) کے عہد کے سکے

یودھیااوراس کے اتحادی قبائل (تیسری صدی قبل از مسیح) کے سکے

ہندوشاہیادور (چھٹی صدی عیسوی) میں چاندی کے سکے

اروڑاں کے آثارِقدیمہ میں مٹی کی مہریں پائی گئیں

مٹی کے برتن بنانے کا آلہ جس پرخروشتی زبان میں، جیسا کہ

انگریزی میں da, ba, va مخفف تحریر ہے۔اورایک برتن

ہندومت کی لکشمی دیوی کی مٹی کی مورتیاں

دیوتاؤں کی مورتیاں

روڑاں کے آثار قدیمہ سے ملنے والے مختلف جانوروں کی مورتیاں

روڑاں کے آثار قدیمہ سے ملنے والے عقیق، لاجرد و دیگر منکے

تانبے کی سلائی اور انگوٹھیاں
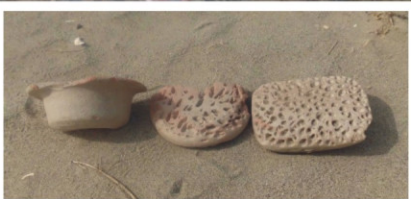
روڑاں کے مقام سے ملنے والے

وادئ سندھ کے نمونے کے مٹی کے برتنوں کے ٹکڑے
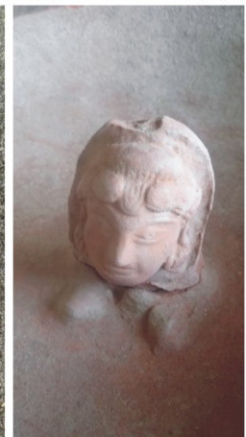
روڑاں کے مقام سے ملنے والے
آثار قدیمہ کے مختلف نمونے

جہلم
چناب
راوی
وادیٔ سندھ
کی ریاست
سندھ
ہڑپہ
بیاس
ستلج
N
W
E
S
نقشہ
ماقبل از تاریخ حجری دور تہذیبِ
وادیٔ سندھ کے ارتقائی مقامات
سدروسیا
موھن جوداڑو
موتھل
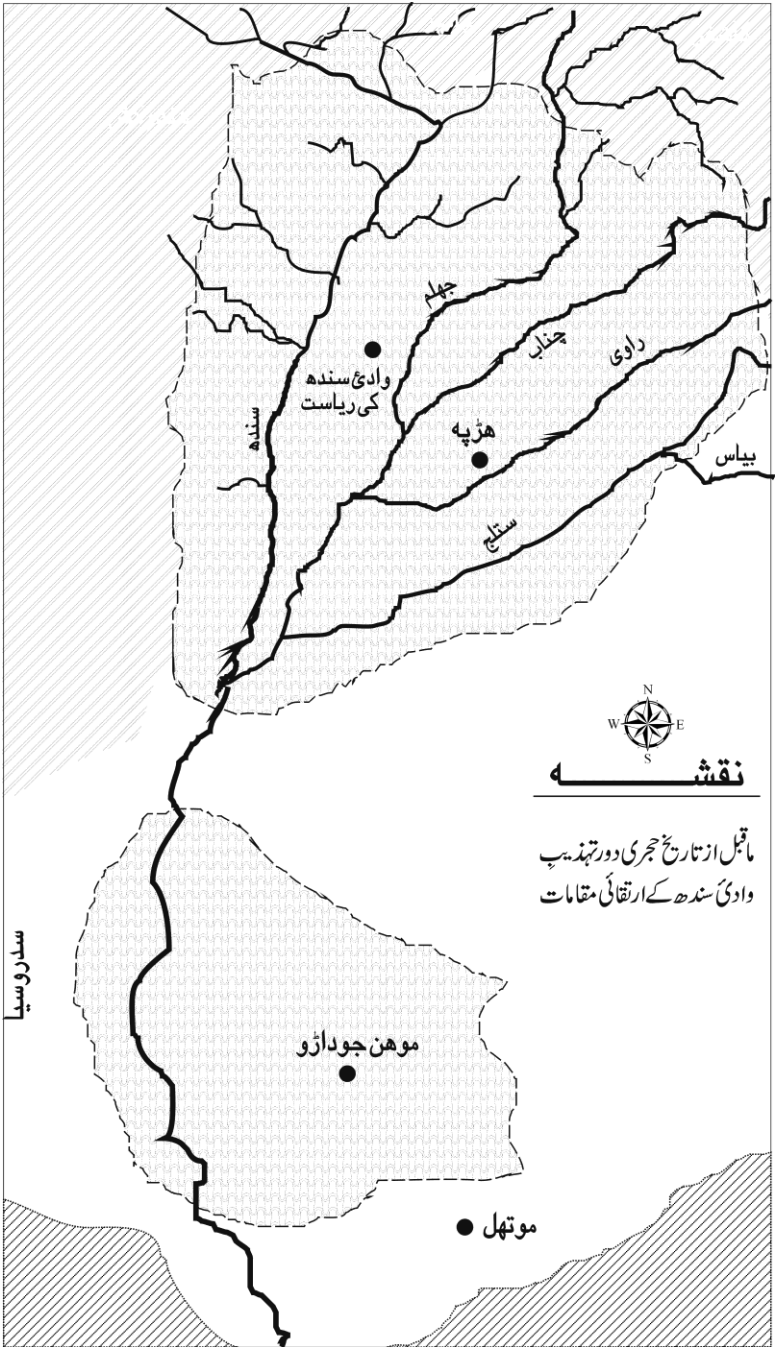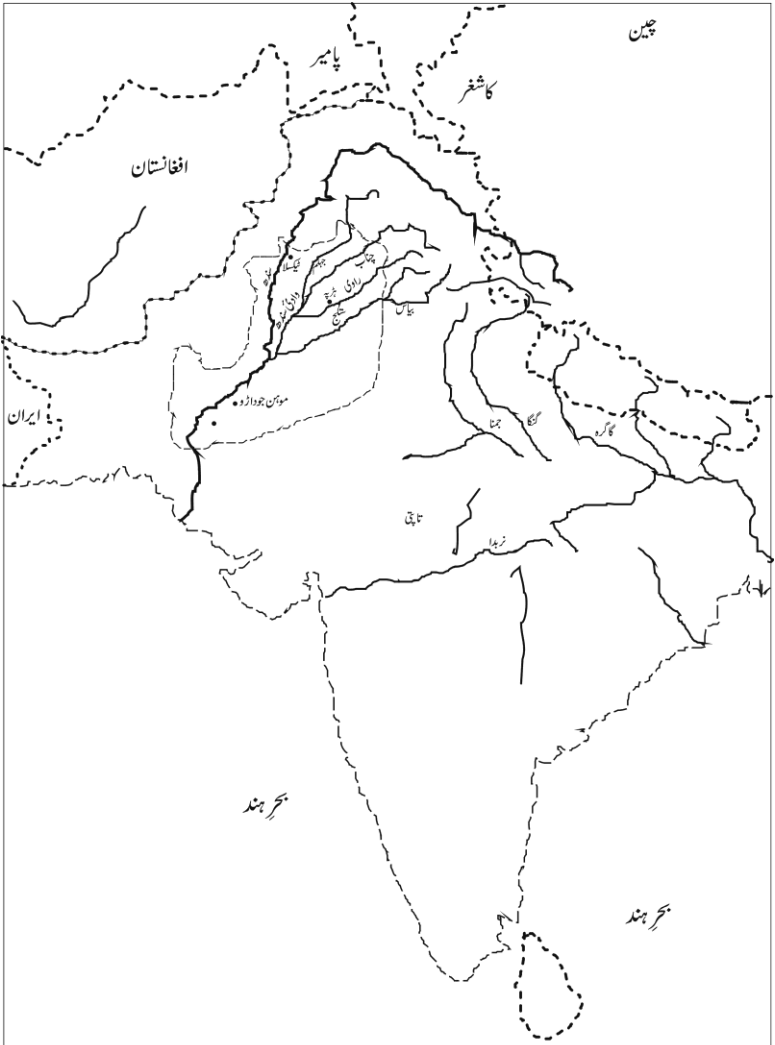
نقشہ

تہذیب وادیٔ سندھ کی سلطنت

(۴۰۰۰ قبل از مسیح میں)
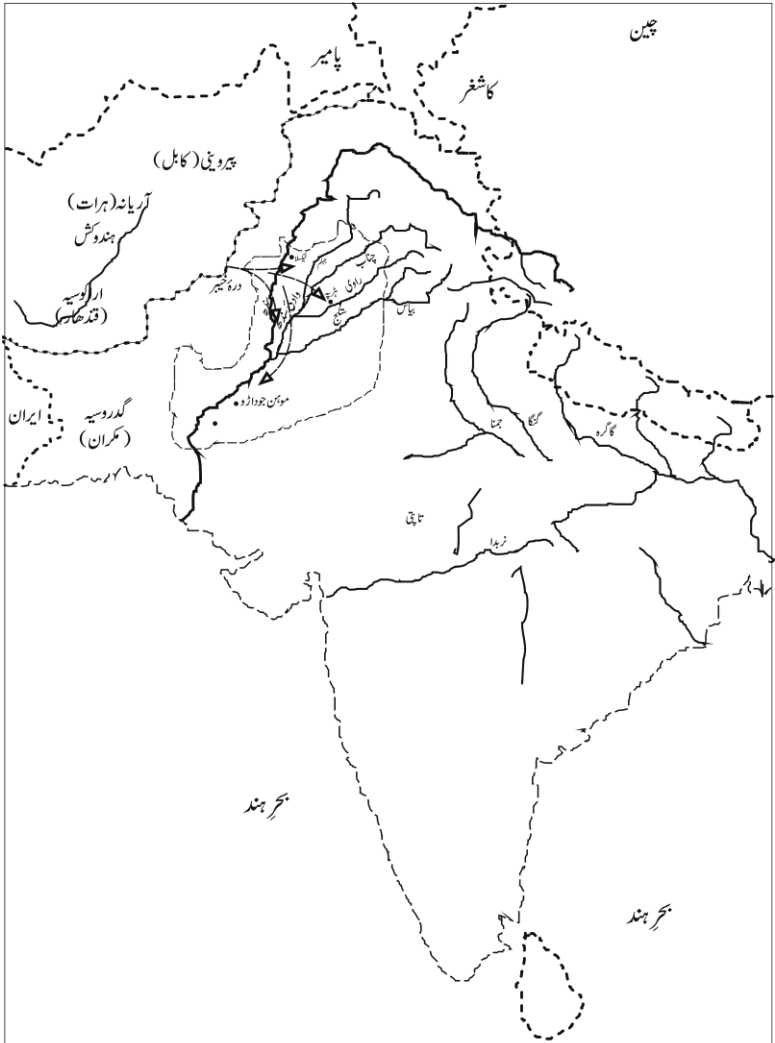
نقشـــــــــــہ

۲۵۰۰ قبل مسیح میں آریاؤں کی آمد

اس نقشہ میں آریاؤں کا آبائی وطن آریانہ (موجودہ ہرات، افغانستان) دکھایا گیا ہے جہاں سے آریہ قبائل درۂ خیبر کے راستے وادیٔ سندھ میں داخل ہوتے تھے
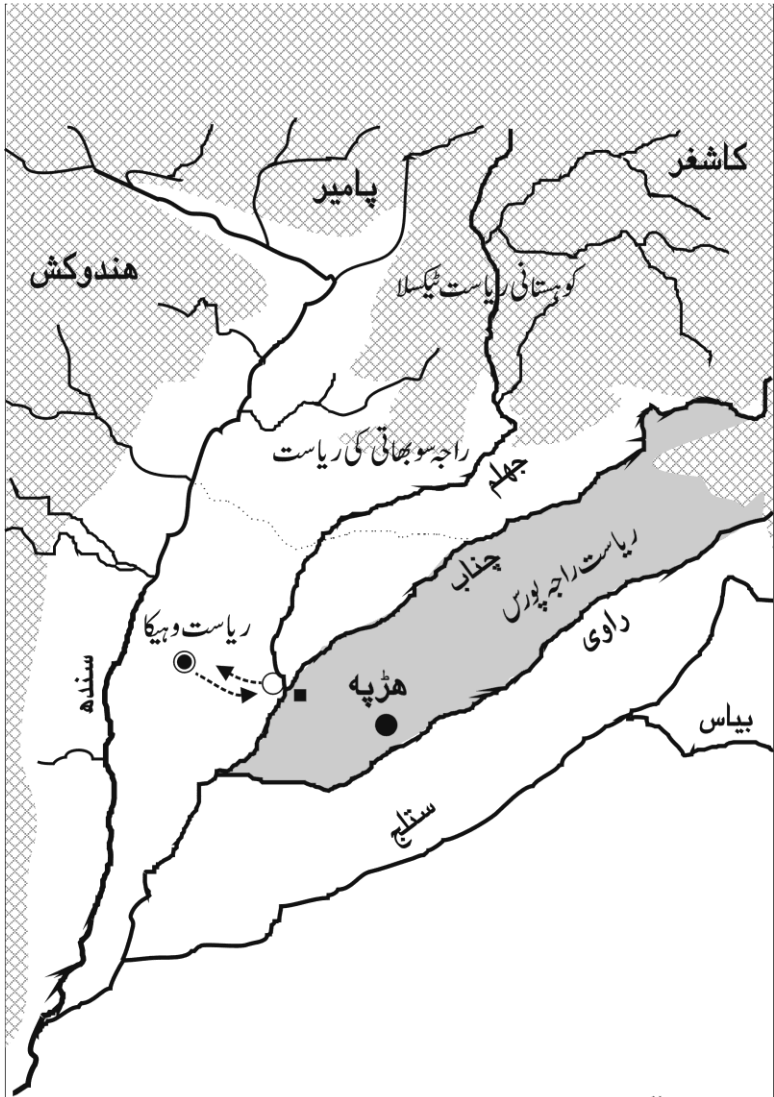
کاشغر
پامیر
ہندوکش
کوہستانی ریاست ٹیکسلا
راجہ سوبھاتی کی ریاست
جہلم
چناب
ریاست راجہ پورس
راوی
ریاست وہیکا
سندھ
ہڑپہ
بیاس
ستلج
N
W
E
S
خیالی نقشہ
۳۲۶ قبل مسیح میں ریاست وہیکا پر
سکندر یونانی کی فوج کا حملہ
تریموں گھاٹ
سکندر کی فوج کا پڑاؤ

کاشغر
پامیر
ہندوکش
باختری
ہندی یونانی
جہلم
چناب
بھکر
کروڑ
قدیم روڑاں
"اے"
"بی"
لیہ
سندھ
تریموں گھاٹ
راوی
بیاس
پارتھی
ستلج
N
W
E
S
نقشہ
پہلی صدی عیسوی میں ریاست ستھیا
جہاں مختلف قبائل قابض تھے

کاشغر
ساگوڈینہ
پامیر
کوہِ ہمالیہ
ہندوکش
کابل
پشاور
آریانہ (ہرات)
ٹیکسلا
جہلم
چناب
راوی
ستھیا
سندھ
آراکوسیہ (قندھار)
مولتان
بیاس
ستلج
متھرا
گندھاراکشان سلطنت
ساکا
گدروسیہ
(مکران)
N
W
E
S
نقشہ
کشان بادشاہ
کنشک کی حدود سلطنت ۷۸ء

کوہستانِ نمک
میانوالی
خوشاب
سرائے مہاجر
منکیرہ
حیدر آباد تھل
سرگودھا
بھکر
دریائے سندھ
دریائے جہلم
فتح پور
چنیوٹ
اروڑاں
کروڑ
B
A
دریائے چناب
جھنگ
اوچ گل امام
نوانکوٹ
ہیڈ تریموں
لیہ
چوبارہ
گڑھ موڑ
مظفر گڑھ
دریائے سندھ
N
W
E
S
نقشہ
۲۰ ویں صدی عیسوی میں
قدیم قصبہ اروڑاں کے آثار

میانوالی
جوہرآباد
خوشاب
ڈیرہ اسمٰعیل خان روڈ
منکیرہ
حیدرآباد تھل
بھکر
سرائے مہاجر
دریائے سندھ
دریائے جہلم
روڑاں
جدید
فتح پور
کروڑ
نوانکوٹ
دریائے چناب
اٹھارہ ہزاری
ہیڈتریموں
لیہ
چوبارہ
گڑھ موڑ
چوک اعظم
ملتان روڈ
ملتان روڈ
N
W
E
S
نقشہ
۲۰ ویں صدی عیسوی میں قدیم قصبہ اروڑاں کا
مضافاتی شہروں کے ساتھ سڑک کے ذریعہ رابطہ

مصنف کی ڈائری

سب سے پہلے میں کچھ اپنے متعلق عرض کرتا چلوں کہ میرا ایک پسماندہ ترین علاقہ "تھل" اور قصبہ روڑاں ضلع لیہ سے تعلق ہے۔اس وقت جب میں یہ کتاب تحریر کررہا ہوں یا میں روڑاں کے آثارِقدیمہ پر ریسرچ کرر ہا ہوں، یہ ۱۹۹۵ء تا ۲۰۱۰ءعیسوی کا زمانہ ہےاور ابھی تک اس علاقہ میں نہ کوئی سڑک تعمیر کی گئی ہے، نہ بجلی نصب ہوئی ہے اور نہ ہی کوئی سکول یا ہسپتال قائم کیا گیا ہے۔ یہاں لوگ اپنی مدد آپ کے تحت زندگی بسر کرر ہے ہیں۔

ان سب باتوں کے علاوہ میں خود بھی انہی معاشرتی خامیوں اور کمزوریوں کا شکار ہوا ہوں۔ میں تعلیمی اور معاشی طور پر کمزور تھا لیکن اس کے باوجود میں نے کوشش جاری رکھی اور اپنے تمام تر وسائل کو بروئے کار لاکر قصبہ روڑاں کے کھنڈرات اور تھل کے دوسرے تاریخی مقامات کے آثارِ قدیمہ پر تحقیق کرتا رہا۔

میں نے کسمپرسی کے باوجود اس کام کو پایہء تکمیل تک پہنچانے کیلئے پورے پاکستان کا سفر کیا اور نامور ماہرآثارقدیمہ سے رابطے کیے۔ بڑی جدوجہد اور جستجو کے بعد خود جا کرانہیں ملا اور ان سے تھل اور روڑاں کے آثارِقدیمہ اور کھنڈرات کی حالتِ زار پر بات کی۔ کیونکہ میں ازخود تو اس کام کو سرانجام دینے کے قابل نہیں تھا، اس لئے میں نے ان تمام ماہرین اور مورخین سے خط

وکتابت اور ٹیلی فون کے ذریعے رابطہ استوار رکھا لیکن کہیں سے بھی مجھے کوئی تعاون حاصل نہ ہو سکا۔ اس سفرِ تحقیق میں مجھے مایوسی کے علاوہ اور کچھ نہ ملا، پھر بھی میں نے اپنا سفر جاری رکھا اور اس کام کیلئے نامی گرامی ماہرین آثارِ قدیمہ سے خود جا کر ان کے دفاتر میں ملا۔ میں جناب عبدالستار کاکڑ، ڈائریکٹر جنرل آف پاکستان آثارِ قدیمہ جن کا دفتر ستارہ مارکیٹ، اسلام آباد میں واقع تھا، سے جب ملا تو انہوں نے میرے ساتھ تعاون کرنے اور اس گراں قدر منصوبے پر کام کرنے وعدہ کیا۔ انہوں نے اپنے اسٹنٹ ڈائریکٹر جن کا نام سعید صاحب تھا، کو میرے ساتھ رابطہ رکھتے ہوئے اس پراجیکٹ پر کام کا حکم دیا۔

سعید صاحب پراجیکٹ میں پیش رفت کرنے کی بجائے مجھے ڈپٹی ڈائریکٹر ٹیکسلا میوزیم اشرف خان کے پاس بھیج دیا۔ انہوں نے بھی ٹال مٹول سے کام لیا اور اسسٹنٹ ڈائریکٹر ملتان حبیب اللہ ساہو صاحب کے پاس بھیج دیا۔

جب میں نے ساہو صاحب سے بات کی تو انہوں نے ہمارے علاقہ کا وزٹ کرنے کی حامی بھر لی اور اپنا وعدہ وفا کرتے ہوئے کچھ دنوں کے بعد ہمارے پاس تشریف لے آئے۔

انہوں نے ماہرانہ انداز میں سائٹ کو دیکھا، کچھ نایاب سکے اور بت، مورتیاں اور برتنوں کے ٹکڑے اپنے ساتھ لیے اور میرے ساتھ وعدہ کیا کہ ان نمونہ جات کی ریسرچ کر کے اس کا رزلٹ آپ کو دیں گے، روانہ ہو گئے۔

یہ وعدہ آج تک وفا نہیں ہوا اور نہ ہی ریسرچ کا ابھی تک کوئی جواب آیا ہے۔ کچھ عرصہ خاموش رہنے کے بعد میں اپنے جذبوں کو قابو میں نہ رکھ سکا اور کچھ دنوں بعد میں نے ہڑپہ میوزیم کے انچارج ڈائریکٹر جناب حسن صاحب سے ملاقات کی۔ انہوں نے میری حوصلہ افزائی کی اور تعاون کرنے کا بھی وعدہ کیا۔

تھوڑے عرصہ بعد حسن صاحب ہمارے علاقہ روڑاں میں تشریف لے آئے۔ انہوں نے سائٹ کا وزٹ کیا، کچھ نمونے لیے اور مجھے بہت ساری تاریخی باتوں سے آگاہ کرنے کے بعد

واپسی کا قصد کیا۔ میں ان کا اس تعاون پر تہِ دل سے ان کا شکر گزار ہوں۔

جستجو کے اس سفر میں اس محکمہ کی ایک ماہر سکہ جات ڈاکٹر نوشابہ انجمن، جو لاہور میوزیم میں سکہ جات کی انچارج ہیں، سے بھی میری ملاقات ہوئی۔ ان کی ماہرانہ صلاحیتوں کی ایک وجہ ان کے استاد پاکستان کے ماہر جناب احمد حسن دانی صاحب تھے۔ اُن کی وہ شاگرد تھیں۔

میں ان کے تعاون کا شکر گزار ہوں کیونکہ ان کا تجربہ میری تحقیق میں مددگار ثابت ہوا اور میں تھل کی قدیم تاریخ پر ایک کتاب لکھنے میں کامیاب ہوا۔

ہمارے ایک اور دوست جناب زبیر شفیع غوری صاحب جنہوں نے تھل کی تاریخ پر ایک کتاب بھی لکھی ہے، نے میری حوصلہ افزائی کی۔ ان کا میرے ساتھ وعدہ تھا کہ شفیع صاحب! آپ کتاب کیلئے مواد تلاش کریں اور کتاب پرنٹ میں کروا کر دوں گا۔ میری بدقسمتی کہ میری کتاب مکمل کرنے سے پہلے وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے آمین۔

ان کے علاوہ ڈاکٹر فرزند مسیح جو پنجاب یونیورسٹی میں محکمہ آثار قدیمہ سربراہ تھے، نے بھی میری حوصلہ افزائی کی، ان کا بھی شکریہ۔

کارواں چلتا رہا، نکتے ملتے گئے، الفاظ بنتے گئے، اس طرح بیس سال کے عرصہ میں میں نے کوشش کی اور ہندوستان کی قدیم تاریخ کی کتابوں کا مطالعہ کیا اور آہستہ آہستہ یہ سٹوری مکمل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ بجا ہے کہ بندہ ناچیز تو اس قابل نہ تھا، بالآخر اپنے شوق کو پورا کرتے ہوئے منزلِ مقصود پر پہنچ گیا۔

ایک بات میں عرض کرتا چلوں کہ اس دوران جو خرچ اخراجات ہوئے، وہ میں نے صرف اپنی ہی جیب سے پورے کیے اور کسی سے ایک روپیہ نہیں لیا۔ یہ میرا شوق تھا، تھل کی تاریخ سے میری وابستگی تھی کہ میں نے اس علاقے کیلئے اتنا کچھ کر دیا جس کی امید اور توقع بھی نہ تھی۔ صرف اس لئے کہ جب لوگ اس کتاب کو پڑھیں گے تو کم از کم میری حوصلہ افزائی کریں گے۔ ویسے تو ہندوستان کی قدیم تاریخ پر ہزاروں کتابیں لکھی جا چکی ہیں لیکن میں نے جس طرح کی کتاب لکھی

ہے اور جس طرح قدیم تاریخِ ہند کے ساتھ تھل کا رشتہ جوڑا ہے، یہ منفرد ہے جسے پڑھ کر آپ حیران رہ جائیں گے۔

تمام پڑھنے والوں سے میری گزارش ہے کہ اگر میری یہ تحریر اچھی لگے تو میرے لئے دعا کر کردیجئے گا۔شکریہ!

والسلام

ملک محمد شفیع

نواں کوٹ ضلع لیہ

حصہ اول

تھل کا قدیم تاریخی پس منظر

تھل کا مفہوم

تھل کے معنی ہیں مقام جگہ اور وہ علاقہ جو خشک، سخت، ریگستانی اور میدانی جگہ زمین پر مشتمل علاقہ جیسا کہ تھل کا علاقہ دریائے سندھ اور جہلم کے درمیان واقع ہے جسے دوآب سندھ ساگر کے نام سے بھی لکھا اور پکارا جاتا ہے۔ دوآب سندھ ساگر کے علاوہ تھل کو ریگستان، صحرا کے نام بھی دیے گئے ہیں اور ہم نے ان تمام ناموں کو سامنے رکھ کر تھل کی اہمیت کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ دوآب کا مطلب ہے دو پانیوں یا دریاؤں کے درمیان کا علاقہ، مقام جبکہ یہ علاقہ تھل دریائے سندھ و جہلم کے درمیان واقع ہے جبکہ دریائے سندھ کے قریب ہونے کی وجہ سے اس کو سندھ ساگر کا نام دیا گیا ہے۔ اس خشک اور ریتلے علاقے کو ریگستان اور صحرا بھی کہتے ہیں۔ یہ علاقہ میانوالی، خوشاب کے اضلاع سے لے کر بھکر، لیہ اور مظفر گڑھ تک کا علاقہ ریتلا و یران و بیابان خشک زمین پر مشتمل ہے اس لیے ہم نے ان تمام ناموں کو سامنے رکھ کر جب دیکھا تو اس کا مفہوم بنتا تھا "تھل" اس لیے یہ علاقہ ریت کا مقام، خشک مقام، ویرانی کا مقام، دو دریاؤں کا درمیانی مقام اور مقام کا مطلب محل وقوع اور ٹھکانا۔ اس لیے اگر ان تمام ناموں کو ایک جگہ اکھٹا

کریں تو اس کا مطلب یا مفہوم ہے تھل۔ جو آج بھی اس علاقے کا نام ہے تھل جو قدیم زمانے سے چلا آرہا ہے اس لیے ہم نے بھی اس دھرتی کی سابقہ حیثیت مقامی وعلاقائی، تہذیب وثقافت، دہی وقدیمی رنگ دینے کیلیے اس علاقے کا نام تھل ہی مشہور کیا ہے۔ ہاں ایک حقیقت ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ تھل کا بھی قدیم ہند کی طرح تہذیبی وسماجی وجغرافیائی نقشہ تبدیل ہوتا رہا ہے آب و ہوا اور موسمیاتی تبدیلیاں کی وجہ سے تھل نے بھی کئی رنگ تبدیل کیے۔ یہاں بہت اتار چڑھاؤ آتے رہے۔

جس طرح آج کا تھل اور اس سے پہلے ۱۸ ویں اور ۱۹ ویں صدی عیسوی کا تھل، ۱۲ ویں صدی عیسوی اور ۵ ویں صدی عیسوی کا تھل جب چینی سیاح فاہیان یہاں سے گزرا تھا۔ فاہیان کا سفر ۴۱۵ء کے قریب کا تھل آج کا تھل اس وقت سے مختلف ہے۔ لیکن اس کا رنگ وبود، تہذیب و ثقافت، رسم ورواج ایک ہی ہے۔ چینی سیاح فاہیان کو ہندوستان میں داخل ہونے کے لیے مغرب کی طرف سے دریائے سندھ کو پار کرنا پڑا انہوں نے ڈیرہ اسماعیل خان اور بھکر کے مقام سے دریائے سندھ کو پار کیا اور بھکر سے سیدھا منکیرہ حیدرآباد تھل کے راستہ سے ہیڈ تریموں پہنچا۔ یہاں سے انہوں دریائے جہلم کو عبور کیا۔ چینی سیاح نے اپنی تحریر میں ایک وسیع ریتلے میدان کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے تھل کو ریت کا دریا کے نام سے منسوب کیا ہے۔ سیاح مزید اپنی تحریر میں بیان کرتے ہیں کہ یہاں کا سفر جاڑے یعنی گرمیوں کے موسم میں دشوار ہے۔ سخت ترین گرمی اور جھکڑ آندھی چلتی ہے۔ اس علاقہ میں پانی بڑی مشکل میں مل پاتا ہے۔ دن کے وقت سفر کرنا انتہائی مشکل ہے۔ فاہیان کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ تھل اس علاقے کا قدیمی نام ہے اس علاقے کی تاریخی حیثیت اتنی ہی قدیم ہے جتنا کہ خود انسانی تہذیب۔ یہ وہ علاقہ ہے جو پوٹھار یعنی سلسلہ کوہ کے جنوب کی میدانی پٹی جس پر قدیم ہندوستان کی آبادکاری ہوئی ہے۔ سب سے پہلا جزیرہ یا خشک مقام تھل ہی ہے جہاں سے وادیٔ سندھ کی قدیم تہذیب نے جنم لیا ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں سے انسان نے تہذیبی ارتقاء شروع کیا اور وادیٔ سندھ کی قدیم تہذیب معرض وجود میں آئی اور باقی ہندوستان میں پھیلی جس کی تفصیل اگلے ابواب میں آئے گی۔

تاریخی پس منظر

تاریخ ایک ایسا آئینہ ہے جس میں انسانی تہذیب وتمدن کے تمام تر خدوخال تمام تر خوبیوں کے ساتھ بڑی وضاحت سے نظر آتے ہیں انسانی تہذیب نے جو جو ارتقائی سفر طے کیے اور جہاں جہاں اور جن جن وادیوں سے یہ رنگ و بو دگزرا ہے ان کی کہانی جب الفاظ کا پیکر بن جاتی ہے تو یہی ماضی کی تاریخ ہوتی ہے۔لیکن تاریخ صرف اس چیز کا نام نہیں کہ محض چند مخصوص افراد جن میں صرف بادشاہ یا شہنشاہ اور امراء شامل ہوں یا ان خاص لوگوں کے نام گنوا دینے سے یا ایسے حالات واقعات لکھ کر عہد گزشتہ کو زندہ نہیں کیا جا سکتا بلکہ اصل تاریخ تو وہ ہے جس میں اس علاقے کے تمام زمینی حقائق کو تہذیب وثقافت، لوگوں کے رہن سہن اور قوموں کے عروج وزوال کی ایک مکمل داستان بلکہ اس سے بھی آگے ان قوموں کے سیاسی ومعاشی، اور جغرافیائی اور فکری تجزیے اسباب و واقعات اور ان کے سیاسی ومعاشی اثرات کی ایک ایسی تصویر پیش کرنی پڑتی ہے جو ماضی کے ہر پہلو کا احاطہ کیے ہوئے ہو۔اس کے علاوہ علم تاریخ کا دوسرے علوم یعنی معاشی ومعاشرتی سے بھی ایک گہرا تعلق ہوتا ہے۔جب مورخ تاریخ لکھتا ہے تو اس کیلیے ضروری ہے کہ وہ تمام علوم کو مدنظر رکھ کر یعنی تہذیبی، ثقافتی، تمدنی، معاشی، جغرافیائی اور سیاسی وسماجی علوم کو ایک ساتھ یکجا کر کے تاریخ مرتب کرے ورنہ ان کے علاوہ صحیح معنوں میں تاریخ نہیں لکھی جا سکتی۔تاریخ کے بارے میں بے شمار نظریات پیش کیے گئے ہیں جبکہ ہر مورخ نے اپنا ایک علیحدہ نظریہ تاریخ پیش کیا ہے لیکن اصل حقیقت ان تمام نظریات کے پس پردہ کارفرما ہے۔ہاں اگر تاریخ سچائی کے رخ سے پردہ نہیں اٹھاتی معاشرتی، جغرافیائی، اور تہذیب وتمدن اور حقیقتاً اقوام کی عروج وزوال کی نقاب کشائی نہیں کرتی تو وہ محض ایک داستان طرازی تو ہو سکتی ہے لیکن ایک حقیقی تاریخ نہیں کیونکہ ایک حقیقت کو تلاش کرنے کا حربہ ہی وہ تاریخ ہے جو غیر جانبداری سے لکھی جائے۔ہاں تاریخ سے ہر دور میں دلچسپی لی گئی کیونکہ تاریخ میں ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ اس میں انسانوں کو ہمیشہ اپنے ماضی سے لگاؤ رہا ہے۔

انسان کے پیچھے چھوڑے ہوئے وہ ارتقائی راستے جن سے گزر کر آیا ہے۔ انسان اپنے ماضی کو دیکھ کر مستقبل کا انتخاب کرتا ہے کیونکہ وہ لامتناہی اور ارتقائی راستوں کی طرف مڑ کر دیکھنا زیادہ پسند کرتا ہے۔ انسان کا ہر گزرا ہوا لمحہ اور اس سے وابستہ یادیں اسے عزیز ہی نہیں بلکہ متاع و حیات یعنی ایک گزری ہوئی زندگی کا درجہ رکھتی ہیں بلکہ اصل بات تو یہ ہے کہ ماضی کا مطالعہ حال کو سمجھنے اور مستقبل کا انتخاب کرنے میں مدد دیتا ہے۔ اگر انسان گزرے ماضی کو چھوڑ کر صرف حال و مستقبل کو اپنا سازگار بنانا تو میرے خیال میں مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ اسی بات کو مدنظر رکھ کر اگر ہم اپنے ماضی کی طرف خیال کریں اور اپنے ماضی کے تاریخی، تہذیبی، سماجی، جغرافیائی اور ثقافتی حالات کو بھی مدنظر رکھیں اور ان علوم کی اہمیت کو دیکھ کر ہم اپنے مستقبل کی زندگی چاہیں، وہ سماجی یا پھر تہذیب وثقافت یا مذہب ہو سب کا بڑی آسانی سے احاطہ کر سکتے ہیں۔ اس لیے ہم جس خطے میں رہ رہے ہیں، اس کے ماضی کو سمجھنے کے لیے ہمیں تاریخ کے ساتھ ساتھ دوسرے تمام علوم کی بھی مدد لینی پڑے گی۔ جس میں معاشی، جغرافیائی، تہذیب، ثقافت اور مذہب وغیرہ یعنی اقوام اور قبائل کے معاشی ذریعے ملکی سرحدیں، فن ولطیفہ، رہن سہن، رشتے ازدواج اور لوگوں کا آپس میں میل جول ان تمام حالات کو سمجھنے کے بغیر کوئی تاریخ دان میرے خیال میں اپنی کہانی مکمل نہیں کر سکتا۔ ہم جس خطہء ارض میں رہائش پذیر ہیں، یہاں دنیا کی دوسری بڑی تہذیب نے جنم لیا جو بعد میں تہذیب وادیءسندھ کے نام سے مشہور ہوئی۔ تمام ہندوستانی چاہیے وہ آج کا پاکستانی ہو یا انڈین اسی تہذیب کا مرہون منت ہے اسی تہذیب نے ہندوستان اور اس کے باسیوں کو دنیا میں متعارف کرایا یہی وہ تہذیب تھی۔ دارا، سکندر اعظم یونانی، فرعونِ مصر آریہ اور کشانوں کو اپنی طرف کھینچ لائی۔ یہ دنیا کی دوسری تاریخوں سے بہت مختلف ہے۔ قدیم ہندوستانی تاریخ کی بہت ساری وجوہات ہیں کیونکہ یہاں کی قدیم تاریخ ہر دور میں ہزیمت اور شکست خوردہ رہی ہے کئی ظالم اقوام نے ہندوستانی تہذیب وثقافت کو تباہ وبرباد کر دیا تو کہیں ان کے شہروں اور دیہات کو جلا کر خاکستر کر دیا گیا۔ اور فن وثقافت کی دھجیاں اڑا دیں۔ اور کہیں یہاں کی جغرافیائی حدود کو

تبدیل کر دیا گیا اور کبھی ان کے معاشی نظام کو برباد کر کے ان پر قبضہ کر لیا گیا۔ حتی کہ جب بھی ہندوستانی تاریخ وتہذیب اپنے عروج کو پہنچنے لگتی تو غیر ملکی حملہ آوروں کے ظلم کا شکار ہوتی رہی ہے حملہ آور ہونے والے ہر ظالم نے ظلم کی انتہا کر دی یہاں تک کہ آباد قبائل کو قتل کر کے ان کے شہروں کو مسمار کر دیا اوران کی جگہ نئے شہر اور دیہات آباد کیے گئے۔ اس طرح ہندوستان کی آبادیاں اجڑتی اور آباد ہوتی رہی ہیں اور ہندوستان کی تہذیب وثقافت بھی تہہ در تہہ زمین بوس ہوتی رہی ایک کے بعد دوسری تہذیب و تاریخ نے جنم لیا جس طرح وادیٔ سندھ کی قدیم تہذیب کو آریائی قبائل نے کچل ڈالا اور وادیٔ سندھ کے لوگوں کا قتل عام کیا ان کے شہروں کو ڈھیر کر دیا۔ اس کی جگہ ایک نئی تاریخ اور تہذیب نے جگہ لی جسے ہم آریائی تہذیب کہہ سکتے ہیں۔

کئی صدیاں بعد جب آریہ ہندوستان میں رچ بس گئے اور یہ ایک تہذیب یافتہ خطہ بن گیا۔ بہت اچھے انداز میں ایک نئی تہذیب کی ابتدا ہوئی نئے شہر آباد ہوئے اور وادیٔ سندھ سے آگے مشرق میں وادی گنگا اور جمنا کے میدانوں کو رونق ملی ایک نیا انداز زندگی وجود میں آیا۔ ایک ایسا نظام حکومت جو پہلے کبھی ہندوستان میں متعارف نہیں تھا۔ ایک بادشاہتی نظام حکومت دیکھنے کو ملا۔ تمام لوگوں نے ایک بادشاہ کے ماتحت رہنا پسند کیا۔ سب کچھ پہلے سے مختلف تھا۔ آریہ کے ہندوستان میں آباد ہونے کے بعد یہاں کی تہذیب وثقافت اور فن ولطیفہ اور پڑھنے لکھنے کا نیا طریقہ معرض وجود میں آیا۔ جبکہ سنسکرت کی گریمر بھی اپنی آریاؤں نے ایجاد کی جس سے چار وید لکھے گئے۔ ایک عرصہ تک آریہ نے ہندوستان کی تہذیب و تاریخ پر مثبت اثرات مرتب کیے اور ہندوستان کو اپنا وطن تسلیم کر لیا اور آریائی تہذیب اپنا ارتقائی سفر طے کرتی ہوئی اپنے عروج کو پہنچی ہی تھی کہ پانچویں صدی ق م میں ایرانی آچمینی، آشوری حکمران (تلگا تھ اور پلیسہ سوم) کی طرف سے حملے شروع ہو گئے اور مقامی تہذیب کو کافی نقصان پہنچایا معاشی اور جغرافیائی لحاظ سے ہندوستان کو بری طرح تباہ کیا گیا۔ ایرانی حملہ آوروں نے دریائے سندھ کو عبور کر کے موجودہ تھل اور دریائے سندھ کی مشرقی میدانی پٹی پر قابض ہو گئے۔ تھل کے اکثر علاقوں جبکہ شمال میں ٹیکسلا

تک پر قبضہ کرلیا۔ یہاں تک کہ ان علاقوں میں ایرانی آچمینی لوگوں کی کافی تعداد کو بھی آباد کیا گیا۔ان حملہ آوروں نے مقامی تہذیب کا نقشہ تبدیل کر کے ایک نیا نظام حکومت قائم کیا۔

چھٹی صدی ق م کے شروع تک ایرانی آچمینی نے ٹیکسلا کو اپنا مرکز بنا۔اور بعد میں انہیں آچمینی قبائل کے اشارے پر راجا سوفیٹس ،فرعون مصر،سائرس اعظم نے ۵۳۰ ق م جبکہ ایک دوسری راویات کے مطابق چھٹی صدی ق م کے قریب ہی ہندوستان حملہ آور ہوااور دریائے سندھ کو عبور کر کے مشرقی میدانوں پر قبضہ کرلیا جن کو مغربی ہند یا بعد میں پنجاب کا نام دیا گیا۔موجودہ تھل بھی ان علاقوں میں شامل تھا جن پر فرعون مصر کی فوج نے قبضہ کیا۔ یہ بادشاہ ہندوستان کی تاریخ تہذیب پر کافی حد تک اثر انداز ہوا۔انہوں نے شہنشاہ کا بھی لقب اختیار کیا اور اپنے آپ کو خدا ماننے اور اپنی پوجا کرنے کا بھی حکم دیا۔کہا جاتا ہے کہ ہندوستان میں بت پرستی اسی بادشاہ کے دور سے شروع ہوئی تھی اس کے متعلق مشہور ہے کہ یہ رحم دل بادشاہ تھا اسی نے ہندوستانیوں کو ایک نیا معاشی نظام دیا یعنی جدید قسم کی کھیتی باڑی اور کاشتکاری۔مقامی لوگ اس کے انداز حکمرانی سے بہت متاثر ہوئے اور ان کو اپنا بادشاہ تسلیم کرلیا یعنی ہندیوں کا بادشاہ۔اس یونانی بادشاہ نے کافی عرصہ تک ہندوستان پر حکومت کی اور پانچویں صدی ق م سے پہلے فوت ہوگیا۔اس کی موت کے بعد شہنشاہ ایران دارا اگشتا سپ نے اپنی فوج کو دوبارہ مغربی ہند پر قبضہ کرنے کا حکم دیا۔اس طرح ایرانی فوج سپہ سالار رستم کی سربراہی میں تقریباً ۵۱۰ - ۱۲ ق م کے دوران دریائے سندھ کے پار مشرقی میدانی پٹی موجودہ تھل پر قبضہ کرلیا۔ایرانی جنرل رستم نے مغربی ہند کے تمام علاقوں اور شمال میں ٹیکسلا تک اپنے قبضہ میں لے لیا اور ایک عرصہ تک ان علاقوں پر حکمرانی کرتا رہا۔لیکن ۴۸۵ ق م کے قریب ہی ایرانی شہنشاہ کی موت کے بعد ہندی راجاؤں کے ایک گروپ نے ایرانی فوج کو شکست دے کر دریائے سندھ تک کے تمام علاقوں کو اپنے قبضہ میں لے لیا۔ایک طویل عرصہ تک ہندوستان مقامی راجاؤں کے قبضہ میں رہا اور مقامی تہذیب وثقافت نے ایک نیا انداز اختیار کیا ہی تھا کہ ۳۲۶ ق م میں مغرب سے ایک اور ظالم حملہ آور جو سکندر اعظم کے نام سے

مشہور تھا، کابل افغانستان سے ہوتا ہوا ہندوستان پر حملہ آور ہو گیا۔

یونانی فوج نے مغربی ہند یا پنجاب "تھل" کے علاقوں پر ایسی کاری ضرب لگائی کہ یہاں کا تمام تر نظام حکومت درہم برہم ہو گیا۔ سکندر تو آندھی کی طرح آیا اور چلا گیا لیکن اس کی موت کے بعد ان کے جانشین نے ایک عرصہ تک ہندوستان پر حملہ آور ہوتے رہے حالانکہ ہندوستان میں چندر گپت موریہ نے ایک مرکزی حکومت قائم کر لی تھی جو اشوک اعظم کے دور ۲۴۵ ق م تک قائم رہی لیکن اس کے بعد پھر ایک مرتبہ غیر ملکی حملہ آور یو چی کشان قبائل جو چین کے مغربی صوبے وہلسن سے نکل مکانی کر کے مغربی ہند میں داخل ہوئے اور تمام مغربی ہند کے علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ جبکہ مزید مشرق میں متھرا اور مالوہ تک چلے گئے۔ کشان چوتھی صدی عیسوی تک ہندوستان پر حکمران رہے لیکن بدقسمتی سے پانچویں صدی عیسوی کے شروع میں ایک اور ظالم سفاک اور وحشی قوم جو "ہن" کے نام سے مشہور تھی مغربی ہند پر حملہ آور ہوئی جو بعد میں گورے ہندن کے نام سے مشہور ہوئے، یہ اتنے ظالم تھے کہ انہوں نے مغربی ہند کے اکثر شہروں کو جلا کر خاکستر کر دیا۔ لوگوں کو قتل کرتے اور ان کے سرسبز کھیتوں کو بھی جلا ڈالتے۔ ہندوستان میں جو جو وحشیانہ حرکتیں انہوں نے کیں، ان کی مثال تاریخ انسانیت میں نہیں ملتی۔

قدیم تاریخِ ہند کا راز

ہندوستان کی تاریخ کا کہیں کوئی وجود ہی نہیں تھا بجائے اس کے کہ یہ مٹی کے بڑے بڑے ڈھیروں تلے دبی ہوئی تھی۔ اگر کوئی تحریری ثبوت تھا تو وہ بھی فرسودہ حال ہندو کی وہ مذہبی تحریریں تھی جن کی صحت کے بارے میں یقین نہیں کیا جا سکتا تھا بلکہ غیر تسلی بخش وہ رزمیہ نظمیں جو کبھی کسی ایک ہندو راجہ، مہاراجہ ان دیوتاؤں کی شان میں لکھی جاتی تھی۔ اگر کوئی مورخ ان تحریروں کو سامنے رکھ کر تاریخ لکھتا تو مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن تھا۔ اس کے علاوہ دوسرے ثبوت جو بڑے بڑے مٹی کے ٹیلوں کے نیچے وہ آثار جن کو انگریز مورخین نے آثارِ قدیمہ کا نام دیا ہے۔ جو اس

بات کی نشان دہی کرتے ہیں کہ یہاں دیہات اور شہر آباد تھے اور وہ کون لوگ تھے جو ان شہروں میں آباد تھے اور اب یہ کھنڈرات بن چکے ہیں لیکن ان کھنڈرات اور آثار کو کون چھوتا اور ان مٹی کے ڈھیروں کو کھودتا یہ ایک بہت مشکل کام تھا۔ لیکن یہی کام ۱۹ صدی عیسوی کے وسط میں ہندوستان پر حملہ آور ایک قوم جن کو ہم انگریز کہا کرتے تھے، نے کیا ان لوگوں نے ہندوستان کی قدیم تاریخ ہند مرتب کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ کیونکہ ہندوستانی اس بات سے بالکل بے خبر تھے۔ انگریزوں نے اس کام کے لیے ایک باقاعدہ محکمہ جو آثارِ قدیمہ (آرکیالوجیکل سروے ۱۸۶۲ء) میں بنایا۔ انگریز فوج کے ہی ایک کرنل انجینئر کننگھم کو اس کا سربراہ بنایا۔ کننگھم نے بڑی جاں فشانی سے ان تمام مقامات کا دورہ کیا جہاں یہ تاریخی کھنڈرات پائے جاتے تھے۔ انہوں نے ہندوستان کی قدیم تاریخ پر بہت کام کیا۔ کرنل کننگھم ۱۸۸۵ء میں فوج سے سبکدوشی کے بعد بھی قدیم تاریخِ ہند پر کام کرتا رہا اور بہت سارے تاریخی راز افشاں کیے جن میں مغربی ہند کے مقام ہڑپہ، موہن جودڑو وغیرہ شامل ہیں۔ کننگھم کی ریسرچ نے ہندوستانی تاریخ چار چاند لگا دیے۔

ان کے بعد ۱۹۰۱ء میں واسرئے ہند لارڈن کرزن کی دلچسپی سے آثارِ قدیمہ کے ایک ماہر نوجوان جن کا نام جان تھا لیکن بعد میں وہ سر جان مارشل کے نام سے مشہور ہوئے ان کو اس محکمہ کا ڈائریکٹر بنا دیا گیا۔ سر جان مارشل نے مشرقی ہند کے ساتھ ساتھ مغربی ہند کے علاقوں کا بھی دورہ کیا اور انہوں نے قدیم ٹیکسلا کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا اور قدیم ریاست گندھارا کے مرکزی شہر کے کھنڈرات کی کھدائی کی۔ جس میں انہوں نے قدیم تاریخ ہند کے بہت سارے راز افشاں کیے جبکہ ان کے علاوہ انگلستان کے کافی مورخین نے بھی قدیم تاریخِ ہند پر کام کیا جن میں جنرل ٹاڈ، جو برٹش فوج کا آخری جنرل تھا، ریٹسن ٹی۔ ایس۔ اوز اور وی اے سمتھ جبکہ فرانسیسی فوج کے کچھ افسران نے بھی قدیم تاریخِ ہند پر کام کیا اور ان میں چارلس ون کنس۔ ہورلیس ہمین ولسن انہوں نے بھی ایک تنظیم قائم کی جس کا نام اکولی ڈس لینگھن اور تیاپلسی ورنٹیں تھا۔ فرانسیسی افسر ہملٹن کو اس کا سربراہ مقرر کیا گیا ان تمام لوگوں کی کوششوں سے اور ذاتی لگن و جستجو کے ذریعے ہندوستان کو اس

کا قدیم روپ ملا۔ چنانچہ انہوں نے ایسے ایسے گوشوں کو بھی اجاگر کیا جن کا کسی دیسی شخص کی نظر محض عام بات سمجھ کر ٹھکرا دیتا تھا۔ اب وہ ہی تاریخ جو ایک سائنسی اور ٹیکنیکل طریقے سے ہمارے ہاتھ میں آئی ہم اس پر بھروسہ کرتے ہوئے آگے چل رہے ہیں اس لیے ہم ان لوگوں کے شکر گزار ہیں کہ کہ انہوں نے اپنا قیمتی وقت اور سرمایہ خرچ کر کے ہمیں اپنے ماضی کے گزرے ہوئے ان حالات سے اگاہ کیا جس کا کوئی ہندوستانی یا پاکستانی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ہی قدیم تاریخ ہند انہیں انگریز مورخین کی مرہون منت ہے ہم نے انہیں مورخین کی آراء کو سامنے رکھ کر تھل کی قدیم تاریخ اور روڑاں کے آثار قدیمہ کی نشاندہی کرنی ہے۔ کننگھم کی کٹیلاگ اور وی اے سمتھ کی تحریر قدیم تاریخ ہند سے مجھے بہت ساری معلومات حاصل ہوئی جن کی مدد سے میں بندہ ناچیز اس حد تک پہنچا ورنہ ہمارے جیسے نا اہل آدمی کے بس کی بات ہی نہیں تھی۔

تہذیبِ وادیٔ سندھ سے قبل کا انسان

تہذیب وادیٔ سندھ سے پہلے انسانوں کا بسیرا پہاڑوں اور ان غاروں میں تھا جن کے نشانات دریائے سواں کے کناروں پر پائے گئے ہیں۔ تخلیق کائنات و کائناتی ارتقا لاکھوں سال پہلے وجود میں آیا اور زمین پر انسانی آبادکاری کب اور کہاں سے شروع ہوئی اس میں تاریخی طور پر ایک بہت بڑا ابھام پایا جاتا ہے۔ لیکن قدیم تہذیبوں اور تاریخ کا ارتقا انسانی زندگی کا عملی وجود اور رہن سہن کا سلسلہ جس طرح شروع ہوا اس کو مغربی یورپی مورخین نے جو تاریخی مواد ہمارے سامنے پیش کیا ہے وہ صرف حقیقت نہیں کچھ حد تک سائنسی اور ٹیکنالوجی کی مدد سے انخرا کردہ معلومات ہیں۔ اب ہمارے پاس ان معلومات کو تسلیم کرنے کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں۔ انہیں یورپی مورخین کی تحقیقی معلومات کی روشنی میں ہم قدیم تاریخ ہند یا وادیٔ سندھ کی قدیم تہذیب پر نظر ڈالیں تو ہمیں ہزاروں سال پیچھے کے حالات و واقعات نظر آتے ہیں جس سے ہمیں قدیم ہندوستان کی تاریخ کو سمجھنے میں بھی مدد ملتی ہے۔ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وادیٔ سندھ کی

تہذیب سے قبل کا انسان حجری دور، پتھر کے زمانے، سے وابستہ تھا۔ کس طرح یہ انسان جنگلوں اور غاروں میں جانوروں جیسی زندگی گزارتا تھا۔ اپنی روزمرہ خوراک کے لیے صرف جنگلی جانور ہی اس کے لیے کافی تھا۔ آج سے دس ہزار سال قبل انسان میں کسی قسم کی کوئی تہذیب نہیں ملتی۔ پتھر کے زمانے میں انسان صرف پتھر ہی کے اوزار استعمال کرتا تھا یہ ایک غیر تہذیب یافتہ انسان صرف جنگلی جانور کے گوشت پر گزارا کرتا اور اس ہجری دور میں انسان ننگے سر پاؤں اور برہنہ جسم کے ساتھ رہتے تھے۔

یہ لوگ اپنے بالوں کو تراشتے نہیں تھے اس لیے اکثر عورتیں کچھ حد تک اپنے لمبے بالوں کے ذریعے اپنے جسم ڈھانپ لیتی تھیں جبکہ کچھ عورتیں اور مرد شیر اور چیتا کی کھال کے ذریعے اپنے جسم چھپاتے تھے۔ اس وقت تک لوہے کا کوئی ثبوت نہیں ملتا انسان تمام تر اوزار پتھر کا استعمال کرتا تھا۔ جبکہ شکار کیے ہوئے جانور کا گوشت اپنے بڑے بڑے ناخنوں سے نوچ کر کھاتے تھے۔ یہ جنگلی انسان کچا اور بھنا ہوا گوشت بھی کھاتے تھے۔ ازدواجی طور پر یہ آزاد تھے ایک مرد بلاتفریق تمام عورتوں سے ازدواجی تعلق قائم کر سکتا تھا اور وہ بھی بغیر کسی تمیز کے۔ جو بچے ان عورتوں سے پیدا ہوتے تھے وہ صرف انہیں عورتوں کی اولاد سمجھے جاتے تھے اور ان بچوں کی پرورش بھی وہ ہی عورت کرتی تھی اس طرح یہ بچے تمام قبیلے کی مشترکہ اولاد کی طرح یا صرف اس عورت کی اولاد سمجھا جاتا تھا۔ لیکن یہی جنگلی انسان تقریباً ۹ سے ۱۰ ہزار سال قبل مسیح آہستہ آہستہ ترقی یافتہ اور تہذیبی نشونما کی طرف آتا دکھائی دیتا ہے۔ دریائے سواں کے کنارے پر جو انسانی آبادی کے آثار پائے گئے ان سے یہ صاف ظاہر ہوتا تھا کہ اب سے انسان ترقی کی راہ پر دکھائی دیتا ہے۔ قائد اعظم یونیورسٹی کے پروفیسر سلیم الحق جنھوں نے پنڈی کے جنوب مشرق میں روات کے قریب دریائے سواں کے کناروں پر جو مجرات یا آثارِ قدیمہ کے نمونے حاصل کیے اور انہوں نے جو تحقیق کی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قبل مسیح سے ۸ / ۹ ہزار سال پہلے انسان ترقی کی طرف مائل ہو چکا تھا اب وہ جنگلی اور تنہائی کی زندگی ترک کر کے ایک قبائلی اور اجتمائی زندگی کی تلاش میں پہاڑوں

اور غاروں سے نکل کر جنوب کے میدانوں کی طرف رخ کر رہا تھا کیونکہ سلیم الحق کے بقول دریائے سواں کنارے جو آثار ملے ہیں ان سے انسانی تہذیب کا ارتقا نظر آتا ہے کیونکہ اس وقت تک انسان اپنی ضرورت کے مطابق پتھر کے تمام اوزار ایجاد کر چکا تھا اور آسان زندگی کی تلاش میں کوشاں تھا۔

تہذیب وادیٔ سندھ کا مقام ارتقاء

قدیم ہندوستان کا جغرافیہ اس طرح کا ہے کہ اسے تین اطراف مغرب، مشرق اور شمال سے پہاڑی سلسلہ نے گھیرا ہے جبکہ جنوب مغرب کی طرف سمندر ہے۔ پاک ہند کے زرخیز اور زرعی میدانی خطے ہونے کی اصل وجہ ہی یہ ہے کہ ایک طرف شمال میں لمبا سرخ و سیاہ پہاڑی سلسلہ جبکہ جنوب میں انتہائی گہرائی میں سمندر اسی لیے شمالی پہاڑوں پر بارش کی وجہ سے جو سیلاب یا پانی کا ریلا جنوب کی طرف آتا ہے وہ اس میدانی علاقوں کو سیلاب کے پانی سے بھر دیتا تھا اور ساتھ ہی ان میدانی خطہ کی گہری سطح زمین بھی سیلاب میں آنے والی اس سرخ سیاہ مٹی سے بلند ہوتی رہی۔ پانی مزید آگے جنوب کی جانب سمندر میں بہہ جاتا تھا۔ یہ عمل تقریباً آج سے ۵۰ ہزار سال پہلے شروع ہوا یا اس سے بھی زیادہ ایک لاکھ سال کیونکہ کرہ ارض پر گرمی اور ہوا کی شدت بڑھی تو پہاڑوں پر سے برف پگھل کر پانی نے جنوب کا رخ کیا اور اس طرح ہندوستان قدیم کا تمام میدانی خطہ پانی سے بھر گیا یا پھر پانی کی بہاؤ کی لپیٹ میں آ گیا۔ معلوم نہیں یہ بہاؤ کا سلسلہ کتنے عرصہ تک جاری رہا لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ پہاڑوں پر سے برف پگھلی اور پانی کی صورت میں جنوبی میدانوں کی طرف رخ کیا۔ کوہ ہمالیہ کے نیچے جنوب میں تمام ہندوستان کا میدانی علاقہ اس کی لپیٹ میں تھا۔ اس عمل کو سائنسدانوں نے کیلیو سینیا اور ہیلو سینیا کا نام دیا ہے جبکہ اسی سیلابی ریلے کو مسلم سیاہ اور مورخ ابوریحان البیرونی نے اپنی کتاب الہند کے باب ۱۸ صفحہ ۱۱۴ میں لکھا ہے کہ ہندوستان کا میدانی خطہ پہلے سمندر تھا اور بعد میں پانی کے ساتھ آنے والی مٹی سے بھر گیا اور

آہستہ آہستہ خشک ہو کر ذخیروں کی شکل اختیار کر گیا۔

لیکن البیرونی کے خیال کے مطابق ہندوستان سمندر نہیں تو پانی کے بہاؤ میں ضرور تھا۔ پورے ہندوستان کے میدانی علاقے پانی کی لپیٹ میں تھے اور یہ سلسلہ کتنے عرصہ تک چلتا رہا معلوم نہیں لیکن حقیقت ہے کہ ۱۰ ہزار سال قبل مسیح تک ہندوستان کے خاص کر مغربی اور کچھ حد تک وسطی ہند تک کے میدانوں میں ذخیرے اور جنگلات وجود میں آ چکے تھے۔ ان کی وجہ ممکن ہے کہ پہاڑوں سے آنے والے پانی کی مقدار کم ہونے سے پانی دریاؤں کی شکل میں بہنے لگا جس سے پانی اونچی جگہ کو چھوڑ کر نچلی جگہوں سے بہنے لگا جس سے دریا وجود میں آئے۔ دریاؤں کا یہ سلسلہ تمام ہندوستان تک پھیل گیا۔ مغرب سے لے کر مشرق تک تمام ہندوستان میں باقاعدہ دریائی نظام وجود میں آ گیا۔ دریائے سندھ جو ہندوستان کے مغربی سرے سے ہو کر گزرتا تھا سے لے کر مشرقی ہند کے دریا تک ایک مربوط سلسلہ قائم ہو گیا جس میں شمال سے آنے والے سیلابی پانی نے اب پورے میدانی علاقے کی بجائے مختلف راستے اپنائے اس طرح ہندوستان میں کئی دریا وجود میں آئے مغرب میں سب سے بڑا دریا سندھ جس کے ساتھ معاون چھوٹے چھوٹے ے دریا جبکہ مشرقی ہند میں ۷ / ۶ اور دریا وجود میں آئے۔ سب سے بڑا دریا سندھ جو کہ بعد میں ہندوستان کی پہچان بنا، ساتھ ساتھ کوہ ہمالیہ سے لے کر جنوب میں سمندر تک اس کے مشرقی میدانی خطہ جو دوآب سندھ ساگر کے نام سے بھی مشہور ہوا کو سرسبز جنگلات اور گھاس نے ڈھانپ لیا، یہ ذخیرہ ایک بہت بڑے علاقے میں پھیلا ہوا تھا جس میں چھوٹے چھوٹے پانی کے نالے جن کو دریائے سندھ کا معاون سمجھا جاتا، تقریباً ۵ / ۶ بہتے تھے۔

ان معاون دریاؤں کے بارے میں پری پلس کے مصنف سکائلیکس جبکہ کچھ مورخین نے اس کتاب کو آرین کے نام سے منسوب کیا ہے۔ یہ کتاب ۸۰ء میں لکھی گئی تھی اور دریائے سندھ کے زیریں وادی کا ذکر کرتے ہوئے اس علاقے کو مصنف نے سیتھیا کا نام دیا ہے کہ دریائے سندھ کے سات دہانے تھے۔ ان میں ایک دہانہ جہاز رانی کے قابل تھا۔ اس ملک کی تجارتی بندر

گاہ جس کا نام انہوں نے بر بریکاں لکھا ہے، اسی دریا کے کنارے پر واقع تھی۔ مصنف لکھتا ہے کہ یہ علاقہ پارتھی سرداروں کے قبضہ میں تھا۔ ان تمام شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ علاقہ موجودہ تھل ہی تھا۔ ہاں بات ہو رہی تھی وادیٔ سندھ کے اس علاقے کی جہاں سے تہذیب وادیٔ سندھ کا ارتقاء ہوا، یہی وہ خشکی کا ایک بڑا علاقہ تھا جو شمال میں کوہ ہمالیہ تک ملتا تھا اور یہی وہ وقت تھا جو تقریباً آج سے ۹ / ۱۰ ہزار سال قبل مسیح جب انسانوں کے ساتھ ساتھ جانور اور چرند، پرند بھی دریائے سندھ کے مشرقی کناروں کے ساتھ چل کر موجودہ تھل کی سرزمین پر پہنچے اور یہاں سے تہذیبِ وادیٔ سندھ شروع ہوئی جس نے بعد میں پورے ہندوستان جبکہ مغرب میں سلطنتِ ایران، مصر اور یونان تک لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیا۔

تھل اور وادیٔ سندھ کی تہذیب

وادیٔ سندھ کی تہذیب کب اور کہاں سے شروع ہوئی اس کا ارتقائی زمانہ اور مقام وہ کون سا علاقہ تھا جہاں سے یہ تہذیب شروع ہوی۔ اصل میں تہذیب انسان کی عملی زندگی اور اس کے کارنامے ہی کا نام تہذیب ہے کہ جب انسان غیر مہذب اور تہذیب سے ناآشنا تھا اور زندگی کے سیاہ دور سے نکل کر باقاعدہ ایک منظم زندگی گزارنے اور مل جل کر رہنے یا معاشی اور ثقافتی کارنامے سرانجام دیے اور ترقی کی راہ پر گامزن ہونے کو ہی تہذیب کہتے ہیں۔ یہی وہ انسانی سوچ کی عکاسی تھی جو اس نے پتھر کے دور سے نکل کر اور غاروں کی زندگی ترک کر کے ایک باقاعدہ اجتمائی زندگی اور معاشی نظام کی طرف قدم بڑھایا اور ہندوستان کی آبادکاری میں اہم کردار ادا کیا۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ وادیٔ سندھ کی تہذیب کہاں اور کب شروع ہوئی؟ اور اس کا ارتقاء کب اور کیسے شروع ہوا؟ اس بارے میں بہت ساری آراء سامنے آچکی ہیں اور یہ حقیقت کھل کر آئی ہے کہ انسان نے تہذیبی اور ثقافتی زندگی میں قدم رکھنے کے لیے سب سے پہلے دریائے سندھ کی وادی یعنی دریائے سندھ کی مشرقی گہری میدانی پٹی کا انتخاب کیا جس کو وادیٔ

سندھ کا نام دیا گیا۔ ویسے بھی وادی کے لفظی معنی ہے نچلی زمین یا دو پہاڑوں نالوں اور دریاؤں کے درمیان کی زمین، دریا یا سیلابی پانی کی گزرگاہ جہاں بعد میں جنگل اور صحرا بیابان ہو چکا ہو۔ اس لیے سر بہ فلک پہاڑوں اور غاروں سے نکل کر جنگلی انسان نے دریائے سندھ کے ساتھ ساتھ ایک نئی زندگی کی طرف سفر شروع کیا تو ان کی نظر ان میدانوں پر پڑی جو کالا باغ میانوالی سے لے کر جنوب میں بھکر ولیہ "تھل" کے موجودہ علاقوں پر اور آہستہ آہستہ مزید جنوب کی طرف بڑھتے گئے۔ یہاں تک کہ ہڑپہ اور موہن جودڑو جیسے بارونق شہر وجود میں آئے۔

یہی وہ سرسبز و بیابان علاقہ جو مشرق میں دریائے چناب، جہلم تک تھا ان دو بڑے دریاؤں کے درمیان چھوٹے بڑے پانی کے نالے موجود تھے یہ معلوم نہیں کہ یہ قدرتی طور پر دریائے سندھ کے معاون بہتے تھے یا ان کو وادئ سندھ کے آباد کاروں نے اپنی ضروریات اور کاشتکاری کے لیے باصورت دیگر نہری نظام کی طرح کھود کر نکالے تھے۔ یہ خانہ بدوش قبائل جو پہاڑوں، غاروں اور ڈھلوانوں سے نکل کر اس میدانی پٹی میں پہنچے تھے، انہوں نے ان علاقوں کا انتخاب کیا اور انہی علاقوں میں اپنی جائے سکونت اختیار کی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ کون سا زمانہ تھا کتنا عرصہ پہلے انسان نے ایک تہذیب یافتہ زندگی کی شروعات کی؟ اس بارے میں بہت سارے مورخین اور یورپی، انگریز محققین نے اپنے اپنے نظریات پیش کیے۔ ان میں کچھ کے مطابق وادئ سندھ کی تہذیب کا ارتقاء کا وقت ۸ / ۷ ہزار سال ق م جبکہ بعض کے نزدیک ۵ / ۶ ہزار سال ق م جبکہ مسٹر گوڑ جو ایک برٹش فوج کا افسر تھا اور ان کے ساتھ پروفیسر نور الحسن جنہوں نے پینی سلونیہ اور ٹاٹا انسٹی ٹیوٹ فنڈامینٹل ریسرچ سنٹر بمبئی انڈیا میں تحقیق کے بعد دی تھی، ان کا کہنا ہے کہ وادئ سندھ کی تہذیب ۳ ہزار سال قبل مسیح سے شروع ہوئی جبکہ سر جان مارشل نے ۱۹۲۱ء میں ٹیکسلا کے مقام پر جو ریسرچ کی اس کے مطابق انہوں نے ہندوستان کے تاریخی عہد میں ۲۰۰۰ سالوں کا اضافہ کر دیا جس سے معلوم ہوا کہ تہذیب وادئ سندھ کا ارتقاء ۵ ہزار سال قبل مسیح سے شروع ہوا لیکن ایک بات دھیان سے دماغ میں ہونی چاہیے کہ جو جو تحقیق یا

رپورٹ ان یورپی اور انگریز مورخین نے دی ہیں، وہ صرف اور صرف سائنسی تحقیق کے ذریعے سے معلوم کردہ اعداد وشمار پر مشتمل ہیں اور وہ اعداد وشمار انہی آثارِ قدیمہ کے نمونے کی تحقیق سے تیار کردہ ہیں جو ایک تہذیب یافتہ انسان کا کارنامہ تھا۔

مثال کے طور پر انسان نے کاشتکاری کی یا پھر مٹی کے برتن اور مکان وجھونپڑی میں رہنے اور جنگلی جانوروں کو پالتو بنانے جیسے کارنامے جن کی تحقیق سے انخراکردہ اعداد وشمار ہیں۔ یہ تو ایک تہذیب یافتہ دور کی بات ہے لیکن اس کے متعلق تو کسی نے آگاہ نہیں کیا کہ انسان نے اس وادی میں قدم کب رکھا اور اس تہذیب یافتہ عمل تک پہنچنے میں کتنا وقت لگا؟ یہ لوگ تہذیب وثقافت کی بات کرتے ہیں لیکن ان کو تو معلوم ہی نہیں کہ اس تہذیب اور انسان کو ترقی کے اس مقام تک پہنچنے میں کتنا وقت لگا ہوگا؟ اس کے لیے اگر ہم اسلامی نظریہ سامنے رکھیں تو حضرت آدم علیہ سلام جو انسانوں کا باپ ہے، کیونکہ آدم سے پہلے تو کسی انسانی وجود کے متعلق سوچنا بھی پاگل پن ہے، اوران برے خیال کے متعلق سوچنا بھی گناہ ہے، اور جن نظریات کو یحییٰ امجد نے اپنی کتاب میں تحریر کیے ہیں تو انہوں نے ڈارون کے نظریہ کا حوالہ دیا ہے جس میں اسلامی تاریخ وروایات کے مطابق حضرت آدم کو دنیا میں آئے تقریباً کم وبیش ۱ہزار سال ہو چکے ہیں۔

وادئ سندھ اور تہذیبیں

تہذیب کا اصل ترین مفہوم شہروں میں رہنے کا طور طریقہ اور اس سے وابستہ سماجی زندگی ہے۔زندگی کا وہ فن جس کا نمونہ وہ دیہات ہیں جو تین چار ہزار قبل مسیح تک عراق کی پہاڑی تلہیٹو ں اور اس کے جنوب میں دریائے دجلہ وفرات کے کناروں پر آباد تھے، یا پھر کوہ ہمالیہ کے جنوب میں واقع دریائے سندھ کے مشرقی کناروں کے ساتھ ساتھ میانوالی، بھکر، لیہ، جھنگ اور مظفر گڑھ تک پھیلے ہوئے تمام چھوٹے بڑے شہر اور دیہات تھے جن میں ہڑپہ، موہن جوداڑو اور قدیم روڑاں شامل ہے، جن کے کھنڈرات پورے تھل میں پھیلے ہوئے تھے۔ جبکہ ایک بڑا قصبہ جو

مغربی ترکی میں کوئنہ کے پاس چتال ہیوک کے مقام پر ۷ ہزار سال قبل مسیح یا اس سے بھی پہلے آباد تھا، لیکن اس سے پہلے صرف جریکو ہی وہ قدیم ترین شہر تھا جو اردن کی خشک وادی میں آباد تھا جس کے دفاعی انتظامات کے لیے ایک لمبی چوڑی دیوار اور چٹان کو کاٹ کر بنائی گئی خندق کی وجہ سے اس شہر کو دوسرے شہروں سے ایک امتیازی حیثیت حاصل تھی۔ جریکو کے مقام پر کھدائی کے وقت کاربن چودہ سے تحقیق کے مطابق جو عہد یا تاریخ متعین کی گئی، اس کے مطابق یہ شہر لگ بھگ ۸ ہزار سال قبل مسیح میں آباد تھا اور یہ شہر دس بارہ ایکڑ پر پھیلا ہوا تھا۔ اسے ایک دل پسند چشمے کے کنارے آباد کیا گیا۔ سر موریٹمر وہیلر کے مطابق وہاں آباد لوگوں نے اپنی معاشی اور جانی حفاظت کے لیے تمام ضروری انتظام کر لیے تھے اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بقول مورخین تہذیب کا طلوع میسو پوٹیمیا اور سندھ کی وادی میں برابر ۴ / ۳ ہزار جبکہ ایک دوسرے اندازے کے مطابق ۷ / ۸ ہزار سال قبل مسیح سے شروع ہوا۔ ہم نے دیکھا کہ وادئ سندھ اور میسو پوٹیمیا کی تہذیبوں کا آپس میں کتنا تعلق تھا۔ اسی رشتہ کو واضح کرنے کے لیے ہم کچھ قدیم تحریری حوالوں کا ذکر کرتے چلیں کہ تہذیب میسو پوٹیمیا جس کو تہذیب دجلہ فرات بھی کہا جاتا ہے، وہ اہم مطالعہ جس میں ارک عہد ۳۰۰۰ / ۳۵۰۰ سال قبل مسیح میں اس وقت مذہبی اور ذاتی معلومات اور حساب کتاب مٹی کی تختیوں پر کنندہ یا دیگر طور طریقوں میں رکھا جاتا تھا۔

یہ ماقبل تاریخ کارنامہ تھا جس میں لوگ ابھی تک علم و فن کے شعور تک نہیں پہنچ پائے تھے۔ لوگ اس وقت تک اپنی روزمرہ زندگی کے حالات اور حساب کتاب زبانی یا عقلی یاداشت کے ذریعے سے کرتے تھے۔ ارک عہد اور تہذیب میسو پوٹیمیا کے ساتھ ساتھ ۴ / ۵ ہزار سال قبل مسیح تک وادئ سندھ کی تہذیب بھی اپنے شعور کو پہنچ چکی تھی۔ کوہ ہمالیہ کے نیچے جنوب کے میدانوں اور دریائے سندھ کے مشرقی کناروں کے ساتھ ساتھ جنوب میں سمندر تک پھیل چکی تھی۔ یہ ۴ ہزار سال قبل مسیح کا زمانہ تھا جب وہ جنگلی اور خانہ بدوش انسان شہری اور سماجی زندگی کے فن کو حاصل کر چکے تھے۔ ہم نے یہاں تہذیب وادئ سندھ کے آغاز اور اہمیت کا جائزہ لینے کے لیے اس کے

ساتھ ظہور پذیر ہونے والی دوسری تہذیبوں کا ایک مختصر حوالہ دیا ہے کہ کس طرح ان دونوں تہذیبوں اوران کے باسیوں کا آپس میں رشتہ اور تعلق لین دین تھا۔ وادیٔ سندھ سے پہلے میسو پوٹیمیا کی تہذیب اپنی ارتقائی زندگی کا سفر طے کر چکی تھی کیونکہ ایک فرق ضرور تھا وادی دجلہ اور فرات کی سرزمین پر انسانی زندگی اس وقت سے وجود میں آئی یعنی اللہ تعالی نے حضرت آدمؑ کو معبوث فرمایا۔ اس لیے یہ سرزمین انبیاء کے مبارک قدموں کی وجہ سے تمام دوسرے علاقوں کی نسبت فن و ثقافت کے میدان آگے تھی لیکن وادیٔ سندھ کی تہذیب بھی اس زمانے سے بھی پہلے تک کئی فنی اور ثقافتی کارنامے سرانجام دے چکی تھی۔ اس لیے کہ عرب کے خطے اور وسط ایشیاء کے علاقوں میں پیغمبروں پر اللہ کی طرف سے بھیجی گئی تعلیمات کے نزول کی وجہ سے ان علاقوں میں تہذیب اور علم وفن عام ہوتا رہا۔ ہر نبی کے دور میں دینی تعلیمات کے علاوہ دنیاوی تعلیم کو بھی فروغ ملتا رہا جبکہ ان تمام واقعات کو تاریخ و شریعت کی صورت میں محفوظ کیا جاتا تھا جو کافی حد تک مستند بھی تھا لیکن دوسری طرف وادیٔ سندھ کی تہذیب کا جنم ایک ایسے وقت اور خطے میں شروع ہوا جو اس سے پہلے ممکن ہے کہ ایک ویران جنگل ہوا اور انسانی زندگی کا کہیں دور دور تک نام ونشان ہی نہ ہو لیکن وادیٔ سندھ کی فن و تہذیب سے متعلق جو شہادتیں ملتی ہیں ان کی نوعیت خاصی واضح ہے۔

اس تفصیل کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ بس اتنا مختصر لفظوں میں بیان کیا جاتا ہے کہ کم وبیش ۴ ہزار سال قبل مسیح تک سندھ کی وادی شہری اور سماجی زندگی کی آماجگاہ بن چکی تھی کیونکہ ایران کی سطح مرتفع میں سیدھے اوپر کی طرف اُٹھتے ہوئے پہاڑ اور ان کے نیچے دونوں جانب دجلہ اور فرات کی وادی ہو یا پھر کوہ ہمالیہ کے نیچے جنوب میں دریائے سندھ کی وادی، ان میں مختلف معاشرے کے لوگ آباد تھے۔ ان کا آپس میں کہیں نہ کہیں ضرور تعلق تھا اور ان کے درمیان آمدورفت اور تجارت کا سلسلہ بھی قائم تھا جو ایک دوسرے کے درمیان مالی تجارت کی صورت میں تھا۔ ہم اس تجارت اور آمدورفت کے بارے میں کچھ اہم اور ضروری معلومات کا حوالہ دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہماری دلیل کو ایک تاریخی اہمیت حاصل ہو جائے کہ کس طرح

مغربی خلیج فارس کے راستہ سے ان دونوں تہذیبوں کا آپس میں رشتہ اور لین دین اور تجارت تھا۔ اس بات کی وضاحت کے لیے ہم نے ان تحریروں کو بیان کیا کہ کس طرح میخی یا پیکانی تحریر (CUNEIFORM) میں اس کی وضاحت موجود ہے جبکہ میری اور آکادی تحریری دستاویزات میں بھی ایک خطہ جس کا نام دلمن اور تیلمن تحریر ہے، کا ذکر ایک غیر ارضی بہشت کے نام سے کیا گیا ہے کہ ایک ایسا مقام جہاں سے سورج نکلتا ہے۔ ان باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ خطے سمیر کے مشرق میں واقع تھے۔ ان تحریروں سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ دلمن کا جہاز ۲۴۵۰ ق م سے بھی پہلے تک لاگاش کے شہروں اور نانشے سے عمارتی لکڑی لاتا تھا جبکہ اس سے ایک صدی قبل سرگوں اعظم نے اپنی تحریر میں بیان کیا ہے کہ دلمن، ماگانہ اور میلوہہ سے آئے جہاز اس کی نئی راج دھانی ریاست آگیڈ کی بندرگاہ پر ٹھہرتے تھے۔

اب سوال یہ ہے کہ آگیڈ کس مقام پر آباد تھا؟ اس کے متعلق ایم۔ ای۔ ایل میلون کا بیان ہے کہ یہ شہر بابل کے نواح میں واقع تھا اور یہ تینوں شہر ار، لاگاش اور نانشے اس ریاست کے اندر آباد تھے جس کا دارالسلطنت آگیڈ تھا۔ یہ ریاست موجودہ عراق اور اس کے گردونواح کے علاقوں پر مشتمل تھی جبکہ دلمن اور تیلمن جسے عام طور پر جزیرہ نما بحرین کو قرار دیا گیا ہے، لیکن ایس۔ این کریمہ نے دلمن کو سندھ کا خطہ مانا ہے اور میرے خیال کے مطابق بھی دلمن نام کی بندرگاہ پاک ایران سرحد کے قریب واقع تھی جہاں مشرقی ہند سے آنے والے جہاز ٹھہرتے تھے۔ وہاں سے آگے مغرب کی طرف چل کر آگیڈ کی بندرگاہ موجودہ عراق کے جنوبی ساحل پر بصرہ کے قریب واقع تھی جبکہ دیگر دستاویزات سے ظاہر ہوتا ہے کہ میلوہہ جنوبی مغربی ہند کے ان علاقوں کا نام تھا جہاں تہذیب وادیٔ سندھ کا ارتقا ہوا اور جہاں موہنجودڑو آباد تھا، جہاں سے ۲ ہزار سال قبل مسیح میں میلوہا سے تاجر سونا، چاندی، تانبہ، سنگ لاجواد کے ٹکڑے، پتھر اور ہاتھی دانت کے منکے، کنگھے، گہنے کے نمونے کاجل، لکڑی اور شاہد موتی، مچھلی کی آنکھیں ایک شہر میں لاتے تھے جو میسوپوٹیمیا کے علاقے کا مرکزی شہر تھا۔ یہ تمام سامان وادیٔ سندھ کی تہذیبی ترقی کی مثال تھا جو ار

اور آگیڈ تک پہنچتا تھا۔اس کے علاوہ اور بھی بہت ساری شہادتیں ان دونوں تہذیبوں کے تعلق کے لیے موجود ہیں جبکہ ایک شہادت یہ بھی ملی ہے کہ بلوچستان کے جنوب میں سمندر کے قریب لوتھل کے مقام پر کھدائی کے دوران کچھ صابونی پتھر کی گول مہریں ملی ہیں جو سندھ تہذیب کی مہروں سے ہلکی سی مشابہت رکھتی تھیں۔ یہ مہریں خلیج فارس کے شمال مغرب کے نصف حصے اور جزیرہ بحرین کے جنوبی علاقوں میں عام پائی جاتی تھیں جبکہ بہت سارے اور مقامات ایسے ہیں جہاں ان دونوں تہذیبوں کے تعلق کو تقویت ملتی ہے جس میں وادیٔ دشت کے مشرقی سرے پر بحیرۂ عرب سے ۳۰ میل دور مقام شکاگن اور ستوکا قدیمہ (سوختہ کوہ) یہ دونوں مقامات بلوچستان کے جنوب میں سمندر کے قریب پائے گئے ہیں جہاں سے ملتے جلتے اقتصادی حالات کا تصور پایا جاتا ہے۔ جبکہ دوسری طرف عہدِ سرگون تک تہذیب وادیٔ سندھ پختگی کو پہنچ چکی تھی جس کی مثال وہ شہادتیں اور آثارِ قدیمہ کے نمونے جو میسوپوٹیمیا کے شہروں ار، کیشا ور تل اسمار کی کھدائی کے دوران تہذیب سندھ جیسی مہروں کا پایا جانا اور تل اسمار کی تہوں میں سے ہڑپہ جیسے نمونوں والے منکوں کا ملنا اور تہذیب سندھ کے مخصوص نمونوں کی ہڈیوں کے ساتھ کی گئی مینا کاری اور مٹھیا والے برتنوں کی موجودگی، یہ تمام شواہد ظاہر کرتے ہیں کہ یہ دونوں تہذیبیں ایک ساتھ نمودار ہوئیں اور ان کا آپس میں گہرا تعلق تھا۔یہی وجہ تھی کہ قدیم ہندوستان مغرب کی نظر میں ایک خاص مقام رکھتا تھا جو ان کی آمد کا سبب بنتا رہا۔اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ قدیم وادیٔ سندھ کے آباد قبائل اس قابل ہو چکے تھے کہ ان کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے اور ان کے وسائل پر قبضہ کرنے کے لیے ان بیرونی وحشی قبائل نے وادیٔ سندھ پر حملہ آور ہوئے۔ ان میں سب سے پہلے آریہ نام کے قبائل نے وادیٔ سندھ کی تہذیب کو نشانہ بنایا اور ان مقامی قبائل جن کو دراوڑی نسل کہا گیا ہے۔

وادیٔ سندھ کے قدیم مقام

ہڑپہ اور موہنجودڑو یہ ایسے مقامات ہیں جنہیں وادیٔ سندھ کے ان قدیم آباد شہروں میں

مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ یہ تہذیب وادیٔ سندھ کے اہم ترین مقامات ہیں جن کا واضح ثبوت ان مقامات سے ملنے والے آثارِقدیمہ کے نمونے ہیں یہ دونوں شہر اول ذکر دریائے سندھ کے کنارے صوبہ سندھ کے شہر کے مقام جبکہ موخرالذکر اس کے ۴۰۰ میل شمال مشرق میں دریائے راوی کی پرانی گزرگاہ کے مغربی کنارے صوبہ پنجاب کے شہر ساہوال کے قریب واقع ہے۔ یہ دونوں شہر ایک منصوبہ بندی کے تحت تعمیر کیے گئے تھے اور یہ تین تین میل کے رقبے پر پھیلے ہوئے تھے۔ جبکہ موہنجوداڑو ایک اونچے ٹیلے پر ایک قلعہ نما جو مستطیل بلاکوں سے بنی شطرنج کی بساط جیسے پلان پر بنایا گیا اور جس کی اونچائی ۵۰ فٹ تک تھی۔ اس شہر کو پختہ اینٹوں اور ٹھوس میناروں کے ذریعے سے مضبوط کیا گیا تھا جبکہ ہڑپہ کی بھی تعمیرات پختہ اینٹوں سے کی گئی تھی جو ۴ / ۱۲ انچ لمبائی چوڑائی اور ۲ انچ موٹائی میں تھی جن کو خود میں نے بھی ہڑپہ جا کر دیکھا تھا۔ یہ شہر کیونکر تباہ ہوا اور کون لوگ ان کی بربادی کا سبب بنے؟ یہ سب کچھ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ بہت سارے مورخین نے ان حالات کو وضاحت سے تحریر کیا ہے اور ہم صرف ان مقامات سے حاصل ہونے والی تحقیق اور اجرا کردہ اعداد و شمار پیش کر کے تہذیب وادیٔ سندھ کی ارتقائی عمر کا اندازہ لگانے کی کوشش کریں گے۔ حالیہ برسوں تک سندھ کی تہذیب کے عہد کا تعین اور معلومات مکمل طور پر مغربی ایشیاء بالخصوص سمیر اور اکاد کے ساتھ رابطوں پر مبنی تھی جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ میسوپوٹیمیا تک کے علاقوں میں تحقیق سے جو تاریخیں اخذ ہوئی ان کے مطابق ۲۳۰۷ ق م عہدِ سرگون سے لے کر ۱۷۰۰ ق م جاتا ہے جبکہ ایک دوسری تحقیق جو ۱۹۴۶ء پینی سلونیہ میں کی گئی اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سرگون کا عہد ۲۵۰۰ سال قبل مسیح تک جاتا ہے جبکہ وادیٔ سندھ کے ان مقامات کی جو تحقیق ریڈیو کاربن یا کاربن ۱۴ کے ذریعے پینی سلونیہ اور بمبئی کی ٹاٹا انسٹی ٹیوٹ آف فنڈامینٹل ریسرچ میں کی گئی ان کی تفصیل کچھ یوں ہے۔

نمبر ۱: کوٹ ڈیجی تمدن کی سب سے نیچے کی تہہ کے نمونوں کے اعداد و شمار ۲۶۰۵ ق م تا ۲۴۱۷ ق م۔

نمبر ۲:	ہڑپہ والی تہہ ۲۱۰۰ ق م تا ۱۹۷۵ ق م کالی بنگن

نمبر ۳:	ہڑپہ تمدن کے بعد ۱۹۱۰ ق م تا ۱۷۹۰ ق م جبکہ ایک درمیانی تہہ ۱۹۶۰ تا ۱۹۳۰ ق م۔

نمبر ۴:	موہنجوداڑو کے مقام سے جو جل کر کوئلہ کی طرح اناج کے دانے جو بہت عرصہ ہوا پائے گئے تھے جنہیں ایک دیرینہ تہہ سے برآمد کیا گیا، ان کو ۱۶۵۰ ق م تا ۱۷۶۰ ق م بتایا گیا۔

نمبر ۵:	لوتھل ہڑپہ والے دور (لوتھل اے) ایک سے چار دور کے نمونے ۲۰۰۰ تا ۲۰۱۰ ق م جبکہ دور چار اے ۱۸۹۵ تا ۱۷۹۰ ق م قرار پائی ہیں۔

ہاں یاد رہے کہ ان ریڈیو کاربن تاریخوں کی اہمیت کا اندازہ لگاتے وقت غلطی کے کچھ ذرائع کو یاد رکھنا ہوگا۔ ان میں غلطی کا عنصر موجود ہے کیونکہ تمام شہروں کے جو نام اور اعداد و شمار بیان کیے ہیں، یہ تمام کے تمام انگریز مورخین کے اجرا کردہ رپوٹوں سے حاصل کیے ہوئے ہیں۔ ان میں سے کسی ایک بھی مقام کا نام مقامی زبان یا تاریخ کے حوالے سے نہیں ملا۔ اس لیے ہماری مجبوری ہے کہ ہم نے ان کو ہی صحیح ماننا ہے۔ سرمورٹیمر وہیلر کی کتاب وادئ سندھ اور تہذیبیں صفحہ نمبر ۷۱ تا ۷۴ سے حوالہ دیا گیا ہے۔

ان تمام شواہد سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ان تمام رپوٹوں کے مطابق تو وادئ سندھ کی تہذیب کا ارتقائی دور ۲۰۰۰ سے ۲۵۰۰ سال قبل مسیح ہے لیکن ٹیکسلا کی کھدائی کے دوران سرجان مارشل نے وادئ سندھ کی تہذیب کے ارتقائی زمانے میں مزید ۲۰۰۰ سالوں کا اضافہ کر دیا ہے۔ اس طرح ہمارے اس نظریے کو اہمیت ملتی ہے جس میں ہم نے وادئ سندھ کی تہذیب کے ارتقاء کا زمانہ ۴۰۰۰ / ۵۰۰۰ سال قبل مسیح قرار دیا ہے۔

وادئ سندھ کے مقامی قبائل

آریہ کی آمد سے قبل دریائے سندھ کی وادی اور اس کے کناروں پر آباد لوگوں کے بارے

میں کہا گیا ہے کہ یہ دراوڑی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ مطلب سیاہ رنگ، چھوٹے قد، چپٹی ناک، بدصورت لیکن کافی محنت کش اور جنگجو طبیعت اور سخت جان کے مالک تھے۔ اس لیے آریہ ان لوگوں کو کالے ناگ (کالے سانپ) کے نام سے پکارتے تھے۔ کیونکہ ان کی نسبت آریہ خوب صورت، گوری رنگت اور درمیانہ قد کے لوگ تھے۔ داروڑ کا نام بھی آریہ کی طرح مشترک تھا کیونکہ وادیٔ سندھ کے مختلف قبائل کو ملا کر ایک نام تھا، جیسا کہ بہت سارے قبیلوں پر مشتمل مشترک نام آریہ۔ ان داراوڑی قبائل کے بارے میں سنسکرت کی کتاب رگ وید میں تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے کہ ان میں بہت سارے قبیلے شامل تھے۔ ان میں خاص قبیلے داس اور اشوا تھے۔ یہ لوگ باقی قبیلوں کی نسبت زیادہ مضبوط اور طاقت ور سمجھے جاتے تھے۔ داس اور اشوا قبائل کے لوگوں کا ان علاقوں میں ایک خاص مقام اور کردار تھا۔ یہ ان علاقوں میں دوسری قوموں پر حاوی تھے اور ممکن ہے کہ وادیٔ سندھ میں حکمران اور بادشاہ ہوں کیونکہ یہ لوگ باقی چھوٹی ذات کی برادریوں سے مالیہ اور تاوان بھی وصول کرتے تھے اور ان کے پاس با قاعدہ جنگجو لوگوں کی اچھی تعداد تھی۔ اس کے علاوہ ممکن ہی نہیں تھا کہ داس اور اشوا خود کو حاکم اعلیٰ کہہ سکیں۔ یہی وادیٔ سندھ کے وہ مقامی قبائل تھے جنہوں نے آریہ کا مقابلہ کیا اور مرتے دم تک ڈٹے رہے۔ دراوڑ قبائل ویسے تو تمام مغربی پنجاب اور دریائے سندھ کے مشرقی کنارے کے ساتھ ساتھ جنوب میں موہنجوداڑو تک پھیلے ہوئے تھے لیکن ان کی زیادہ آبادیاں دریائے سندھ اور جہلم کا درمیانی خطہ موجودہ تھل تھا اور اس علاقے میں یہ لوگ کس طرح منظم تھے، اس بات کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ آریہ کی مقدس کتاب رگ وید میں تحریر ہے کہ سندھ اور جہلم دریاؤں کے دوآب میں دراوڑوں کی درجنوں بستیاں اور چھوٹے بڑے شہر آباد تھے۔ مشہور امریکی ماہر عصریات ڈاکٹر جوناتھن مارک کنائر کے مطابق ۲۶۰۰ ق م سے قبل وادیٔ سندھ اور مغربی پنجاب میں بڑی بڑی انسانی آبادیاں وجود میں آ چکی تھیں۔

انسان خانہ بندوشی کی زندگی ترک کر کے اجتماعی زندگی کی طرف آ چکا تھا اور اپنے گھروں

میں جانور پالنے سیکھ چکا تھا۔ یہ لوگ دریائے سندھ کی مشرقی میدانی پٹی میں پھیلے ہوئے تھے۔ یہاں ان کا ذریعہ معاش کھیتی باڑی اور مال مویشی پالنا تھا۔ یہ لوگ خانہ بندوشی کی زندگی ترک کر کے سماجی زندگی، گاؤں اور قصبات میں مل جل کر رہنا سیکھ چکے تھے۔ ۳/۴ ہزار سال قبل مسیح تک یہ لوگ جہالت سے نکل کر ایک باقاعدہ تہذیب یافتہ اور سماجی زندگی کا ارتقائی سفر مکمل کر چکے تھے۔ انہوں نے پڑھنے لکھنے اور حساب کتاب کا طریقہ بھی سیکھ لیا تھا۔ اب انہوں اپنے ملک و وطن سے باہر دوسری تہذیبوں میسو پوٹیمیا اور مصر سے آمد ورفت تجارت اور نقل وحمل شروع کر دی تھی جس سے متعلق پچھلے باب میں تحریر ہو چکا ہے۔ دنیا کی دوسری عظیم تہذیبوں سے رابطہ اور لین دین اس بات کا منہ بولتا ثبوت ہے کہ وادیٔ سندھ کے مقامی آباد تہذیب اور فن سے کتنے حد تک واقف ہو چکے تھے۔ انہوں نے ایک مہذب زندگی کے تمام راز سیکھ لیے تھے۔ وادیٔ سندھ کا قدیم انسان فن وثقافت سے واقف ہو چکا تھا۔ انہوں نے پودے اُگانے، جانور پالنے، برتن سازی اور پختہ گھروں کی تعمیر جو پکی اینٹوں سے کی جاتی تھی، شروع کر چکے تھے۔

آریہ:

آریہ کون تھے؟ وہ کہاں سے آئے تھے؟ ان کی تاریخی حیثیت کیا تھی؟ اور ان کی اصل جائے پیدائش اور وطن کون سا علاقہ تھا؟ یہ تمام سوالات غور طلب ہیں اور یہ ایک الجھا ہوا مسئلہ بھی ہے۔ ابھی تک مورخین کے نزدیک واضح نہیں ہو سکا کہ آریہ کس سرزمین کے باسی تھے اور کس قوم سے ان کا تعلق تھا۔ اگر یہ لوگ ایک تہذیب یافتہ قوم سے تعلق رکھتے تھے تو انہوں نے دنیا کو کون سی تہذیب اور ثقافت سے نوازا یا پھر کہیں ایسا تو نہیں کہ تہذیب وثقافت کی بجائے انہوں نے صرف اور صرف وادیٔ سندھ کو پامال کر ڈالا ہو اور جنگ وجدل تباہی و بربادی کے علاوہ ان کے پاس کچھ نہ تھا۔ لیکن آریہ کے متعلق بہت سارے مورخین نے اپنی تحقیق میں بڑی حد تک ان کے اصل جائے مقام تک پہنچنے کی کوشش کی ہے اور اپنی اپنی معلومات ونظریات کے پیش نظر یہ بات سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ ہم نے ان مورخین کی آراء کو تحریر کرنے کی کوشش کی ہے جو قاری کے

لیے آسان ہو۔

اے۔ایل باشم جو ایک یورپی تاریخ دان تھا، نے اپنی کتاب "ہندوستانی تہذیب کی داستان" میں بیان کیا ہے کہ جو لوگ وادیٔ سندھ کی سرزمین پر حملہ اور ہوئے تھے، اصل میں وہ ہندوستانی آریہ ہیں۔ انہوں نے مزید لکھا کہ انگریزی میں ان کو آرین کہتے ہیں جبکہ یہ لفظ قدیم اہلِ فارس نے بھی استعمال کیا ہے، جبکہ ایرانی لفظ آئر کی شکل میں موجود ہے۔ آئر اور آریہ ایک ہی نسل کے الفاظ ہیں جو اس انتہائی مغربی خطہ کا نام جہاں قدیم زمانوں میں ہند یوری لوگ رہتے تھے۔اے۔ایل باشم مزید بحث کرنے سے کتراتے ہیں اور اسی پر یقین کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ تقریباً ۲۰۰۰ / ۲۵۰۰ ہزار سال قبل مسیح سے ان عظیم میدانی علاقوں جو پولینڈ سے مرکزی ایشیا تک پھیلا ہوا تھا، خانہ بدوش اور وحشی قبائل آباد تھے۔ یہ لوگ طویل القامت، گورے رنگ اور لمبے قد کے تھے۔ یہ قبائل اکثر گھوڑا پال مشہور تھے اور ان گھوڑوں کو چار پہیے والی رتھ میں جوتتے تھے جبکہ اصل ذریعہ معاش مویشی پالنا اور کھیتی باڑی تھا۔ جب ایک وقت آیا کہ یہ قبائل جتھے بنا کر مغرب سے جنوب مشرق کی طرف بڑھنے لگے تو ان میں سے کچھ یورپ پر حملہ آور ہوئے۔ وہاں ان کا شمار یونانیوں، لاطینیوں، کلیسیوں اور تیوتانیوں کے نام سے ہوا۔ ان میں سے کچھ قبائل اناطولیہ میں ظاہر ہوئے۔ان کے مقامی باشندوں سے تعلق کی وجہ سے اور باہم مدغم ہونے سے ہیتوں کی عظیم مملکت وجود میں آئی اور ان میں جو اپنے آبائی وطن میں مقیم رہے اور بعد میں بالٹک اور سیلھوائی اقوام کے وارث اعلیٰ بنے جبکہ ان کے ایک حصے نے جنوب کی طرف اپنا سفر شروع رکھا۔ کوہ قاف اور ایرانی پوٹھار کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے مشرق وسطی کی تہذیبوں پر حملہ آور ہوئے۔ باشم مزید لکھتے ہیں کہ بابل کے فاتحین کا تعلق بھی اسی گروپ سے ہے لیکن ۱۴۰۰ قبل مسیح میں شمال مشرقی شام میں ایک متانی نام کی قوم ابھری۔ ان کے بادشاہوں کے نام ہندو ایرانی تھے۔ان کے دیوتا کے نام بھی کچھ اس طرح کے تھے جس سے تمام ہندوستانی مذہبی عالم واقف ہیں۔ ان دیوتاؤں کے نام یہ ہیں (اندا، متر، نسیتہ، ویدون اور روادن)۔ یہ چھاپہ مار قبائل

رفتہ رفتہ مشرق وسطی کی قدیم تر آبادی میں ضم ہوتے گئے، قدیم تہذیبیں تازہ ہوتی گئیں اور مادی ترقی نئی بلندیوں تک پہنچ گئی مگر جب یہ لوگ وادئ سندھ کے قدامت پسند شہروں پر حملہ آور ہوئے تو وادئ سندھ کی تہذیب اور مقامی آبادکاروں نے ان کو برداشت نہ کیا اور اپنے آپ میں ضم نہ ہونے دیا جس کی وجہ سے ان حملہ آوروں نے مقامی لوگوں کا قتلِ عام کیا اور وادی کے تمام شہروں کو برباد کر دیا۔ مزید یہ کہ ان قبائل نے جہاں وادئ سندھ کی تہذیب کو برباد کیا، وہاں خود بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور بالآخر ان کو تہذیب سندھ کے آگے سر جھکانے پڑ گئے۔

دوسرے مورخ کی رائے:

ڈی۔ڈی۔کوسمبی، یہ ایک انگریز جو انگلستان کا رہنے والا تھا، نے بھی قدیم ہندوستان کے نام ایک کتاب لکھی۔ اس میں انہوں نے اپنی کتاب کے باب نمبر ۴، صفحہ نمبر ۱۰۱ پر آریائی اقوام کے بارے میں تحریر کیا ہے کہ لفظ آریہ کے معنی ہر زبان میں مختلف ہیں۔ جیسا کہ سنسکرت میں آریہ کا معنی ہے کہ "پیدائشی آزاد، نجیب السیرت یا تین اعلیٰ ذاتوں کا ایک رکن"۔ کوسمبی مزید لکھتے ہیں کہ دوسرے الفاظ کی طرح آریہ کے معنی بھی وقت کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتے رہے ہیں۔ اس طرح کہ جیسے عزت و احترام کی جگہ لفظ جناب ان کے مترادف کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ اسی کے ساتھ انتہائی قدیم دور میں جب دنیا جہالت سے نکل کر ایک روشن دور میں داخل ہو رہی تھی تو اپنے آپ کو کسی خاص قبیلہ یا مشترک قبائل کو ایک حیثیت دینے کے لیے لقب استعمال کیا جاتا تھا۔ آگے انہوں نے لکھا ہے کہ ہندوستان کی اصل تاریخ ان قدیم آریوں سے شروع ہوتی ہے۔ کوسمبی نے کچھ دوسرے مورخین کے خیالات نقل کیے ہیں اور ان کے حوالہ سے لکھا ہے کہ وادئ سندھ کے لوگ بھی آریہ تھے۔ نازی حکومت اور ان کے سرکاری فلسفہ ساز نے لفظ آریہ کو جو معنی پہنائے، وہ بہت مکروہ بھیانک تھے۔ ان کے اس پراگندہ ذہن میں اور بھی اضافہ ہو گیا لیکن در حقیقت اس بات کا فوری طور پر شک وشبہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ آریہ کس طرح کے لوگ تھے؟ اگر حقیقت میں تھے تو کس قوم اور علاقے سے ان کا تعلق تھا؟ انہوں نے مزید لکھتے ہوئے ایک اور

بات کی طرف اشارہ کر دیا ہے کہ آریوں کی ایک نمایاں خصوصیت تھی کہ یہ ایک مشترکہ زبانوں کا خاندان تھا۔ یعنی یہ لوگ بہت ساری زبانوں کو بولتے ہوئے بھی ایک ساتھ چل رہے تھے اور یہ واحد حقیقت ہے جو لوگوں کو ایک بڑے گروہ کو آریہ نام دینے کا جواز پیش کرتی ہے۔

یہ زبانیں براعظم یوریشیا میں پھیلتی چلی گئیں اور یہی سنسکرت، لاطینی، یونانی، کلاسیکی اور آریائی تھیں۔ لاطینی سے رومانی، اطالوی، فرانسیسی، اسپینی وغیرہ زبانوں کی جماعت جنوبی یورپ میں پیدا ہوئی۔ اس کے علاوہ ٹیوٹانی میں جرمن، انگریزی، سویڈش زبانیں اور سلاخی، روسی، پولستانی وغیرہ بھی آریائی لسانی جماعت کی ذیلی شاخیں تھیں۔ اس کا ثبوت انہوں نے یہ دیا ہے کہ ان تمام زبانوں میں بہت ساری مختلف اشیاء کے لیے استعمال ہونے والے الفاظ ان کا تقابل ان کی باہمی مشابہت کو ظاہر کرتا ہے۔ ان میں استعمال ہونے والے الفاظ کچھ مختلف ہیں۔ یورپ میں فنی، ہنگامی اور بیکانی زبانیں آریائی زبانوں سے تعلق نہیں رکھتیں جبکہ عبرانی اور عربی ممکن ہے کہ سمیرائی عہد تک کی قدیم ثقافتوں سے نکلی ہو لیکن وہ سامی ہیں، آریائی نہیں۔ ایک تیسری غیر آریائی لسانی جماعت چینی، منگولی ہے جس میں چینی، جاپانی، تبتی، منگولی اور دیگر بہت سی زبانیں شامل ہیں۔ یہ جماعت بھی تاریخی اور ثقافتی اعتبار سے اہم ترین ہے۔ اگر چہ ہندوستان کیلئے اس کی ایسی کوئی اہمیت نہیں۔ ہندوستانی آریائی زبانیں سنسکرت سے نکلی ہیں۔ اس طرح پیدا ہونے والی زبانوں میں ایک پالی زبان تھی جو ریاست مگدھ میں بولے جانے کی وجہ سے مگدھی کہلاتی تھی۔ کچھ دوسری زبانیں جو ہندوستان کے مختلف علاقوں میں بولی جاتی تھی، انہیں پراکرت کا نام دیا گیا۔ ان سے ہی جدید ہندی، پنجابی، بنگالی اور مراٹھی وغیرہ نکلیں لیکن ہندوستان میں بھی غیر آریائی اور ثقافتی لحاظ سے زبانوں کی ایک خاصی جماعت موجود تھی جن میں دراوڑی نسل کی زبانیں، تامل، تلگو، کنڑا، ملیالم اور تلگو وغیرہ شامل تھی جو ہمیں ہندوستانی زبانوں کی قدیم ابتدائی شکلوں کے بارے میں بتاتی ہیں۔ کسی زمانے میں ان زبانوں کو ملا کر آسٹرک (austric) جماعت قرار دیا جاتا تھا۔ اب بڑا سوال یہ ہے کہ زبانوں کی برادری یا زبانوں کی ایک جماعت کا

مشترک ماخذ کیا اس نتیجے پر پہنچنے کا صحیح جواز ہوسکتا ہے کہ ایک آریائی نسل یا قوم موجود تھی یا صرف ایک خالی نام ہی ہے۔ ہاں کچھ لوگ زمانہ قدیم میں اپنے آپ کو آریہ کہتے تھے۔

شہنشاہ دارا اول جس کی موت ۴۸۶ ق م میں ہوئی تھی، وہ اپنے آپ کو اخمینی، ہنما منیشی، رومانی (پارسہ) ابن ایرانی ایک آریہ نسل کا کہتا تھا جبکہ مقدس وید جو سب سے قدیم ہندوستانی دستاویزات ہے، جس میں لکھا ہے کہ آریہ ان دیوتاؤں کی تعظیم کرتے تھے۔ کچھ آریائی زبانیں بولنے والے اپنے آپ کو آریہ کہتے تھے۔ دارا کے فرزند رزقیس کی فوج میں آریائی دستے تھے جبکہ قدیم فارس میں سلطنت مد کے باشندے جو اہلِ فارس سے پہلے گزرے تھے، آریہ نام سے معروف تھے۔ ایران آریہ نام سے منسلک ہے جس کے معنی ہیں آریاؤں کا ملک، اگر چہ یونانی، ایرانی اور پنجاب کے ہندوستانی لوگ آریائی زبانیں بولتے تھے لیکن سکندر کے ہم عصر مورخین نے لفظ آریہ کو خاص نام کے قبیلوں کے لیے استعمال کیا ہے جو اس وقت دریائے سندھ کے دائیں کنارے پر آباد تھے جہاں ہم کو مسٹر کوسمبی نے لا کھڑا کیا ہے۔ اس ساری بحث سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ساری دنیا آریائی نسل سے تھی۔ ممکن ہے جس طرح انسانی نسل سے پوری دنیا آباد ہے اور ساری نسلِ انسانی کا باپ اور موجد اعلیٰ حضرت آدم علیہ سلام، تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ لفظ آریہ حضرت آدم سے نکلا ہے۔ ہمیں کون روک سکتا ہے۔

بہر حال ہم اس بحث کو آگے لے کر چلتے ہیں اور جناب غوری صاحب کے بیان پر نظر ڈالتے ہیں جو انھوں نے اپنی کتاب "پاک و ہند" میں تحریر کیا ہے کہ آریہ سنسکرت زبان کا لفظ ہے۔ رگ وید اور مانا داس میں اس کا اطلاق اس قوم پر ہوا ہے جو ماضی میں آریہ ورشہ کی آباد سمجھی جاتی تھی اور برہمنوں کے دیوتاؤں کی پرستار ہونے کی وجہ سے محترم بھی تھی مثلاً رگ وید کے جز اول میں دیوتا اندر جو آریہ بادشاہ تھا، سے خطاب میں تحریر ہے کہ اپنے پرستاروں کا سب سے بڑا مددگار تھا۔ مسٹر میکس جو ایک انگریز مورخ ہے، اپنی تحریر میں لکھتے ہیں کہ لفظ آریہ آرا سے مشتق ہے جس کے لفظی معنی بیل جوتنے یا زمین کاشت کرنے کے ہیں۔ غوری صاحب مزید لکھتے ہیں کہ

اب تک جو معلوم ہو چکا ہے، اس کا علم وہ رگ وید اور دیگر مذہبی کتب نے فراہم کیا ہے۔

حالانکہ ہندی کتابوں کو اگر دیکھا جائے تو ان میں آریہ کی آمد سے متعلق کوئی معلومات نہیں ملتیں۔ البتہ موجودہ دور کے ہندو مورخین نے یہ ثابت کرنے کی سرتوڑ کوشش کی ہے کہ آریاؤں کا اصل وطن کون سا تھا اور یہ کس علاقے یا سرزمین کے رہنے والے تھے۔ ان ہندی مورخین میں سے چند ایک کے نظریات کو ہم نے تحریر کیا ہے جس میں اناباش چندر بوس کے خیال کے مطابق آریاؤں کی اصل جائے پیدائش ہندوستان ہی تھا۔ وہ سپت سندھو یعنی وادیٔ سندھ کے علاقے مغربی پنجاب دریائے سندھ کے پار مغربی کناروں کے ساتھ پہاڑی سلسلہ کوہ سلیمان کے رہنے والے تھے۔ بال گنگا دھر تلک، جو ایک سیاسی راہنما ہونے کے ساتھ سنسکرت کا عالم بھی تھا، کا کہنا ہے کہ آریہ کا پہلا وطن شمالی مغربی پنجاب تھا۔۔۔ مشہور مورخ اور عالم بیڈن یا ویلی اپنی کتاب انڈین کمیونٹی میں تحریر کرتے ہیں کہ آریہ شمال مغربی دروں سے وادیٔ سندھ میں داخل ہوئے تو انہوں نے سب سے پہلے دریائے سندھ کے شمالی مغربی پہاڑی علاقوں میں قیام کیا۔ اس کے بعد آریہ نے دریائے سندھو (سندھ) کو پار کر کے کوہ ہمالیہ کے جنوبی میدانی علاقے جو دریائے سندھ کے سات دہانوں سے سیراب ہوتے تھے، وہاں سے داخل ہوئے۔ انہوں نے پہلی آبادی دریائے سندھ کے مشرقی کناروں کے ساتھ قائم کی ہوئی تھی۔ بیڈن مزید لکھتے ہیں کہ آریہ یہاں کچھ مدت رہنے کے بعد آہستہ آہستہ آگے بڑھتے رہے یہاں تک کہ ہڑپہ اور اس کے شمال مغرب میں کچھ فاصلے پر دراوڑی قوم نے ان کا راستہ روکا جس پر آریہ نے مقامی لوگوں کا قتل عام کیا۔ ہم ان مورخین کے نظریات کو مدنظر رکھتے ہوئے کسی نتیجے پر پہنچنے سے پہلے ایک بہت بڑے ابہام کا شکار ہوتے نظر آتے ہیں کہ جو نظریہ اے۔ ایل باشم نے پیش کیا، اس سے تو اشارہ سیدھا اسلامی تاریخ کی طرف جاتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کے چار بیٹے تھے جو کشتی میں سوار ہوئے، ان میں ایک کا نام شام بن نوح، دوسرے کا نام حام بن نوح، تیسرے کا نام یافث جبکہ چوتھا بیٹا کنعان تھا۔

شام بن نوح نے عرب، دوسرے نے یورپ، تیسرے نے ہندوستان اور چوتھے نے مشرق وسطی کو آباد کیا۔ ممکن ہے کہ باشم نے اسلامی نظریہ کو مدنظر رکھ کر بیان دیا ہو جس میں اسلامی نظریہ کائنات اور انسانی ارتقاء جبکہ ڈی ڈی کوسمبی نے بھی چاہیے ایک اور طریقے سے آریہ پر بحث کی ہے لیکن ان کے اصل معنی ایک ہی ہیں۔ انہوں نے صرف قوم کی جگہ زبان کا لفظ استعمال کیا ہے اور غوری صاحب نے بھی ان دو چار ہندی مورخین کے بیانات کو تحریر کر کے ان سے اتفاق کیا ہے۔ اصل میں بات ایک ہی ہے لیکن ہر مورخ نے اسے اپنے طریقے سے بیان کیا ہے۔ ایک دوسرے سے تھوڑا بہت بدل کر لیکن ہم اس بات کو صاف بیان کر دیں گے۔

ایک دوسرے ماہر آثارِ قدیمہ اور اسی محکمہ کے آفیسر انچارج ہڑپہ میوزیم حسن صاحب کے خیال کے مطابق جو انہوں نے روڑاں کے مقام پر راقم المعروف سے ملاقات کے دوران کہنا تھا کہ پوری وادیٔ سندھ کے وزٹ میں، شمال میں ٹیکسلا سے لے کر جنوب میں موہنجودڑ رو تک، کسی بھی مقام سے آریائی تہذیب کے نشانات نہیں ملے۔ اگر ملے ہیں تو ان کے تباہ کردہ ان مقامات کے نشان ہیں جو انہوں نے وادیٔ سندھ کے علاقوں میں کیے۔ ان کا مزید کہنا تھا کہ آریائی خود ہندوستانی قوم تھی جو شمالی مغربی پہاڑی علاقوں میں رہتی تھی اور تہذیب وادیٔ سندھ کی فن و ثقافت سے متاثر ہو کر ان سرسبز میدانوں میں داخل ہوئے۔ حسن صاحب کا مزید کہنا تھا کہ یہ بھی ممکن ہے یہ لوگ آریانہ یا ایران سے تعلق کی وجہ سے آریہ کہلاتے ہوں۔ پھر وہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ آریہ کون تھے اور کہاں سے آئے؟ کیا وہ مشرقِ وسطیٰ، ایران یا افغانستان کے رہنے والے تھے؟ یا پھر آریہ قبائل ہندوستانی تھے؟ ان تمام حالات و واقعات کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم کسی نتیجہ پر پہنچنے سے پہلے ایک الجھن سی محسوس کر رہے ہیں کہ آخر کار یہ لوگ کون تھے اور کہاں سے آئے؟

میں نے ان تمام مورخین کی رائے کو آپ کے گوش گزار کرنے کے لیے تحریر کیا ہے۔ میری ان تمام مورخین کے سامنے کوئی حیثیت نہیں ہے، میں ایک نا اہل آدمی ہوں لیکن ان لوگوں کے بیانات کو سامنے رکھتے ہوئے ہم کچھ گزارشات بیان کریں گے۔ گتھی کو سلجھانے کے لیے ہم نے

پوری کوشش کی ہے۔ سب سے پہلے ہم یہ عرض کرتے چلیں کہ آریہ کی اپنی کوئی تہذیب نہیں تھی۔ وہ ایک غیر تہذیب یافتہ قوم سے تعلق رکھتے تھے اور جب وادیٔ سندھ میں داخل ہوئے تو یہاں ان کے تہذیب یافتہ ہونے کا کوئی ثبوت نہیں ملا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ وہ ظالم، سفاک اور وحشی تھے۔ اگر ملے ہیں تو ان کی تباہی اور بربادی کے نشان ہی ملے ہیں۔ ان کے اصل وطن کے بارے میں ہم نے پوری کوشش کرنے کے بعد یہ نتیجہ نکالا ہے کہ یہ لوگ مشرقِ وسطیٰ کے رہنے والے نہیں تھے کیونکہ آریہ قبائل مشرقِ وسطی کے باسی ہوتے تو وہ ضرور پہلے افغانستان کو فتح کرتے، وہاں ان کو جنگیں لڑنا پڑتیں۔ اس علاقے پر مکمل کنٹرول کے بعد وہ آگے بڑھتے اور مشرق کی طرف پیش قدمی کرتے اور وادیٔ سندھ میں داخل ہوتے لیکن ایسا کوئی واقع پیش نہیں آیا۔ وہ نہ ہی مکمل طور پر ایران کے باشندے تھے۔ ہاں اگر یہ لوگ اہلِ فارس میں سے ہوتے تو پھر بھی ان کو بہت ساری مشکل پیش آتی اور دریائے سندھ کو پار کرنے تک اور ضرور ان کے ساتھ تہذیب وادی دجلہ فرات کے نشانات ملتے اگر یہ بھی نہیں معلوم یہ ایرانی تھے یا نہیں تو پھر ان کے بارے میں میری ایک رائے یہ بھی ہے کہ ممکن ہے یہ قبائل دریائے سندھ کے پار مغرب میں واقع پہاڑی سلسلہ کوہ سلیمان اور شمال میں وادیٔ سوات تک کے علاقوں میں پھیلے ہوئے تھے اور وہاں یہ لوگ خانہ بدوشی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ ان کا ذریعہ معاش صرف اور صرف مال مویشی پالنا تھا۔ اس کے علاوہ ان کے پاس کوئی روزی روٹی کے وسائل نہیں تھے۔

میرے اس بیان میں ایک ثبوت چاروں وید جو سنسکرت زبان میں لکھی گئیں اور یہ وید آریہ سے منسوب کی جاتی ہیں، ان کا مصنف پٹنی جو آریہ قوم کا ہی ایک فرد تھا، نے اپنے بارے میں لکھا ہے کہ وہ دریائے سندھ کے مغربی کنارے کے قریب واقع ایک علاقہ رندر کے ایک گاؤں سلاتر کا پیدائشی اور رہنے والا تھا تو اس ثبوت کے بعد اب بات واضح ہوگئی ہے کہ آریہ ضرور دریائے سندھ کے مغرب میں واقع پہاڑی سلسلہ کے رہنے والے تھے۔ ہاں یہ بھی ممکن ہے کہ ان میں ایک سے زیادہ قبائل شامل ہوں۔ یہ قبائل دو تہذیبوں کے درمیان ایک غیر تہذیب یافتہ خطے میں رہتے تھے

کیونکہ پہلے ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ وادئ سندھ کی تہذیب ہو یا میسو پوٹیمیا کی تہذیب یا پھر مصریہ، تمام تر تہذیبی ارتقا میدانی اور دریاؤں کے کنارے ہوا۔ وادئ سندھ کی تہذیب کی جائے جنم دریائے سندھ کے مشرقی زرخیز میدان تھے جبکہ میسو پوٹیمیا کی تہذیب کا ارتقائی مقام دریائے دجلہ وفرات کے ساتھ واقع میدانی پٹی اور کھیت تھے جبکہ تہذیبِ مصر جسے نینوا کی تہذیب کہا جاتا ہے، دریائے نیل کے قریبی علاقوں میں پھلی پھولی تھی۔ اس لیے آریہ دنیا کی قدیم ترین اور عظیم تہذیبوں کے درمیانی علاقوں میں رہنے کی وجہ سے ان لوگوں اور تہذیبوں سے متاثر ہوئے بغیر کیسے رہ سکتے تھے۔ ضرور انہوں نے ان دونوں تہذیبوں سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہوگی اور ممکن ہے کہ ان میں سے کچھ قبائل نے مغرب کا رخ کیا ہو اور ان علاقوں میں گھسنے کی کوشش کی ہو لیکن اس وقت میسو پوٹیمیا کی وادی میں ایک مضبوط اور مکمل بادشاہت اور سلطنت موجود تھی جہاں ان کے قدم ممکن ہے کہ نہ جم سکے۔ لیکن جب وہ دریائے سندھ کو پار کر کے وادئ سندھ کے علاقوں میں داخل ہوئے تو میسو پوٹیمیا کے مقابلے میں یہاں نہ کوئی خاص حکومت تھی اور نہ ہی مقامی قبائل اتنے طاقت ور تھے کہ ان کا راستہ روک سکتے۔ پھر بھی کافی حد تک مقامی قبائل جنہیں دراوڑی نسل کہا جاتا ہے، نے مقابلہ کیا، جنگیں بھی لڑیں اور اپنی دھرتی پر قربان ہو گئے۔

آریہ نے وادئ سندھ کی تمام سرزمین، میدانوں اور کھیتوں پر قبضہ کر لیا اور شمال سے جنوب تک پورے علاقے پر مکمل کنٹرول حاصل کرنے کے بعد سماجی زندگی کی شروعات کی جس میں ان کی باقاعدہ بادشاہت کے ثبوت بھی ملتے ہیں جو انہوں نے ہڑپہ اور موہنجوداڑو جیسے قدیم شہروں کو تباہ کرنے کے بعد قائم کی تھی۔ انہوں نے باقاعدہ حکمت عملی سے بادشاہت قائم کی۔ آریہ کا سب سے پہلا سربراہ ایک طاقتور آدمی رندر تھا جس کو یہ اپنا خدا اور دیوتا مانتے تھے اور اس کی پوجا کرتے تھے۔ اندر کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ ایک بہت ظالم اور سفاک آدمی تھا۔ اس کے پاس تقریباً پانچ ہزار لڑاکا فوج تھی جو آہنی اسلحہ سے لیس تھی۔ اندر نے وادئ سندھ کے علاقوں میں اس حد تک تباہی کی کہ کوئی بستی اور کوئی شہر ایسا نہ تھا جو اندر کی وحشیانہ حرکتوں سے محفوظ رہا ہو۔ تمام شہر، سرسبز

میدان اور کھیت بلکہ یہاں تک کہ پانی کے ندی نالے اور وہ بند جو مقامی لوگوں نے اپنے کھیت کو سیراب کرنے کے لیے بنائے تھے، تباہ کر دیے۔ آریہ بادشاہ اندر کی سب سے پہلی جنگی کاروائی جس کے متعلق قدیم تر تاریخی حوالہ جات ملتے ہیں اور جس کا ذکر رگ وید کے باب سے لیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ اندر نے وادیٔ سندھ کے علاقے میں پہلی جنگ چنیوٹ کے مقام پر لڑی جس میں اندر کی فوج کا مقابلہ ایک ایسی فوج سے ہوا جو عورتوں پر مشتمل تھی اور چوبدار لکڑی کے نیزہ نما ہتھیاروں سے مسلح تھی جبکہ اندر کی فوج تعداد میں زیادہ اور آہنی اسلحہ سے لیس تھی۔ اس لیے آریہ فوج نے مقامی لوگوں کو شکست دی، ان کا قتل عام کیا اور ان کے بادشاہ کو گرفتار کر لیا جسے بعد میں قتل کر دیا گیا۔ اس فتح کے بعد آریہ فوج آگے دریائے سندھ کے ساتھ ساتھ جنوب کی طرف پیش قدمی کر کے ہڑپہ اور موہنجوداڑو پر حملہ آور ہوئی اور وہاں بھی اس نے وحشت کے پہاڑ توڑ ڈالے۔

اب سوال یہ ہے کہ اس پوری بحث اور بیان بازی کے بعد کیا ہم کسی نتیجے پر پہنچ پائے ہیں یا نہیں؟ اس کا ایک سیدھا سا جواب ہے کہ آریہ ایک قوم تھی جس میں مختلف قبائل شامل تھے اور انہوں تقریباً دو ہزار سے اٹھارہ سو سال ق م کے دوران مغربی پہاڑی دروں کے راستے سے دریائے سندھ کو پار کیا اور مغربی ہندوستان دریائے سندھ کی وادی پر حملہ آور ہوئے جن کو بعد میں لفظ قوم آریہ سے منسوب کیا گیا ہے۔ یہ بھی معلوم نہیں کہ اس قوم کو آریہ نام کیوں اور کیسے دیا گیا یا پھر انگریز مورخین نے اس قوم کو آریہ کے نام سے مشہور کیا جیسا کہ "ہن" قوم چوتھی صدی عیسوی میں ہندوستان پر حملہ آور ہوئی اور یہاں ان کو گورے ہن کا نام دیا گیا جسے پوری امریکن، برٹش کو انگریز گورے یا ولائتی کا نام دیا گیا تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ تمام تر قبائل جو آریہ قوم میں شامل تھے اور ان کا سابقہ وطن ایرانی یا آریائی ملک کے قریب ہونے کی وجہ سے ان کو آریہ کہا گیا۔ ہندوستانی، پاکستانی، عربی اور یورپی قوم وغیرہ۔ لیکن جہاں تک لفظ آریہ کا مطلب یا معنی ہے تو اس کی تفصیل کچھ یوں ہے کہ آج سے تقریباً دو ہزار سال قبل مسیح لفظ آریہ کا کیا مطلب تھا اور یہ نام ان کو کیوں دیا گیا یہ کسی کو بھی معلوم نہیں۔ صرف قیاس آرائی کے طور پر لفظ آریہ کو بہت سارے معنی

دے دیے گئے۔ جیسا کہ لفظ آریہ کو انگریزی میں آرین جبکہ فارسی میں آئر، اس کے علاوہ بھی اس لفظ کے دوسری زبانوں میں کوئی اور معنی ہو سکتے ہیں۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ لفظ آریہ یا آئر اور ایران کا آپس میں ضرور کوئی گہرا تعلق ہے۔ یہ تینوں لفظوں کا واسطہ یا تعلق ایک ہی گرائمر سے ہے۔ اگر ہم اس حقیقت کو تسلیم کر لیتے ہیں کہ لفظ ایران اور آریہ ایک ہی زبان کے الفاظ ہیں تو پھر ہمیں یہ بھی ماننا پڑے گا کہ آریہ قوم کا اصل وطن یا جائے پیدائش سلطنتِ فارس، جو بعد میں ایران کے نام سے مشہور ہوئی، کے مشرقی سرحدی علاقے تھے۔ یا پھر اس قوم کو آریہ اس لیے پکارا گیا کہ جیسے سکندر کو یونانی اور اس کے بعد آنے والے یونانیوں کو باختری، کشانوں کو یوچی حالانکہ یوچی کوئی باقاعدہ قوم نہیں تھی، یہ بہت سارے قبائل پر مشتمل ایک گروپ تھا جس کو یوچی کہا گیا۔ اسی طرح اس گروپ کو بھی آریہ کہا گیا۔ ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مثال کے طور پر آریہ لوگ دراوڑی قبائل کی نسبت خوبصورت، گوری رنگت، لمبا قد اور جسمانی طور پر صحت مند جبکہ دوسری طرف وادئ سندھ کے مقامی لوگ کالے رنگ، چھوٹے قد، بدصورت چہرہ اور کمزور جسم رکھتے تھے تو ہو سکتا ہے کہ اس جسمانی برتری کی وجہ سے بھی ان کو آریہ پکارا گیا ہو اور یہ ممکن ہے کہ اس وقت ان علاقوں میں بولی جانے والی زبان لفظ آریہ کے معنی خوبصورت، اعلی، طاقتور ہو لیکن یہ بات زیادہ قابل بھروسہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ قبائل ایرانی سلطنت کے قریبی علاقوں کے باشندے ہونے کی وجہ سے آریہ کہلاتے ہوں جیسا کہ آئریہ یا آئر اور بعد میں یہ لفظ مختلف زبانوں میں تبدیل ہوتا ہوا لفظ آریہ مشہور ہوا۔

سنسکرت اور چاروں وید

آریہ کی فنی اور عملی زندگی کا کارنامہ صرف اور صرف وہ گرامر ہے جو سنسکرت زبان میں تھی اور ان کی چار مذہبی کتابیں رگ وید، سام وید، یجر وید اور اتھر وید اسی سنسکرت زبان میں تحریر کی گئی تھی جبکہ ان کا مصنف پنی آریہ میں سے ہی تھا جو کہ دریائے سندھ کے مغربی علاقے کا رہنے

والا تھا۔ رگ ویدان میں سب سے پہلے تحریر کی گئی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب آریہ وادیٔ سندھ میں جنگ وجدل میں مصروف تھے۔ تقریباً ۱۵۰۰ ق م کے لگ بھگ۔ اس لیے رگ وید میں آریہ کی وہ تمام نقل وحمل اور وادیٔ سندھ میں سیاسی وتاریخی سرگرمیاں تحریر ہیں جبکہ رگ وید میں اس علاقہ "تھل" کا پوری تفصیل کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے اور باقی تینوں وید بعد میں تحریر ہوئیں۔ ان میں زیادہ تر مذہبی نوعیت کی ہیں لیکن رگ وید میں اس علاقے کے تمام تر حالات وواقعات تحریر کیے گئے تھے جس میں ان مقامی قبائل جن کو دراوڑی کہا جاتا تھا۔ ان کے بارے میں بھی پوری تفصیل کے ساتھ ذکر آتا ہے کہ وہ کالے رنگ والے داس اور اشوا جن کو آریہ کالے ناگ بھی کہتے تھے، نے کس طرح ان کا راستہ روکا۔ رگ وید کے مصنف پٹنی کے مطابق دریائے سندھ اور جہلم کے درمیانی علاقہ میں ان کی سیکڑوں بستیاں موجود تھیں۔ رگ وید کے علاوہ سام وید وغیرہ تینوں میں زیادہ تر ان کے مذہب، عقائد اور دوسرے روزمرہ مصروفیات کے بارے میں تھی۔

آریہ کے مذہب سے متعلق مختصراً یہ معلوم ہوا ہے کہ ان کا مذہب ہندو تھا اور یہ لوگ بت پرست تھے۔ ان کا بادشاہ اندر کو آریہ اپنا خدا یعنی جنگ دہانی کا دیوتا مانتے تھے۔ یہ لوگ اندر دیوتا کو پوجتے تھے۔ یجر وید کی تحریر سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آریہ اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ کوئی واحد طاقت ضرور ہے جو پوری کائنات کو اور اس کے نظام کو چلا رہی ہے۔

آریہ اس بات پر بھی یقین رکھتے تھے کہ ہمارے دیوتا اس واحد طاقت کی طرف سے مقرر کیے ہوئے ہیں۔ رگ وید کے مذہب کے باب میں تحریر ہے کہ آریہ دن رات، چاند سورج، آگ اور پانی وغیرہ ان تمام ناموں کے دیوتاؤں کو پوجتے تھے۔ آریہ کے مذہب سے متعلق پوری آگاہی سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل میں ہندومت کے بانی خود آریہ تھے کیونکہ ہندوستان کی قدیم مذہبی تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ ہندومت کا بانی رام تھا جبکہ رام کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ آریہ کی نسل میں سے ہی تھا لیکن جہاں تک پٹنی، جس کو چاروں وید کا مصنف کہا گیا ہے اور ساتھ ہی سنسکرت کا موجد، اس کے متعلق مختلف آرا پائی جاتی ہیں۔ کبھی ان کو آریہ کا ہم عصر تو کبھی ان کو بہت

بعد میں چوتھی اور پانچویں صدی ق م کا مورخ پیش کیا جاتا ہے۔اس کی تفصیل آگے آئے گی۔ جہاں تک چاروں وید کا تعلق ہے، ان کے بارے میں کافی حد تک بیان کیا جا چکا ہے کہ یہ آریہ مذہب،سماجی زندگی، معاشی اصلاحات، ہندوستانی علاقوں پر حملے اور حکومتی ڈھانچے کی تکمیل سے متعلق تفصیلی ذکر پایا جاتا ہے۔لیکن یہ بات تو ضرور سمجھ میں آتی ہے کہ یہ چاروں وید آریہ سے وابستہ تحریر ہے۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ سنسکرت زبان کے بانی اور چاروں وید کے مصنف پٹنی خود آریہ کی آمد کے ساتھ ساتھ یہ وید تحریر کرتا ہے، یہ بات ابھی تک سمجھ میں نہیں آتی۔ ہاں ممکن ہے کہ پٹنی آریہ نسل کا باشندہ ہو اور آریہ کی آمد کے کچھ عرصہ بعد اس نے ان کی قدیم تحریروں کو نئے سرے سے ترتیب دیا ہو اور اس طرح یہ تمام تحریر چاروں وید میں تقسیم ہو گئی ہو۔ رگ وید، سام وید اور یجر وید، اتھر و وید۔ یہ نئی آنے والی تحریر پٹنی سے منسوب کر دی گئی یا تھی۔

آریہ کی آمد اور مقامی تہذیب

وادئ سندھ میں آریہ کی آمد اور مقامی قبائل کو شکست دینے کے بعد ان نو آبادکاروں نے پہلے پہل تو دریائے سندھ کی پوری وادی اور مشرقی میدانی خطہ جو دریائے سندھ اور جہلم کے درمیان واقع تھا، ایک باقاعدہ شہری اور سماجی زندگی کی شروعات کی۔ یہ علاقہ بعد میں "تھل" کے نام سے مشہور ہوا۔رگ وید اور ہندو مذہب کی دوسری تحریروں سے معلوم ہوا ہے کہ دریائے سندھ اور جہلم کے درمیان آریہ کے چھوٹے بڑے شہر آباد تھے۔ان میں ہر ایک کی آبادی پانچ ہزار نفوس پر مشتمل تھی جبکہ کچھ آبادی تو دس ہزار نفوس پر مشتمل بھی تھی۔اس کے بعد آریہ جنوب اور مشرق کی طرف بڑھتے چلے گئے اور ہڑپہ پر قبضہ کر کے کچھ عرصہ مقیم رہے۔اس کے بعد اس شہر کو برباد کر دیا اور مزید مشرقی ہند کی طرف پیش قدمی کی۔ یہاں تک کہ گنگا اور جمنا کے میدانوں تک پہنچ گئے۔ جبکہ جنوب میں موہنجوڈرو اور اس سے بھی آگے سمندر کے قریب پہنچ گئے۔ یہاں تک کہ اکثر ہندوستانی علاقوں میں آریہ کے قبضہ اور مکمل آبادکاری کے ایک ایسا شہری سماج وجود میں آیا جس

سے ہندوستان کا نقشہ ہی بدل گیا۔ اب ہندوستانی خانہ بدوشی کی زندگی سے نکل کر باقاعدہ ریاستی اور معاشی نظام کی طرف بڑھتے ہوئے نظر آتے ہیں جبکہ قبائل اور کثیر القومی معاشرہ وجود میں آتا ہے۔ دس ہزار ق م تک ہندوستان ایک سے زائد قومی اور ریاستی نظام میں تقسیم ہو چکا تھا جیسا کہ مشرقی ہندوستان میں۔ ایک سرسری مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ دریائے سندھ سے لے کر گنگا اور جمنا کے علاقوں تک سماجی اور مذہبی مسلک کی بنیاد رکھ دی گئی تھی۔

ساتویں صدی قبل مسیح تک ہندوستان میں روایتی اعتبار سے سولہ بڑے چھوٹے علاقے یا ریاستیں قائم ہو چکی تھیں۔ ان میں چودہ تو ایسی ریاستیں تھیں جنہوں نے باقاعدہ اقتدار کی اہمیت کو سمجھ رکھا تھا۔ مغرب سے مشرق تک علیحدہ علیحدہ ریاستوں کے حوالے ملتے ہیں جن میں کچھ تو ایک حاکم اعلیٰ کے تحت جبکہ ان میں سے کچھ ریاستیں ایسی تھیں جہاں آباد قبائل کے اپنے اپنے سردار اور راجے ہوتے تھے۔ اسی طرح شمالی مغربی ہندوستان میں بھی ایک سے زائد ریاستوں کی نشاندہی ملتی ہے جہاں مختلف قبائل کی موجودگی ظاہر ہوتی ہے۔ جیسا کہ شمالی پہاڑی سلسلہ کے علاقوں پر تکسیلا جو بعد میں ٹیکسلا کے نام سے مشہور ہوا۔ ٹیکسلا ۱۰۰۰ سے ۷۰۰ قبل مسیح کے دوران آباد ہو چکا تھا جس کی تصدیق سر جان مارشل نے بھی کی۔ ٹیکسلا کے جنوب مشرق کے علاقوں پر ایک کرو دیش نام کی ریاست جو مغربی پنجاب کے پہاڑی اور دامن کوہ سے واقع جنوب میں کھلے یا نیم صحرائی پٹی اور دریائی علاقوں پر پھیلی ہوئی تھی، جو کوہِ ہمالیہ کے دامن سے لے کر جنوب پنج ند یعنی پانچ دریاؤں کے سنگم تک کے علاقے پر مشتمل تھی۔ یہ وہی علاقے تھے جو بعد میں تھل کے نام سے مشہور ہوئے۔ ان ریاستوں کا حاکم ایک پریکشت نامی شخص تھا جس کا تعلق کرو قبائل سے بتایا جاتا ہے۔ اس بادشاہ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ۹ / ۸ ویں صدی قبل مسیح کے دوران اس ریاست کا حکمران تھا۔ قدیم ہندی مذہبی تحریر "مہا بھارت" کے ایک باب میں اس راجہ کے متعلق تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ مہا بھارت کی جنگ تقریباً ۸۵۰ ق م میں لڑی گئی تھی۔ یہ کرو یا کورو راجہ سندھو سپت یعنی وادیٔ سندھ کے تمام شمالی مغربی علاقوں کا حکمران تھا۔ ہندی مورخ بدھا پرکاش کا بیان ہے کہ

کورو کی پنجاب اور شمال مغرب پر مضبوط گرفت تھی۔ یاد رہے کہ کورو ایک باقاعدہ قوم تھی جبکہ کرو ان کے راجہ کی معرفت تھی جیسے بلوچ سردار، بگٹی سردار وغیرہ۔ کوروں نے شمال مغرب میں پنجاب سے لے کر اتر دیش الہٰ آباد تک کے علاقوں کو اپنے قبضہ میں کر لیا تھا۔

پرانہ جات جو قدیم ہندوستان کے حالات پر مبنی مذہبی اور تاریخی مسودے ہیں، ان میں کورو سے متعلق معلوم ہوا ہے کہ اس کرو راجہ یا کورو بادشاہ کے تین بیٹے تھے۔ پہلا پارکسپتا، دوسرا جہنو اور تیسرا سدھنوان۔ ان میں سے پارکسپتا ایک قابل اور طاقتور حکمران تھا جس کا ایک بیٹا جنم جایا تھا۔ دونوں نے مل کر شمال مغربی پہاڑوں کے علاقوں پر کورکشتر نام کی ایک ریاست قائم کی جس کا صدر مقام اسی ریاست میں واقع تھا، ممکن ہے کہ ٹیکسلا ہو۔ ان کی ریاست میں مغربی پنجاب دریائے سندھ کا مشرقی علاقہ موجودہ تھل اور جنوب میں دریائے جہلم اور چناب کے ساتھ ساتھ پھیلا ہوا تھا۔ سنسکرت کی کتاب اتھر وید کے باب میں ان فرمانرواؤں کے دور کی خوشحالی پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ پارکسپتا کے دور میں ملک بہت خوشحال تھا۔ ملک میں دودھ اور شہد کی اتنی فراوانی تھی کہ لوگ پانی کی جگہ دودھ اور شہد کا استعمال کرتے تھے۔ راجہ کا بیٹا جنم جایا بھی ایک جنگجو اور مشہور فاتح تھا۔ باپ کی موت کے بعد اس نے شمال کی طرف پیش قدمی کر کے ٹیکسلا پر قبضہ کر لیا اور اسے اپنا پایہ تخت بنایا۔ جنوب کے تمام میدانی اور صحرائی علاقے باقاعدہ ان کی ریاست میں شامل تھے لیکن اس وقت تک سندھ کی مشرقی میدانی پٹی دریائے جہلم تک کے علاقوں میں کافی ساری دوسری قومیں اور قبائل آباد تھے۔ ان میں سرفہرست ایک طاقتور قبیلہ جو "پورو" کے نام سے مشہور تھا، دریائے جہلم، چناب اور راوی تک کے علاقوں میں پھیلا ہوا تھا اور اس وقت ان علاقوں پر اپنی گرفت مضبوط کر رہا تھا۔ جب شاہ بھارت کے ساتھ ایک لڑائی میں جو تقریباً ۸۵۰ ق م دریائے راوی کے مشرقی کنارے پر لڑی گئی، جس کا ذکر رگ وید میں دس بادشاہوں کی لڑائی کے نام سے ملتا ہے۔ اس میں پورو کی قیادت پوروکس نے کی اور پورو کے اتحادی دس بادشاہوں کے اتحاد میں شامل ایک یادو تر، واشس، بھرگو، دروھیو، پکتا، بھلنا، الینا، شوا، دشنن اور انو قبائل شامل

تھے۔ اتحادی افواج نے سدوں کے بادشاہ رتسو بھارت یا واستھ کے ساتھ راوی کے کنارے جنگ لڑی اس جنگ میں اتحادی افواج کو شکست ہوئی۔

جب شاہِ بھارت کے دستوں نے دریائے سرسوتی کو عبور کر کے موسمِ برسات میں اتحادی افواج پر حملہ کیا جو دریائے راوی کے مشرقی کنارے کے ساتھ خیمہ زن تھے، اچانک حملے کو روکنے کے لیے اتحادی فوج نے جنگی حکمت عملی کے تحت دریائے راوی کے پانی کا رخ سدا فوج کی طرف موڑ دیا لیکن ہوا اس کے برعکس۔ پانی دشمن فوج کی بجائے اتحادی فوج کے کیمپ میں داخل ہو گیا اور پانی کی وجہ سے زمین دلدلی ہو گئی۔ ان کی رتھیں زمین میں دھنس گئیں اور شاہِ بھارت کی فوج کا حملہ روکنے میں کامیاب نہ ہو سکے جس کی وجہ سے اتحادی فوج کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اس جنگ میں پوروکس گرفتار یا قتل ہونے کے بعد شاہ بھارت کی افواج نے دریائے راوی کے مشرق کے تمام علاقے فتح کر لیے جو پہلے پورو بادشاہ کے قبضے میں تھے۔ اس شکست کے بعد پوروں نے مغرب کا رخ کیا اور دریائے راوی اور چناب کے دوآب میں اپنی حکومت قائم کی جبکہ دریائے جہلم اور سندھ کے علاقوں پر کورو قبائل ہی قابض تھے۔ ۸ ویں اور ۷ ویں صدی قبل مسیح میں جہلم اور چناب کے مشرق میں پورو قبائل جبکہ جہلم و سندھ کے درمیان شمال میں ٹیکسلا تک کورو قبائل حکمران تھے جبکہ قدیم روایتوں میں چھٹی صدی قبل مسیح کے دوران ان علاقوں میں پورو، کورو سلطنت کا وجود ملتا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ کورو پورو اتحاد کے تحت وجود میں آئی اگرچہ پرانوں کے تحریروں میں پنجاب سے متعلق کوئی خاص حالات نہیں ملتے مگر بدھ کے قدیم نسخوں میں ایک طاقتور ریاست گندھارا کا ذکر آیا ہے جس پر چھٹی صدی ق م میں ایک طاقتور بادشاہ پکوستی حکمران تھا جس کی سلطنت شمال میں ٹیکسلا سے لے کر دریائے سندھ کے مشرقی کناروں کے ساتھ ساتھ تمام میدانی علاقوں "تھل" کے جنوب میں ملتان جبکہ شمال مشرق میں کشمیر کی سرحد تک پھیلی ہوئی تھی۔

ایک یونانی مورخ ہیکاٹاٹس موجودہ ملتان کے بارے میں تحریر کرتے ہیں کہ کسپاپاور یاکش

یا پورا شہر یا علاقے کو ملتان سے جوڑا ہے ممکن ہے کہ اس نام کا کوئی علاقہ یا شہر ملتان نہیں بلکہ اس کے شمال میں دریائے جہلم چناب اور راوی کے سنگم کے اس پار کا کوئی شہر ہو سکتا ہے جو گندھارا سلطنت کا حصہ تھا۔ ایک خیال کے مطابق کشی یا پورا نام کی کوئی ریاست تھل کے اس زریں حصہ میں واقع ہو جہاں روڑاں کے کھنڈرات پائے جاتے ہیں اور ریاست پکوستی کورو بادشاہ کی باج گزار ہو کیونکہ یہ ٹیکسلا سے کافی دور دریائے سندھ کے زریں حصہ میں واقع تھی جبکہ ٹیکسلا گندھارا ریاست کا دارالحکومت تھا یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ چھٹی صدی ق م تک کورو بادشاہ کی ان علاقوں پر مضبوط گرفت تھی جو ٹیکسلا سے لے کر دریائے سندھ کے مشرقی ریگزاروں سے آگے ملتان تک پھیلی ہوئی تھی۔ ممکن ہے کہ آچمینی بادشاہ سائرس اعظم جس نے دریائے سندھ کو عبور کر کے چھٹی صدی قبل مسیح کے وسط میں ان علاقوں پر حملہ کیا اور اس وقت یہی کورو بادشاہ ان علاقوں پر حکمران تھا جس نے آچمینی شہنشاہ کے سامنے ہتھیار ڈال دیے تھے یا پھر ان دونوں کے درمیان کوئی امن معاہدہ طے پا گیا ہو اور کورو بادشاہ نے مصری بادشاہ کی اطاعت قبول کر لی ہو اور اس طرح "تھل" کے علاقے جو دریائے سندھ اور جہلم کے درمیان ٹیکسلا تک تقریباً سائرس اعظم کی عملداری میں آ گئے۔

یونانی بادشاہ: سائرس یا کورش اعظم۔ راجہ سوفیٹس:

ہم نے بڑی محنت اور اختصار کے ساتھ اس یونانی بادشاہ کے متعلق معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی ہے کہ اس بادشاہ کے بارے میں جو مغرب کی آچمینی سلطنت کا حکمران تھا اور چھٹی صدی قبل مسیح میں دریائے سندھ کو عبور کر کے ہندوستان پر حملہ آور ہوا، اس کے متعلق ایک سے زائد روایات پائی جاتی ہیں جن کے لیے ہم نے تحقیق کی کوشش کی ہے۔ بادشاہ کے بارے میں تاریخ میں رحمدل اور نرم مزاج امن اور اتحاد کا دعوے دار ظلم اور بربریت کے خلاف آواز بلند کرنے والا جیسے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ اس بادشاہ کے دو تین نام سامنے آئے ہیں۔ سائرس اعظم زیادہ تحریروں میں آیا ہے جبکہ دوسرا نام کورش اعظم۔ اس نام کو بھی مسٹر کو سمجھی کے علاوہ کچھ

دوسرے مورخین نے بھی تحریر کیا ہےاور تیسرا نام راجہ سوفیٹس جس کو بدھا پرکاش نے یونانی راجہ سو فیٹس کے نام سے تحریر کیا ہے۔ نام سے ہٹ کر ان میں ایک بات ضرور مشترک ہے، وہ یہ کہ ان کی ہندوستان آمد کی تاریخ سب نے ٦ ویں صدی قبل مسیح تحریر کی ہے۔ جبکہ اس کا دوسرا ثبوت یہ ہے کہ ان سب مورخین نے اس بادشاہ کے ہندوستان پر حملے کو کورو سلطنت کا زوال بتایا ہے کہ اس یونانی حملہ آور کے سامنے کس طرح کورو بادشاہ پکوستی نے ہتھیار ڈال دیے۔ ہم آگے بڑھنے سے پہلے کچھ اسلامی تاریخوں کے حوالے دیں گے جو ان یونان مصری بادشاہوں کے متعلق ملتے ہیں۔ ان میں تاریخ اسلام جس کے مصنف فروغ کاظمی ایک شیعہ عالم ہیں، اپنی تحریر میں بیان کرتے ہیں کہ جب حضرت ابراہیم علیہ سلام نے عراق سے شام کی طرف ہجرت کی تو اس وقت مصر پر طولیس نام کا بادشاہ حاکم اعلیٰ تھا۔

جب حضرت یوسف کو ۱۹۷۴ ق م میں مصر میں قید کیا گیا، اس وقت مصر کا بادشاہ ریان عرف عزیز مصر تھا۔ اسی بادشاہ کا پوتا ولید بن مصعب حضرت موسی کے زمانے میں مصر کا بادشاہ تھا۔ یہ ۱۵۷۴ ق م کا ہے۔ جب حضرت موسیٰ مصر سے ہجرت کر کے بیت المقدس کی طرف روانہ ہوئے تو وہاں ہامان اور فاروق بادشاہ تھے اور حضرت الیاس کے زمانے میں اجینا نام کا بادشاہ شام میں جبکہ مصر میں نکوہ نام کا بادشاہ تھا۔ بخت نصر بابل کا بادشاہ تھا جس نے بیت المقدس پر حملہ کیا اور بنی اسرائیل کا قتل عام کیا۔ براعظم ایشیاء (مشرق وسطیٰ) کی تاریخ کا اہم واقعہ آچمینی سلطنت کا قیام ہے۔ ساتویں صدی ق م میں آشوری بادشاہ تلگا تھ پلیسر سوم نے قتل و غارت اور دہشت گردی کے باعث مغربی ایشیاء کے لوگوں کو سخت خوف و ہراس اور پریشان کن حالات سے دو چار کر رکھا تھا۔ ممکن ہے کہ یہ آشوری بادشاہ بخت نصر یا اس کی اولاد میں سے کوئی دوسرا شخص تھا جن کو اسلامی تاریخ میں کسدی کہا گیا ہے۔ ظلم اور لوٹ مار انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ جنگلی خطہ کے خانہ بدوشوں کی لوٹ مار سے عوام کا جینا محال ہو چکا تھا تو ان پریشان کن حالات میں ایک رحم دل اور نرم مزاج رکھنے والا انسان نمودار ہوا۔ اس بادشاہ کے متعلق اسلامی تاریخ اور تفسیر القرآن میں کوئی تصدیق

نہیں ملتی۔ یہ آشوری، آچمینی، یہ سب یورپی مورخین کے دیے ہوئے نام ہیں کیونکہ تفسیر قرآن اور اسلامی تاریخ میں کسی ایسے رحمدل بادشاہ کا ذکر نہیں ہے ماسوائے حضرت سلیمانؑ کے۔ بہرحال جو کچھ تاریخ کی کتابوں میں تحریر تھا ہم نے اس پر استفادہ کیا ہے۔ آچمینی شہنشاہ سائرس نے چھٹی صدی قبل مسیح کے شروع میں تلگا تھ پلیسر کے خلاف آواز اٹھائی تو ان تمام پریشان حال لوگوں نے ان کے ساتھ امن اور اتحاد کا وعدہ کیا جس میں تمام صوبوں کی رعایا نے سائرس اعظم کا خیر مقدم کیا اور ان کو نجات دہندہ کے طور پر گلے لگایا اور ان کا ساتھ بھی دیا جس سے سائرس نے آشوری بادشاہ تلگا تھ کا تختہ الٹ دیا اور ایشیاء کوچک تک تمام ریاستوں کے ساتھ اچھے تعلق پیدا کر لیے۔ چھٹی صدی قبل مسیح کے وسط میں سائرس نے اپنی سلطنت کے مشرقی صوبے جن میں ایران کا تمام علاقہ شامل تھا، پر مکمل کنٹرول حاصل کرنے بعد دریائے سندھ کو عبور کر کے وادیٔ سندھ کے ان زیریں حصے پر قابض ہو گیا جو آج کل تھل کے نام سے مشہور ہے۔ دریائے سندھ کی مشرقی میدانی پٹی جو دریائے جہلم تک پھیلی ہوئی تھی، پر قدم جمانے شروع کیے جو آہستہ آہستہ کوہ ہمالیہ ٹیکسلا سے لے کر جنوب میں دریائے سندھ اور جہلم کے سنگم تک کے تمام علاقے کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ سائرس اعظم نے دریائے سندھ کس مقام سے عبور کیا۔ اس کے بارے میں کوئی واضح ثبوت تو نہیں ملا مگر خیال یہ ہے کہ اس مصری بادشاہ نے ایران سے سیدھا مشرق کی طرف پیش قدمی شروع کی۔ وہ بلوچستان سے ہوتا ہوا ڈیرہ غازی خان سے اوپر کسی مقام سے دریا عبور کیا ہو گا۔ کیونکہ اس مغربی حملہ آور کے متعلق صرف اتنا معلوم ہے کہ سائرس اعظم نے دریائے سندھ اور جہلم کو اپنا مرکز بنایا جہاں پہلے ایک کورو بادشاہ پکوستی مغربی ہندوستان پر حکمران تھا۔ کورو بادشاہ پکوستی نے پہلے پہل اس مصری بادشاہ کے ساتھ دوستانہ مراسم قائم کر لیے اور بعد میں ہندی بادشاہ نے مصری بادشاہ کی اطاعت قبول کر لی۔ لیکن ان دونوں بادشاہوں کے درمیان اس وقت اختلاف پیدا ہو گیا جب اس مصری بادشاہ نے ہندوستانیوں کے ساتھ رحمدلی اور حد سے زیادہ نرمی اختیار کی۔

اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ بہت ہی رحم دل، عادل اور اپنی رعایہ کے ساتھ بڑی نرم گوشی سے پیش آتا تھا۔ اس پیار کے رشتے نے ان کے لیے ہندوستانیوں میں جذبہ پیدا ہوا اور اسے ایک دیوتا کے طور پر ماننا شروع کر دیا۔ جبکہ اس کے علاوہ سائرس اعظم ہندوؤں کے بادشاہ کے نام سے بھی مشہور رہوا۔ ممکن ہے کہ سائرس ہی وہ بادشاہ تھا جس کو ڈی ڈی کوسمبھی نے کورش اعظم کے نام سے مشہور کیا۔ مسٹر کوسبھی نے اپنی کتاب قدیم ہندوستان باب نمبر ۶ صفحہ ۱۸۰ پر تحریر کرتے ہیں کہ سیاہ روغن والے برتنوں کا زمانہ چھٹی صدی ق م ش۔س۔ر (NBP) کا دور یہ سیاہ روغنی برتن جن کا تعلق ماہر آثارِ قدیمہ یونانی تہذیب سے جوڑتے ہیں۔ مورخ کے مطابق یہ مٹی کے برتن تقریباً چھٹی صدی ق م میں ہندوستانی علاقوں میں نمودار ہوئے۔ جبکہ سائرس کی آمد ہندوستان میں تقریباً چھٹی صدی قبل مسیح ہے۔ تو معلوم ہوا کہ اس تہذیب کو ہندوستان میں سائرس اعظم نے متعارف کروایا۔ اس کے علاوہ اس عظیم بادشاہ نے ہندوستانیوں کے لیے اور بھی بہت نئے طور طریقے جن میں پڑھنے لکھنے کا رواج، کاشتکاری اور جدید برتن سازی اور مذہبی رسومات کا نیا طریقہ شامل تھا۔

ان سب میں سے جو اہم بات تھی وہ ایک تو کاشتکاری اور دوسرا بتوں کی پوجہ کیونکہ ممکن ہے کہ سائرس کا تعلق بھی مصر کے فرعون گروپ سے ہو اور خود کو خدا کا لقب دیتا ہو۔ بہر حال یہ بات ابھی تک میری تحقیق سے باہر ہے کہ سائرس اعظم کا تعلق مصر، یونان کے کس گروپ یا خاندان سے تھا۔ کیونکہ ہم مغربی ہندوستان کی قدیم تاریخ پر کام کر رہے ہیں اس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ اس طرح آچمینی بادشاہ نے دریائے سندھ اور جہلم کے درمیانی خطہ کو اپنا مرکز بنایا۔ اسی بادشاہ کے دور میں آچمینی ایرانی قبائل کی ایک بڑی تعداد نے دریائے سندھ کے مشرقی کنارے "تھل" میں رہائش اختیار کی۔ ایک عرصہ تک ٹیکسلا میں آچمینی ایرانیوں کی بڑی تعداد رہائش پذیر تھی۔ اس وقت مغربی ہند میں ٹیکسلا کو ایک مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ ساتھ ہی ایک اور نام یونانی راجہ سوفیٹس بھی چھٹی صدی ق م کے وسط میں ہندوستان آیا۔

ہندوستانی مورخ بدھا پرکاش کے بیان کے مطابق ایرانی آچمینی لوگوں کی دعوت یونانی راجہ سوفیٹس ہندوستان میں داخل ہوا۔ ان کی سلطنت کا مرکز پہلے تو دریائے سندھ اور جہلم تھا لیکن کچھ عرصہ کے بعد انہوں نے اپنی سلطنت کو وسعت دے کر دریائے راوی تک بڑھا دیا تھا۔ اس یونانی راجہ کی آمد بھی چھٹی صدی ق م میں ہوئی جبکہ ایرانی شہنشاہ دارا کی فوج جس کی کمان جنرل رستم کر رہا تھا تقریباً ۵۲۱ ق م میں مغربی پنجاب پر حملہ کر کے قابض ہو گیا تھا جو ایک عرصہ تک دریائے سندھ کے مشرقی میدانوں "تھل" اور شمال میں ٹیکسلا تک کا علاقہ دارا کی حکومت میں شامل تھا۔ اس وقت دارا کی سلطنت کا ۲۰ ویں صوبہ تھا "تھل"۔

مغربی پنجاب اس طرح ایک ہی صدی میں تین چار مغربی حملہ آوروں کا ہندوستان میں ایک فرق ضرور ہوگا۔ بہرحال تھل کا علاقہ ایک عرصہ تک آچمینی اور ایرانی لوگوں کی آماجگاہ بنا رہا۔ یہاں تک کہ ان کے مقامی لوگوں کے ساتھ رشتہ ازدواج بھی طے ہو گئے اور یہ رشتے شکل و صورت کی بنا پر ہوتے تھے نا کہ دولت و جہیز کی وجہ سے۔ سڑابو کے بیان کے مطابق خوبصورت اور صحت مند بچوں کے درمیان رشتے ہوتے تھے۔ سڑابو اس وقت کے ازدواجی رسم و رواج تحریر کرتے ہیں کہ جو بچہ پیدا ہوتا تھا اس کا ایک ڈاکٹر معائنہ کرتا تھا۔ اگر بچہ جسمانی طور پر فٹ اور صحت مند ہوتا تو اس کو جینے کا حق دیا جاتا اور اگر اعصابی طور پر وہ بچہ کمزور ہوتا تو اسے حکام کی منظوری سے قتل کر دیا جاتا تھا۔

اس باب میں ہم نے چھٹی صدی ق م کا ذکر کیا ہے مورخین کے بیانات اور تاریخی حوالہ جات کی بدولت مغربی ہندوستان کے اس حصہ "تھل" میں ایک سے زائد حملہ آوروں اور حکمرانوں کا نام آتا ہے۔

ان میں سائرس اعظم دوسرا کورش اعظم اور تیسرا راجہ سوفیٹس جبکہ چھٹی صدی قبل مسیح کے آخر میں ایران کے دارا گشتاسپ اور ان کے جنرل رستم جو ایک عرصہ تک مغربی پنجاب کے علاقہ "تھل" پر قابض رہا۔ باقی تینوں حکمرانوں کے بارے کوئی خاص معلومات نہیں ملتی ہیں۔

مغربی پنجاب کے قبائل

جنوبی ایشیاء میں ایرانی شہنشاہ دارا کی شکست کے بعد جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ یونانی اتھنیز ین لوگوں کی طرح ہندوستانی قبائل نے بھی متحد ہو کر دارا کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور خود مختاری کا اعلان کر دیا جو پہلے بیان کے مطابق پانچویں صدی ق م کے وسط میں ایرانی تسلط کے خاتمے کے بعد مغربی پنجاب بڑھتے ہوئے عدم استحکام اور الجھن کا شکار ہوتا چلا گیا جس کے نتیجے میں ایک نیا سیاسی نظام برآمد ہوا۔ کیونکہ ایرانی حملہ کے وقت سے ہی بہت سارے ایسے جنگجو قبائل پنجاب میں داخل ہوئے جو اصل میں دارا کے مخالف اور دشمن تھے۔ ان قبائل میں جارتا، ابھیرا، بلیسکا اور واہی شامل تھے۔ مہا بھارت کے باب دیوگا پروان کی تحریر کے حوالہ سے بدھا پرکاش نے بیان کیا ہے کہ یہ وحشی قبیلے کمانوں، نیزوں اور ڈھالوں سے مسلح تھے انہوں نے مقامی لوگوں کے ساتھ قریبی تعلق اور رشتہ ازدواج تک قائم کر لیے۔ ان قبائل کا پہلا پڑاؤ دریائے سندھ اور جہلم کا درمیانی خطہ تھل تھا لیکن بعد میں یہ لوگ مشرقی پنجاب اور ہندوستان میں پھیل گئے۔ پنجاب میں غیر ملکی قبائل جو جنگی فنون سے اگاہ تھے ان مسلح گروپوں کی لوٹ مار سے علاقہ کا سماجی ڈھانچہ بالکل تبدیل ہوتا چلا گیا۔ ان غیر ملکیوں کے ساتھ ساتھ پنجاب کے مقامی لوگوں میں بھی ایک جنگجو طبقہ پیدا ہو گیا جس میں وارت، کول، گان، سرینی، اور گراما جیسے قبائل اور تنظیمیں شامل تھیں۔ ان میں ایک نہایت قدیم قبیلہ "پگ" بھی شامل تھا جبکہ ورتوں کو خاص کر جنگ و جدل کرنے والہ جتھا کہا جاتا تھا۔ ان کو سرخ اور سیاہ لباس کی وجہ سے شناخت کیا جاتا تھا۔ ان جتھوں، قبیلوں اور تنظیموں میں جنگجو عنصر غالب تھا۔ جبکہ لڑاکا فوج اور مذہبی پروہتوں میں تمیز کرنا بہت مشکل تھا۔ مہا بھارت کے ایک باب کرن پروان میں انہیں راجیہ جاکا کہا گیا ہے اور رگ وید میں پنی نے انہیں کتریا جاکا کے نام سے پکارا ہے۔

آریہ ان کو خود مختیار لوگ کہتے جبکہ انگریز مورخ جٹسن انہیں چور کہتا ہے۔ یہ لوگ دریائے سندھ سے لے کر دریائے راوی تک پھیلے ہوئے تھے۔ یہ لوگ جنگجو یا مذہبی رنگ اختیار کرنے میں

آزاد تھے۔ان میں بعض دودھ پیتے اور سور، مرغی، گائے، گدھے، اونٹ اور بھیڑ کا گوشت کھاتے تھے۔قدیم لوگوں کی طرح یہ بھی لہسن، پیاز، شراب اور آم کا استعمال کرتے تھے۔ان کی باغیانہ روش آزاد فطرت گروہ بندی شاہی نظام کی مخالفت اور سیاسی استحکام اور اختیارات کی مرکزیت سے انکار ہی کی وجہ سے تاریخی حوالوں میں ارسترک یعنی جس طرح ان کو مقامی زبان پراکرت، ارات یا جدید لغت میں ''ارودھ'' کہا گیا ہے، جس کے معنی ہیں بے وطن لوگ یا چور لٹیرے۔انہی وجوہات کی بنیاد پر ان قبائل نے بہت جلدی ایرانی شہنشاہت سے آزادی حاصل کر لی اور بہت عرصہ تک مختلف گروپ کی صورت میں آزادانہ طرز کی زندگی بسر کرتے رہے۔ان میں کچھ حد تک قبائلی نما ریاستی اکائیاں موجود تھیں جن کو جنا پد کہا گیا ہے، چھوٹی ریاست یا مقامی حکومت۔ان میں ایک گلا کنوئی نام کی ریاست بھی تھی جو دریائے چناب اور راوی کے درمیان قائم تھی جبکہ سلطنت گندھارا دو حصوں میں تقسیم تھی جس میں ایک کا پایہء تخت پشکلا دتی موجودہ چارسدہ کے قریب بخولی کے مقام پر اور دوسرا ٹیکسلا تھا۔مغربی گندھارا پر ہستنا یان اور جنوب مشرقی گندھارا پر امبھ خاندان کا ایک فرد راجہ امبھی حکمران تھا۔جبکہ گندھارا کے جنوب کا وسیع میدانی خطہ موجودہ تھل جسے ''وہیکا'' کہا گیا، پر ایک دوسرا قبیلہ یودھا جیو سمگھا پھیلا ہوا تھا۔ایودھا قبائل کے متعلق جو اس میدانی علاقے میں حکمران تھا اور دریائے سندھ اور جہلم کے درمیان واقع تھا، ایک اہم ثبوت جوروڑاں کے مقام سائیڈ ''اے'' سے ملنے والے سکے ہیں جن پر اس قبیلہ کا کا نام تحریر تھا۔یہ اس بات کی نشانی تھی کہ کسی واحد شخص کی بجائے پورے خاندان کے افراد شامل ہوتے تھے۔

روڑاں کے مقام سے یودھا قبائل کے سکوں کا ملنا اس بات کی نشان دہی ہے کہ واقعی ایک وہیکا نام کی ریاست اس قبیلے کے قبضہ میں تھی۔ یہ لوگ جنگجو خصلت کے مالک تھے اور یہ ذات پات کے بغیر ایک قبائلی طرز کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ یہ ایک جگہ سے دوسری جگہ نقل مکانی بھی کرتے رہتے تھے۔جیسا کہ انہوں نے چوتھی صدی قبل مسیح کے اول میں ریاست وہیکا (موجودہ تھل) سے اس وقت نقل مکانی کی جب ان پر رومی فوج نے حملہ کیا، ان کے شہروں کو برباد کر دیا

اور خاندان کے اکثر افراد کو قتل کر دیا۔ سکندر کے بعد راجہ چندر گپت کی فتوحات سے متاثر ہو کر اس علاقے سے نقل مکانی کر کے جنوب مشرق کی طرف دریائے ستلج اور راوی کی وادی میں چلے گئے۔ یودھا کے علاوہ اس میدانی خطہ میں اور بھی کافی خاندان آباد تھے جو ممکن ہے یودھا کے اتحادی ہوں۔ مہا بھارت کے حوالوں سے معلوم ہوا ہے کہ ان میں برہمن گروپ پالوہ اور وتادھن جبکہ ان میں کھشتریوں کے ایک گروپ راجنی کا ذکر بھی ملتا ہے۔ ایک دوسرا قبیلہ جو شودر کے نام سے مشہور تھا، کے بارے میں قدیم ہندی تحریروں سے معلوم ہوا ہے کہ یہ قبیلہ بھی دریائے سندھ کی وادی میں مقیم تھا۔ مشہور ہے کہ یہ لوگ اسلحہ کا کاروبار کرتے تھے۔ انہیں وات ستروپ جیونی کہا گیا ہے جبکہ ان میں سے کچھ لوگ جنگوں اور لڑائی کو پیشے کے طور پر اختیار کرتے تھے۔ پنینی ان کو ابراھمنک اور جناپد کے نام سے بیان کرتا ہے جو بظاہر سودارائیوں کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ سودارائی وہ لوگ تھے جنہوں نے سندھ میں سکندر رومی کے خلاف سخت مزاحمت کی تھی۔ یونانی تاریخ دان گندھارا کے جنوبی علاقہ تھل کے کسی مقام پر برہمنوں کے ایک شہر کا ذکر کرتے ہیں جس کا نام انہوں نے "اناڑی" بیان کیا ہے جبکہ پنینی نے راجنوں کا علاقے یودھا جیوی سمگھا کا ذکر کیا ہے جو غالباً کہیں جنوب کے میدانی علاقوں میں واقع تھا۔ بدھا پرکاش کے بیان سے مجھے اس بات پر اختلاف ہے کہ انہوں نے پنینی، جو سنسکرت کا مصنف تھا، کو ایسے بیانات سے جوڑا ہے جو بہت بعد کے ہیں۔ پنینی کے متعلق ہم پہلے تحریر کر چکے ہیں کہ انہوں نے چاروں وید تحریر کیے تھے جو ۱۵ویں صدی قبل مسیح سے لے کر ۱۰ویں صدی قبل مسیح کے دوران تحریر ہوئے جبکہ بدھا پرکاش پنینی کو ۴ویں صدی قبل مسیح تک کے واقعات سے ان کا تعلق بتاتا ہے۔ ہم اس پر بحث کرنے کی بجائے اپنے مدعا کی طرف آتے ہیں کہ ان تمام حالات و واقعات سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ تمام گروپ کورو سلطنت اور آچمینی و ایرانی اقتدار کے خاتمے کے بعد کی غیر یقینی صورت حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے خود مختیار ہو گئے تھے۔ انہوں نے مسلح گروپ بھی تشکیل دیے تھے اور اپنی حفاظت کے لیے اپنے آپ کو فوجی انداز میں منظم کر لیا۔ پنجاب میں اکثر قبائل اپنے آپ کو جنگجو

گروپوں میں پیشہ اور ذریعہ معاش سمجھ کر شمولیت اختیار کرتے تھے۔ دراصل ان قبائل کی مشترکہ فوجی تحریک ایک قبائلی سماجی ڈھانچے کا باعث بنی اور اسی اصطلاح اور برابری کا ایک ثبوت یودھا جیوی سمگھا تھی اور جنہوں نے گندھارا کے جنوبی میدانی علاقہ تھل میں ریاست وہیک قائم کر رکھی تھی۔ وادیٔ سندھ کے ان وسیع و عریض میدانوں میں ایودھا جیوی اتحاد کے علاوہ کچھ دوسرے لوگ بھی آباد تھے جن میں کشودرک اور مالوے شامل ہیں۔ یہ لوگ پنجاب کے ایک بڑے قبیلے مدر کے جانشین تھے۔ بدھا پرکاش کے بیان کے مطابق جو انہوں نے پنی باب ۲-۱۰۸-۶ = ۳-۱۳-۷ کے حوالے سے تحریر کیا ہے کہ مدر قبیلہ دو حصوں میں تقسیم تھا۔ ایک اپرا مدر جبکہ دوسرا پروا مدر۔ اپرا مدر چناب اور جہلم کے درمیانی علاقہ ضلع گجرات میں مقیم تھا جبکہ دوسرا قبیلہ پروا مدر چناب اور راوی کے درمیان گوجرانوالہ اور سیالکوٹ کے علاقوں میں پھیلا ہوا تھا۔ ان کا مرکزی شہر جس کا نام مسکالا بتایا گیا ہے۔ یہ دریائے ایگا کے کنارے آباد تھا۔

یہ دریا نارووال اور سیالکوٹ کے قریب سے گزرتا تھا جو موجودہ فیصل آباد اور جھنگ کے مشرق سے ہوتا ہوا شورکوٹ سے تقریباً چار پانچ کلومیٹر جنوب میں دریائے چناب میں شامل ہو جاتا تھا۔ ان مدر قبیلے کے دہی طبقے کو مالا کے نام سے جانا جاتا تھا کیونکہ اس وقت تک ان علاقوں میں پراکرت زبان کو ثانوی حیثیت مل گئی تھی۔ اس لیے ان کی ایک شاخ بھدر بھلہ کے نام سے مشہور ہوئی۔ ان تمام مدروں نے اسی دوران سلوؤں کے ساتھ رہنا شروع کر دیا۔ مہابھارت کے حوالے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مدری شہزادی ملاوی کا سلوؤں قبیلے کے ایک شہزادے ستیاون کے ساتھ شادی ہوگئی تھی۔ جس کی اولاد بعد میں "مالوے" مشہور ہوئی۔ یہ صورت حال چوتھی صدی قبل مسیح تک رہی۔ آخر میں سکندر کے حملے کے وقت ہی مالوے گندھارا کے جنوب میں آباد تھے۔ ان کا اصل مقام ملتان سے لے کر بہاول پور تک کا علاقہ تھا۔ ان کے ساتھ ایک دوسرا قبیلہ کوشدرک بھی انہیں علاقوں میں آباد تھا جنہوں نے مل کر سکندر کا مقابلہ کیا جبکہ شمال کے پہاڑی سلسلہ یعنی شمالی گندھارا کے علاقوں میں ایک قبیلہ اومبھس آباد تھا۔ آچمینی سلطنت کے خاتمے کے

بعد پنجاب میں بڑھتی ہوئی آبادی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ مغربی مورخ سٹرابو نے دریائے راوی سے چناب اور جہلم تک جبکہ دریائے جہلم سے سندھ تک ۵۰۰ آباد شہروں کے متعلق بتایا ہے۔ ایک اور بیان جو پٹنی کے نام سے منسوب کیا گیا ہے۔ ان کے مطابق مغربی پنجاب کے ان میدانی علاقوں میں ۵۰۷ شہر اور قصبے آباد تھے اور ان میں کچھ شہر تو ۱۰ ہزار کی آبادی سے اوپر تھے۔ ان میں بعض قبائلی نما ریاستی اکائیاں موجود تھیں جنہیں جنا پد کہا گیا ہے۔ جھنگ شہر کے شمال میں واقع نیم پہاڑی سلسلہ کے علاقوں پر ایک اور اہم قبیلہ پورو آباد تھا جس کو پاؤروا بھی کہتے تھے۔ یہ کئی نام جو پورو قبیلے کو دیے گئے یعنی پاؤروا، پاورس، یا پورس اصل میں ایک ہی نام ہے۔

مہابھارت کے کئی مقامات پر پاؤرس کو پاؤروا کے مترادف قرار دیا گیا ہے۔ مسٹر بوہلن کے خیال کے مطابق پورس اور پاؤرس ایک لفظ ہے جبکہ قدیم ہندوستانی تحریروں اور ویدوں میں یہ دونوں نام لفظ "پورو" سے نکلے ہیں۔ اس کا مخرج ہند ایرانی لفظ پوروہی ہے۔ رگ وید کے باب (۱-۳-۶-۱) کے پیرے میں سیان نے پورو کو کئی یا متعدد کے معنوں میں بیان کیا ہے۔ پورو ایک طرح سے پاؤروں کا جدِ امجد سمجھا جاتا ہے۔ رگ وید میں دس بادشاہوں کی لڑائی میں پورو قبائل کے سردار پوروکس کا ذکر آیا ہے جس نے اتحادی افواج کئی سربراہ کی حیثیت سے اس جنگ میں شمولیت اختیار کی۔ اس جنگ میں پوروکس کو شکست ہوئی اور وہ پنجاب میں اپنی قوت کمزور کر بیٹھے۔ ہم پہلے باب میں بیان کر چکے ہیں کہ شکست کے بعد پورو بادشاہ سموارانہ نے کورو پورو اتحاد کر کے دریائے چناب کے اس پار جہلم کے دونوں طرف اپنی کھوئی طاقت دوبارہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے اور ان علاقوں پر اپنی حکومت قائم کر لی جو ریاست کورکشتر کے نام سے مشہور ہوئی۔ کور ریاست میں مغربی پنجاب کے تمام علاقے دریائے سندھ تک شامل تھے جس کو قدیم ہندی روایتوں میں اترکورو کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ یہ وسیع سلطنت اتر پردیش سے لے کر مغرب میں پنجاب کے تمام علاقے اس میں شامل تھے۔ اس کا سربراہ سمورانہ کا بیٹا تھا جو کوروسوانا

نام سے جانا جاتا تھا۔اس عظیم بادشاہ نے اپنی سلطنت کو پراگ (موجودہ الہٰ آباد) تک وسعت دے دی۔ چوتھی صدی قبل مسیح کے آخر نصف تک ہمیں کورو کشتر یا اتر کورو سلطنت کئی حصوں میں بٹی ہوئی نظر آتی ہے۔شمال مغرب میں گندھارا کے مرکز ٹیکسلا پر ایک دوسرے خاندان امبھس کا راجہ امبھی حکمران تھا جبکہ جنوب کے تمام میدانی علاقے تھل پر ایودھاجیوی اور کچھ دوسری اقوام کے لوگ قابض تھے جسے ریاست ''وہیک'' کا نام دیا گیا ہے۔

ٹیکسلا کے جنوب مشرق میں کوہستان نمک کے نیم پہاڑی سلسلہ،سرگودھا اور چکوال کے علاقوں پر راجہ سو بھاتی کی حکومت تھی۔اسے یونانی مورخین نے سوفائی ٹیز کا نام دیا ہے۔اس کی سلطنت کا مرکز کہیں چنیوٹ کے قریب تھا جبکہ سکندر کے ساتھ چلنے والے مورخین ان کی ریاست کا مرکز بھیرہ کا مقام بیان کرتے ہیں۔اگر یہ بات واضح ہے کہ راجہ سو بھاتی کی حکومت دریائے سندھ اور جہلم کے درمیان واقع تھی تو اس راجہ کا جنوب کے میدانوں علاقوں پر کتنا کنٹرول تھا۔ وی ای سمتھ کے بیان کے مطابق راجہ سو بھاتی کی حکومت کوہستان نمک کے زیریں علاقہ پر تھی تو اس کی ریاست سرگودھا،خوشاب اور چکوال ضلعوں کے درمیان ہوسکتی ہے جبکہ اس راجہ کا مزید جنوب کے میدانی علاقوں اور وہاں آباد قبائل پر کوئی سیاسی اثر رسوخ نہیں تھا۔دریائے جہلم اور چناب کے درمیان ایک پورو بادشاہ کی حکومت تھی جسے راجہ پورس کہا جاتا ہے۔یہی راجہ پورس تھا جس نے یونانی بادشاہ سکندر کا مقابلہ کیا۔راجہ پورس کو بدھا پرکاش اور دوسری قدیم ہندی تحریروں میں مہاراجہ پورس کا خطاب دیا گیا ہے۔یہ ہندی خطاب اسی طرح ہے جس طرح اردو میں اعظم یا انگلش میں الیگزینڈر کے الفاظ۔اس کی سلطنت کے مرکز کے بارے میں ابھی تک معلوم نہیں ہوسکا۔ممکن ہے کہ راجہ پورس کی حکومت دریائے جناب سے لے کر دریائے سندھ تک کے علاقوں پر ہو۔یہ بھی ممکن ہے کہ میدانی علاقوں ''تھل'' پر جو قبائلی سردار حکمران تھے،وہ کسی حد تک راجہ پورس کی عملداری میں ہوں اور پورس کو اپنا حاکم اعلیٰ تصور کرتے ہوں۔پورس نے کسی جنگی حکمت عملی کے تحت یونانی فوج کا مقابلہ کرنے کے لیے میدانِ جنگ کا انتخاب دریائے جہلم کے

پار کیا ہو اور ان کا اثر رسوخ دریائے سندھ تک کے علاقوں پر ہو کیونکہ ہمیں تاریخی بیان سے پتہ چلتا ہے کہ ایرانی بادشاہ دارا اور یونانی بادشاہ سکندر کے درمیان جنگ میں جس ہندوستانی راجہ فور نے دارا کی مدد کی تھی وہ بقول بدھا پرکاش راجہ پورس ہی تھا۔ یونانی مورخین پورس کی سلطنت دریائے جہلم کے مشرق میں بتاتے ہیں اور دریائے سندھ اور دریائے جہلم کے درمیان میدانی خطہ کو ریاست وہیک کا نام دیتے ہوئے اس علاقہ پر ایک سے زائد اقوام کی حاکمیت بتاتے ہیں۔

یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے پہلے دریائے سندھ کے پار مشرقی علاقوں پر خود ایرانی بادشاہ کا قبضہ اور اثر ورسوخ ہو اور اس وقت بھی ان علاقوں پر قابض قبائلی سردار کے ساتھ ایرانی حکومت کے تعلقات اچھے ہوں جس سے ایرانی بادشاہ نے ان میں سے کسی طاقتور قبائلی سردار کو اپنی مدد کیلئے کہا ہو اور وہ سردار دوسرے لوگوں کی مدد سے ایک فوج تیار کر کے ایرانی بادشاہ کی مدد کیلئے روانہ ہوا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ سردار یا کمانڈر جو اس ہندی فوج کی کمان سنبھالے ہوئے تھا، کا نام فور تھا یا ایرانیوں نے اس کا نام فور تحریر کیا ہو۔ اس ہندی راجہ نے ایرانی بادشاہ کی مدد کیلئے فوج، جس میں جنگی ہاتھی بھی شامل تھے، ان کو روانہ کیا جبکہ اسی فوجی دستہ کی آمد سے پہلے ایرانی فوج شکست کھا چکی تھی اور دارا سوم جو اس وقت ایران کا بادشاہ تھا، قتل ہو چکا تھا۔ اس طرح سکندر نے ایران کے تمام علاقوں پر قبضہ کر لیا تھا۔

سکندر سے قبل تھل کے حالات

چوتھی صدی قبل مسیح کی آخری دہائیوں میں یونانی بادشاہ سکندر نے ہندوستان پر حملہ کیا تو اس وقت مغربی پنجاب یا گندھارا ریاست کئی حصوں میں تقسیم ہو چکی تھی۔ ہم پہلے باب میں بیان کر چکے ہیں کہ دریائے سندھ سے لے کر جہلم چناب تک بشمول موجودہ تھل اور مغربی پنجاب کے، وہ علاقے جہاں اس سے پہلے کوروکشتر یا کوروسلطنت ہوا کرتی تھی، اس کے خاتمے کے بعد اور آچمینی وایرانی تسلط کے بعد اس علاقے میں ایک سے زائد حکمرانی کے دعویدار پیدا ہو چکے

تھے۔جیسا کہ آپ پڑھ چکے ہیں کہ گندھارا سلطنت جو کوروں اوران کے بعدآچمینی وایرانی دور میں گندھارا اپنے عروج پرتھی جبکہ ٹیکسلا جوگندھارا سلطنت کا مرکز تھا،اسے پورے ہندوستان میں مرکزی حیثیت حاصل تھی۔سکندر کے حملے سے کچھ عرصہ قبل تک یہ پورا علاقہ افراتفری اور مقامی قبائل کی خانہ جنگی کی وجہ سے چھوٹی چھوٹی ۵ / ۴ریاستوں میں بٹ چکا تھا۔یعنی مغربی گندھارا جس کا پایہ تخت پشکلاوتی (چارسدہ) تھا، پرہستایان نامی شخص حکمران تھا جبکہ مرکز ٹیکسلا میں امبھس خاندان کاایک راجہ امبھی قابض تھا۔جنوب میں کوہستانِ نمک کے پہاڑی سلسلے میں راجہ سوبھاتی کی حکومت تھی جسے یونانیوں نے سوفائی ٹیز مشہور کیا ہے۔دریائے جہلم کے اس پار جھنگ کے شمال میں راجہ پورس کی حکومت تھی جبکہ "تھل" اورمزید جنوب میں ملتان تک بھی ایک سے زائدقومیں اپنے علاقوں پر قابض تھیں۔جیسا کہ دریائے سندھ کی مشرقی میدانی پٹی "تھل" کے علاقوں پرایودھا جیوی اتحاد کی ریاست تھی جوانہوں نے کچھ دوسری قوموں سے مل کراس علاقے پر قائم کر رکھی تھی۔ ملتان کے گردونواح میں ملوی قوم آباد تھی۔ یہ ملوی تھے جن کوسنسکرت میں مالوے کہا گیا ہے۔

ان کے اتحادی کوشدرک بھی آباد تھے۔تھل کے کچھ حصوں پرایودھا قبائل کے علاوہ کچھ دوسری اقوام بھی آبادتھیں جن میں سبوئی، بلسیکا، دریتااوردھریتاوغیرہ شامل تھیں۔معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب کے سب ایودھاقوم کے اتحادی تھے جنہوں نے مل کرتھل کے علاقوں پرایک ریاست وہیک قائم کی تھی جبکہ دریائے چناب اور جہلم کے سنگم پرجنوب میں ایک دوسری قوم اگلسوئی آباد تھی۔ یہ نام یونانیوں نے دیا تھا۔ان حالات کوسامنے رکھتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ راوی کے علاقے میں میں ایک طرح سے افراتفری کا ماحول تھا۔ ہرطرف خودمختارسرداراپنے اپنے علاقوں پر قابض تھے۔ان میں کئی علاقوں میں تو ریاستی نظام موجودتھااوربعض ایسے تھے جنہوں نے خود مختاری تواختیارکرلی تھی مگران کے پاس کوئی خاص ریاستی ڈھانچہ موجودنہ تھااورنہ ہی فوج تھی بلکہ صرف قبائلی جتھے تھے جولڑائی میں اپنے سرداراورقوم کا دفاع کرتے تھے۔

راجہ پورس

ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ دس بادشاہوں کی جنگ میں سدا فوج سے شکست کھانے کے بعد پوروکس نے مغربی پنجاب یعنی دریائے جہلم، چناب اور سندھ تک کے علاقوں کا رخ کیا۔ وہاں وہ تمام مقامی قبائل سے اتحاد کر کے ان علاقوں میں ایک کوروکشتر نام کی سلطنت قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ کچھ عرصہ بعد یہ سلطنت بھی اپنا وجود برقرار نہ رکھ سکی اور آچمینی بادشاہ سائرس کے ہاتھوں شکست کھانے کے بعد پورو بادشاہ پکوستی کی گرفت کمزور ہوتی گئی کیونکہ مصری بادشاہ کی رحم دلی اور نرم رویہ سے تمام ہندوستانی قبائل اتنے متاثر ہوئے کہ انہوں نے ان کو اپنا نجات دہندہ سمجھ لیا۔ آچمینی بادشاہ کی واپسی کے ساتھ ہی ایک مرتبہ پھر سے اس علاقے میں افراتفری پھیل گئی۔ وادیٔ سندھ کا پورا خطہ کئی ایک خودمختار ریاستوں میں تقسیم ہو گیا تو ان میں ایک ریاست جو دریائے جہلم اور چناب کے سنگم کے شمال میں واقع تھی جس پر پورس قابض تھا۔ راجہ پورس پوروکورو یا پورؤس، پاؤاروخاندان کا آخری بادشاہ معلوم ہوتا ہے۔ پوروقبائل کے متعلق ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں لیکن خود پورس نام کے متعلق کچھ اقتباسات جو چند ایک مورخین کی آراء پر مبنی ہیں، پیش کرتے ہیں۔ جس طرح پورس نام کے کئی معنی اور پس منظر بتائے جاتے ہیں، اسی طرح پورس کی شخصیت بھی تمام لوگوں سے مختلف تھی۔ جیسا کہ بدھا پرکاش اپنی تحریر میں بیان کرتے ہیں کہ لفظ پورس قدیم نام پاؤرو سے نکلا ہے جبکہ ہندوؤں کی قدیم کتاب مہابھارت میں بھی پورس کو پاؤراؤ کے مترادف قرار دیا گیا ہے۔ اکثر مورخین اسی مشکل اور الجھن کا شکار رہے اور ان دونوں ناموں کو ایک ہی معنی دے دیے اور ان الفاظ کو نام پورو سے جوڑ دیا۔ قدیم ویدک بھجنوں میں ہمیں اس نام کی ایک قوم کا ذکر ملتا ہے جو مشرقی پنجاب دریائے راوی اور ستلج کی وادی میں آباد تھے۔ ان کا حاکم اور سردار پورو نام کا آدمی تھا۔

پورو کے متعلق قدیم ہندی مذہبی تحریروں کے مطابق آدیتی ڈکسا پوروتھا یعنی والد کا نام ڈکسا اور والدہ کا نام آدیتی تھا جبکہ ان دونوں میں سے پیدا ہونے والی اولاد پورو مشہور ہوئی۔ ان کی

اولاد میں ویوسون، الا، پوردوا، آئیو، ناموسا اور یایتی شامل تھے۔ ان میں سے کچھ نے اپنی اپنی ریاستیں قائم کیں اور بادشاہ بھی رہے۔ انہی میں سے ایک یایتی نام کا شخص تھا جسے آخری بادشاہ کہا گیا ہے۔ اس کی دو بیویاں تھیں۔ ایک ملکہ کا نام دیونانی اور دوسری کا شرمستھ تھا۔ ان دونوں بیویوں سے جو اولاد ہوئی، ان میں پہلی بیوی سے یادوتر واس جبکہ موخرالذکر سے دوروہی، انو اور پورو نے جنم لیا۔ رگ وید اور مہا بھارت کی تحریروں کے مطابق جن دس بادشاہوں کی لڑائی کا ذکر ملتا ہے اور اس جنگ میں شاہ بھارت کے جن دس بادشاہوں کے اتحاد نے سدا فوج کا مقابلہ کیا، ان کی سربراہی پوروکس نام کا بادشاہ کر رہا تھا۔ وہ اسی پورو کی اولاد تھا۔ شکست کے بعد پوروکس گرفتار ہوا اور قتل کر دیا گیا۔ اس کی بیوی نے ایک ایسے بیٹے کو جنم دیا جس کا نام داسیو تھا۔ اس نے آنے والے وقت میں اپنے خاندان کی عزت کو بحال کرنے کے لیے دریائے راوی سے مغرب کی طرف نقل مکانی کی۔ اس کا خاندان دریائے چناب، جہلم اور سندھ کے دوآبوں میں آباد ہوا۔ داسیو نے اپنے خاندان اور کچھ دوسری اقوام سے مل کر ان علاقوں میں پورو سلطنت کی بنیاد رکھی۔ یہ وہی کوروکشتر سلطنت تھی جس کو پورو بادشاہ داسیو نے کورو قبائل سے اتحاد کر کے قائم کی تھی۔ آنے والے وقت میں یہ سلطنت اکثر پنجاب کے علاقوں مغرب دریائے سندھ سے لے کر مشرق میں اتر پردیش الہ آباد تک پھیل گئی تھی۔ اس خاندان کے بہت سارے بادشاہ گزرے ہیں جن میں ترا سے داسیو کا بیٹا ہرانن، ترکسی، ٹریارونا اور کروشروان نے تاریخ میں خاص مقام حاصل کیا ہے۔

پورو بادشاہ سموارانہ، جس کا ذکر ہم پچھلے باب میں کر چکے ہیں، اسی خاندان سے تھا۔ اس کی سلطنت مغرب سے دریائے سندھ تک پھیلی ہوئی تھی اور درمیان کا تمام میدانی علاقہ تھل اس کی حکومت میں تھا۔ اس کی شاہی مشرق میں اُتر پردیش الہ آباد اور دریائے جمنا سرسوتی تک سارے پنجاب پر تھی جس نے بھارتی حکمرانوں کے لیے بہت مشکلات پیدا کر دی تھی۔ اسی دوران کچھ نئے قبائل پنکلوں اور کوروں جیسے منظرِ عام پر نمودار ہوئے۔ مہا بھارت کی ایک روایت کے مطابق کہ کس طرح پنکلوں نے پورو بادشاہ سموارانہ کو شکست دے کر مغرب کی طرف دریائے سندھ

کے کناروں کے طرف پسپا کر دیا۔ سموارانا کا بیٹا جو ملکہ تپتی کے بطن سے تھا، نے اپنی سلطنت کو وسعت دی اور ایک نیا اتحاد قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا جسے پوروکورو نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ قدیم روایتوں میں اس اتحاد کے حوالہ سے کاڈرین اور کوروسوانا کے نام ملتے ہیں۔ ہندی ادب میں اسے کوروکشتر یا اتر کورو کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس بادشاہ کے تین بیٹے تھے، پارکستیتا، جنہو، اور سندھوان۔ ان میں آخری بیٹا سندھوان کا ایک طاقتور حکمران ثابت ہوا۔ اس کا ایک بیٹا جنم جایا تھا جو باپ کی طرح طاقتور اور مضبوط حکمران ثابت ہوا۔ اس نے کوروکشتر یعنی اپنی سلطنت کو چار چاند لگا دیے۔ اس کے دور میں خوشحالی اس قدر تھی کہ قدیم سنسکرت تحریر کے باب (۷-۱۰-۷-۱۲-XX) میں اس بادشاہ کے دور کے حالات بیان کیے گئے ہیں جس سے معلوم ہوا ہے کہ اس بادشاہ کے دور میں دودھ اور شہد کی اتنی فراوانی تھی کہ لوگ اپنے مہمانوں کے سامنے پانی کی جگہ یہ مشروبات پیش کرتے تھے۔

چھٹی صدی قبل مسیح کے دوران ایک پر عزم بادشاہ پکوستی کا نام سامنے آیا جس کا تعلق پورو قبائل سے تھا۔ اس بادشاہ کے دور میں آچمینی فاتح سائرس اعظم نے ہندوستان پر حملہ کیا تو پہلے پہل پورو بادشاہ نے آچمینی فاتح سے امن معاہدہ اور دوستانہ مراسم استوار کیے لیکن بعد میں انہوں نے جارحانہ رویہ اختیار کیا جس کی وجہ سے اس کی حکومت میں افراتفری پھیل گئی اور تمام ہندوستانی قبائل نے سائرس اعظم جو ایک نرم خو اور رحمدل بادشاہ تھا کو اپنا شہنشاہ تسلیم کر لیا۔ اسے ہندیوں کے بادشاہ کے نام سے جانا جاتا تھا۔ آخر کار یونانی بادشاہ کی بڑھتی ہوئی طاقت سے سندھ اور شمال میں ٹیکسلا تک تمام گندھارا پر قبضہ کر لیا لیکن آچمینی شہنشاہت کے خاتمے ۵۱۵-۲۰ ق م تک ان علاقوں پر ایرانی شہنشاہ دارا اول کا قبضہ اور تسلط کی وجہ سے پوروکورو سلطنت افراتفری کا شکار ہو گئی لیکن چوتھی صدی قبل مسیح کے اول میں ایرانی بادشاہ دارا کو یونانی ایتھنیز میں بغاوت کا سامنا کرنا پڑا تو اس میں پورو نے خود کو منظم کر کے دریائے سندھ اور جہلم، چناب کے میدانی علاقوں میں دوبارہ اپنا قبضہ بحال کر لیا۔ اس میں دوسرے بہت سے قبائل شامل تھے جنہوں نے ایرانی تسلط

کے خلاف بغاوت میں حصہ لیا لیکن سڑابو اور سر اوال سٹین جو ایک یورپی مورخ ہے، تحریر کرتے ہیں کہ اس مرتبہ وہ پہلی پورو کورو سلطنت اپنا وجود برقرار نہ رکھ سکی۔ بہت سارے قبائل اپنے اپنے علاقوں پر قابض ہو گئے۔ ان میں ایک مشہور نام پورو بادشاہ راجہ پورس کا بھی تھا جس کا تعلق پورو خاندان سے تھا۔ پورس ایک طاقتور حکمران تھا لیکن اس کی ریاست دریائے جہلم اور چناب درمیان واقع تھی جس کا مرکز نندانا کا شہر تھا جو دریائے جہلم کے مشرقی کنارے کوہ نمک کے درمیان واقع تھا۔ پورس کی دریائے جہلم اور سندھ کے درمیان تمام میدانی خطہ "تھل" پر بھی گرفت تھی۔ یہاں پر موجود سرکش قبائل راجہ پورس کے خلاف بغاوت کرتے رہتے تھے۔ پورس اپنے دور کا ایک طاقتور حکمران تھا۔ اس کی طاقت کا چرچا ایران سمیت کئی دوسرے مما لک میں مشہور تھا۔ ہندوستان میں پرانا جات اور تاریخی مسودے کے حوالہ سے پورس کو بڑی عزت اور خصوصی حیثیت حاصل تھی۔ اس طرح سے پورس پورو خاندان کا آخری بادشاہ ثابت ہوا۔ اس کے بعد کسی پورو بادشاہ کے متعلق ہندوستانی تاریخ میں حوالہ نہیں ملتا۔

راجہ پورس کا خاندان:

راجہ پورس کے خاندان کے متعلق بہت سارے قدیم تاریخی حوالے اور کافی سارے مورخین کی آراء پائی جاتی ہیں جن کے مطالعہ سے کچھ حد تک معلومات حاصل کی گئی ہے۔ ان کی تفصیل درج ذیل ہے۔

رگ وید باب (۱-۶-۳-۱) کے ایک پیرے میں سیان پورو کے کئی معنی بیان کیے ہیں۔ بحوالہ بدھا پرکاش جبکہ ویدک بھجنوں میں پاسکا نے اس قبیلے کا ذکر کیا ہے۔ پرانوں اور مہا بھارت میں بھی پورس یا پوروس کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان سب کی تحقیق سے معلومات سامنے آئی ہیں کہ کس طرح ڈکسا اور ان کی بیوی آدیتی کی اولاد تھی۔ بچوں کی تعداد میں پہلا ویوسون، دوسرا الا، پورووا، آئیو، ناموسا اور یایتی شامل تھے۔ پھر ان کے آخری بچے یایتی کی دو بیویاں تھیں۔ ایک دیویانی اور دوسری شرمستھ۔ دیویانی کے بطن سے ایک بچہ تھا جس کا نام یادوترس تھا جبکہ دوسری بیوی

شرمستھ کے بطن سے تین بیٹے تھے، پہلا دوروہی دوسرا انو اور تیسرا پورو۔ پورو اس مشہور قبیلے پوروؤا یا پاؤرس کا بانی تھا۔ یہ وہی مشہور بادشاہ پوروکس ہے جس نے رگ وید میں دس بادشاہوں کی ذکر کردہ لڑائی میں اتحادی فوج کی قیادت کی تھی۔ یہ جنگ بھارت واستھ کے خلاف لڑی جا رہی تھی۔ اس جنگ میں پوروکس کو شکست ہوئی۔ وہ خود مارا گیا اور اس کی موت کے بعد اس کی بیوی پوروکسانی، جو شاید پہلے حاملہ تھی، نے ایک بیٹے تراسے داسیو کو جنم دیا۔ شاہ بھارت واستھ کی موت کے کچھ عرصہ بعد سدوؤں کی سلطنت بحران کا شکار ہوگئی۔ سدا قبائل کے کچھ جنگجو سرداروں نے واستھ کے جانشین بیٹے کو قتل کر کے آگ میں جلا دیا۔ اور اس دوران بھارتیوں کے درمیان خانہ جنگی کی سی صورت حال کے پیش نظر پوروکس کا بیٹا تراسے داسیو پھر سے اپنے قبیلے اور تتر بتر فوج کو اکھٹا کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس نے تمام شمالی مغربی ہندو پنجاب جس میں دریائے سندھ تک کا علاقہ شامل تھا، پر اپنی سلطنت قائم کر لی۔

یہی وہ پورو سلطنت تھی جس کا آخری بادشاہ راجہ پورس جو دریائے جہلم اور چناب کے درمیان نندانا کے علاقے کا حکمران تھا کیونکہ تراسے داسیو کی سلطنت مشرق میں دریائے راوی شمال میں ٹیکسلا مغرب میں دریائے سندھ اور جنوب میں ملتان تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے بعد ان کے جانشین جن میں ہرانن، ترکسی، ٹریارونا، کروشروان، سموارانا، کورو، پارکسیتا، جنھو، سدھنوان اور جنم جایا اس سلطنت پر حکمران رہے۔ چھٹی صدی قبل مسیح کے وسط میں مصر کے بادشاہ سائرس اعظم نے جنم جایا کا تختہ الٹ کر دریائے سندھ اور جہلم کے علاقہ تھل پر قبضہ کرلیا۔ آچمینی بادشاہ کے حملے کے بعد ۴۸۵ ق م میں دارا اول کے دور تک یہ علاقہ ایران کے ماتحت رہا۔ اتھر وا وید کے باب (۷-۱۰-۱۲۷-XX) حوالہ بدھا پرکاش کے مطابق جنم جایا کے بیٹے سرت سین، اگر سین، بھیم سین کا بھی ذکر ہے لیکن ان کی زیادہ تفصیل نہیں ملتی جبکہ جنھو کے بیٹے سرتھ اور اس کے جانشین پاوروؤا، ترنیپ، دیواپی، بلھسکا، سنتانو، بھسما، چترن گدا چتر وایا کا ذکر ہے جنھوں نے پانچویں صدی ق م کے آخر میں آچمینی سلطنت کے زوال کے بعد پورو خاندان کی قوت بحال

کرنے کامیابی حاصل کی، اس کام میں پاوروا کے بیٹے پرتیپ کو خاندان کی قوت بحال کرنے کا کریڈٹ دیا جاتا ہے۔ اس کے تین بیٹے تھے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ہخمینی بادشاہوں کا گندھارا مغربی پنجاب "تھل" سے تسلط ختم ہوتے ہی یہاں مختلف قبائل نے سر اٹھایا جو اپنے اپنے علاقوں پر قابض ہو گئے جبکہ پورو خاندان نے دریائے جہلم کے اس پار کے علاقے پر اپنا قبضہ جمایا جہاں چوتھی صدی ق م کے وسط میں اسی پورو خاندان کے آخری بادشاہ راجہ پورس حکمران تھا جس کی سکندر یونانی سے ۳۲۶ ق م میں دریائے جہلم کے کنارے جنگ ہوئی جس کی تفصیل آگے آئیگی۔

سکندر اعظم کی آمد

سکندر مقدونیہ کے ایک شہر پیلا (Pella) میں پیدا ہوئے۔ مقدونیہ یونان کا ایک پسماندہ ترین علاقہ تصور کیا جاتا ہے۔ جو ایتھنیز اور آسیہ وغیرہ علاقوں کے مقابلہ بہت پیچھے تھا۔ سکندر کا باپ فلپ مقدونیہ کا گورنر تھا۔ یونانی مقدونیہ کے لوگوں کو جاہل کہتے تھے۔ ان کا کام مویشی پالنا اور کھیتی باڑی کرنا تھا۔ سکندر خوش قسمت تھا۔ ایک تو وہ ایک گورنر کے گھر میں پیدا ہوا، دوسرا اسے ایک قابل استاد ارسطو ملا جس کی عملی اہمیت نے سکندر کی شخصیت پر ایک گہرا اثر ڈالا۔ یہ ارسطو جیسے استاد کی وجہ تھی کہ سکندر نے یونان کے تمام علاقوں اور مصر، ایرن، بابل ایشیاء کوچک اور ہندوستان تک کے علاقوں کو فتح کرنے کا تہیہ کر لیا۔

سکندر کی فتوحات نے صرف یونان ہی نہیں بلکہ ساری دنیا میں دھاک بٹھا دی۔ وہ صرف ایک سپہ سالار یا ایک بے رحم جنگجو ہی نہیں، بلکہ ایک مفکر بھی تھا۔ اسے تمام شاندار تہذیبوں کی دنیا کو دیکھنے اور ان پر اثر انداز ہونے کا بھی شوق تھا۔ فتح در فتح سکندر جن خطوں سے گزرا، ان میں اس وقت کی چار بڑی تہذیبیں تھیں جن کو زیر کرنے کے لیے صرف فوجی حکمت عملی ہی نہیں، بلکہ اپنے عالمانہ انداز فکر، تاریخی امور، جغرفیہ وٹیکنالوجی اور ان خطوں کے نظموں پر مکمل عبور حاصل کرنے کے بعد انہوں نے اپنے سفر کا اغاز کیا۔

سکندر کی پیش قدمی:

سکندر مقدونیہ سے ایشیاء کوچک (اناطولیہ) سے ہوتا ہوا مصر پر حملہ آور ہوا اور مصر کے بعد پھر اناطولیہ سے (بابل) عراق اور ایران میں تخت جمشید کو فتح کیا۔ سکندر کا آخری مقام اور ان کی فتوحات کی آخری منزل مشرقی ہند تھی جس کے بارے اس کا کہنا تھا کہ یہ سورج کی دھرتی ہے کہ یہاں سے سورج طلوع ہوتا ہے۔ سکندر نے مصر سے ہندوستان تک کے تمام علاقوں کو زیر کیا اور یونانی فوج خوشی کے ساتھ آگے بڑھتی رہی۔ دشوار اور پرخار راستوں اور بل کھاتی پہاڑیوں اور کئی مقامات پر معرکہ آرائی کے جوہر دکھاتی ہوئی تہذیب بابل اور تخت جمشید کو پیروں تلے روندتے ہوئے کاکیشین اور ہندوکش کے پرخطر پہاڑی سلسلہ کو عبور کر کے ۳۲۶ ق م (Hadaspace) سکندر دریائے جہلم کے کنارے آ پہنچا۔ ان تمام راستوں کی مشکلات اور دارا جیسے ایرانی شہنشاہ اور ایرانی فوج کے ساتھ مقابلے اور ہندوکش جیسے سر بہ فلک پہاڑی سلسلہ کو عبور کرنے کے بعد اب سکندر کے سامنے ایک بہت بڑی دیوار جو مشکل کا سبب بنی ہوئی تھی، وہ دریائے جہلم کے اس پار اس دھرتی کے سپوت مہاراجہ پورس تھا۔ پورس سکندر کی مزاحمت اور مقابلے کے لیے بدمست ہاتھیوں کی فوج کے ساتھ دریائے جہلم کے مشرقی کنارے پر موجود تھا۔

پورس اور سکندر کی فوجی صلاحیت:

سکندر اپریل ۳۲۶ ق م کے وسط میں ٹیکسلا سے روانہ ہوا اور مئی ۳۲۶ ق م کے شروع میں دریائے جہلم کے مغربی کنارے پر پہنچا۔ اس سے پہلے کہ ہم دونوں بادشاہوں کے جنگی حالات بیان کریں لیکن میرے خیال میں ضروری ہوگا کہ ان دونوں فوجوں کی جنگی صلاحیت اور اسلحہ کی تفصیل بیان کریں۔

سکندر کی فوجی صلاحیت:

مقدونوی فوج جس کی سربراہی سکندر کے ہاتھ میں تھی اس کی تعداد تقریباً ۵۰۰۰۰ تا ۶۰۰۰۰ تھی۔ اس میں ۱۵ ہزار تیر انداز، ۱۵ ہزار پیدل، ۱۵ ہزار توپ خانہ، ۵ ہزار شہسوار،

۸۶ ہاتھی اور ۱۰ ہزار سپاہی مختلف امور سرانجام دے رہے تھے۔اس کے علاوہ سکندر کے پاس ۱۰ ہزار کے قریب مقامی لوگوں کی وہ فوج جو ٹیکسلا کے راجہ امبھی اور کچھ دوسرے علاقوں سے بطور امداد ملے تھے۔فوج کے علاوہ ۱۵ ہزار سے ۲۰ ہزار افراد عام لوگ تھے جو جہاز رانی، کھانے پکانے اور فوج کی خدمت پر مامور تھے۔اس کے علاوہ سکندر کی فوج کے پاس جو ہتھیار تھے، ان کی تفصیل کچھ یوں ہے کہ ان میں بھاری ذرہ، آہنی ذرہ، جس کو ہپاسپس کہا جاتا تھا، تلواریں، چار فٹ لمبے نیزے، چھ فٹ لمبے دستے اور سریسا ۱۸ فٹ، یوں نیزے کی کل لمبائی ۲۴ فٹ تھی۔ یونانی فوج کے پاس ایک ایسی ہیلمٹ بھی تھی جو چھاتی سے لے کر ٹانگوں تک پورے جسم کا بچاؤ کرتی تھی۔منجنیق، جو اس سے پہلے ہندوستانیوں کے پاس نہیں تھی، وہ بھی یونانی فوج کے پاس موجود تھی۔منجنیق کے ذریعے ۳۰۰ گز دور سے دشمن پر سنگ باری کی جاتی تھی۔ اسے یونانی بلاستس یا کاتاپولنس کہتے تھے۔سکندر کے پاس تیروں کا ایک بہت بڑا ذخیرہ تھا جن میں بھاری کمان خطرناک، ترین ہتھیاروں کے طور پر کام کرتے تھے، ان کے نشانے ٹھیک ہدف پر لگتے اور فولادی ڈھال تک کو پھاڑ ڈالتے تھے۔

پورس کی فوجی صلاحیت:

پورس کے پاس جو فوجی قوت تھی اس میں ٹوٹل فوج کی تعداد ۵۰ ہزار کے لگ بھگ تھی جو مغربی پنجاب کے مقامی لوگوں پر مشتمل تھی۔حلیہ ان کا کچھ یوں تھا کہ یہ طویل القامت لوگ تھے، جن کا قد تقریباً ۶ فٹ سے اوپر تھا، رنگت ان کی سیاہ، داڑھیاں بارعب اور وجاہت آمیز تھیں۔ وردی ان کی نفیس اور کاٹن کی تھی۔ یہ لوگ جو کرتا پہنتے تھے وہ پاؤں تک لمبا ہوتا تھا۔تھل پنجاب کی قدیم رسم پگڑی، جو سوتی لٹھے کی ہوتی تھی، سر پر باندھتے تھے۔ داڑھی کے ساتھ بڑی بڑی مونچھیں اور سر کے بال جنہیں وہ اچھی طرح سے کنگھی کرتے لیکن ان میں کم لوگ بال کٹواتے تھے۔ یونانی دانشور لکھتے ہیں کہ یہ لوگ دوسرے خطوں کے لوگوں کی طرح عیش پرست نہیں تھے۔ مزید انہوں نے تحریر کیا ہے کہ ہندوستانی راجہ ان مشکل حالات میں، جب اس کی ہر طرف سے

مخالفت ہو رہی تھی، ایک عظیم فوج تیار کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ ہندو ادب کی قدیم رزمیہ تحریروں اور پرانا جات سے معلوم ہوتا ہے کہ راجہ پورس کی فوج میں توپخانے، رتھوں، شہسواروں اور جنگی ہاتھیوں کی ایک بڑی تعداد شامل تھی۔ یونانی مورخ ڈایوڈورس کے مطابق راجہ پورس کے پاس ۵۰ ہزار پیادے، ۳ ہزار شہسوار، ایک ہزار بگھیاں اور ۱۳۰ ہاتھی موجود تھے۔ ہندی فوج کے پاس بھی ایک ایسی تیر کمان موجود تھی جو ساڑھے دو اور تین گز لمبا تیر پھینکتی تھی۔ اس کو آدمی زمین پر رکھ کر چلاتا تھا۔ تیر کا پھل ہڈی اور لوہے دونوں کا ہوتا تھا۔ پورس کی فوج کے پاس دوسرا بڑا ہتھیار بگھی جس کو تین سے چار گھوڑے مل کر کھینچتے تھے۔ یہ بگھی ۷ فٹ اونچی اور ۹ فٹ چوڑی ہوتی تھی جبکہ دوسرے ہلکے ہتھیاروں میں اس علاقے کا روایتی کلہاڑا، خنجر اور چھری شامل تھے۔ یہ دست بدست لڑائی میں استعمال کرتے تھے۔ ہندی فوجی جسم پر آہنی زرہ جو زنجیروں کی بنی ہوتی تھی، پہنتے تھے۔ اس کے علاوہ خونخوار ہاتھی جو ہندوستان میں عام طور پر بادشاہ اور فوج کے پاس ہوتے تھے۔ فردوسی کے شاعرانہ انداز کے مطابق کہ سکندر اور راجہ پورس کی جنگ ۳۲۶ ق م سے لے کر شہنشاہ اکبر کے جرنیل منعم خان اور بنگال کے پٹھان سلطان داؤد کیرانی کے درمیان خونریز جنگ تک ہندوستان میں ان ہاتھیوں کا استعمال رہا ہے۔

پورس کے مصنف بدھا پرکاش کے مطابق یونانی فوج ہتھیاروں اور صلاحیت کی وجہ سے اہم تھی جبکہ ہندوستانی فوج بھی ان سے کم نہیں تھی۔ اس نے اپنی جان کے آخری قطرے تک وطن کا دفاع کیا اور یونانی فوج کو اس طرح کمزور کر دیا کہ وہ لڑنے سے صاف انکاری ہو گئے۔ یہ ہندی فوج کی کامیابی کی ہی وجہ تھی کہ سکندر نے دیکھا کہ جب ان کے جرنیل لڑنے کی بجائے اسے جنگ بندی کا مشورہ دے رہے تھے تو سکندر نے جنگ بندی اور صلح کی کوشش تیز کر دی۔

سکندر کی پیش قدمی ہندوستان:

فارس کی آچمینی سلطنت کو فتح کرنے کے بعد فاتح سکندر اب ہندوستان کو بھی زیر کرنا چاہتا تھا کیونکہ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ ہندوستانی بادشاہ پورس نے اس کے حریف دارا کی مدد پر آمادگی

ظاہر کی تھی بلکہ فوج کا ایک دستہ بھی بھیجا تھا۔ اس کے علاوہ سکندر اپنی عظیم الشان سلطنت کے ہمسائیگی میں کسی ایسے طاقتور حکمران کا وجود کیسے برداشت کر سکتا تھا جو اس کے لیے خطرے کا باعث ہو۔ اس لیے اس نے مقدونوی فوجیوں کا جذبہ مدھم پڑنے سے پہلے پنجاب پر چڑھائی کرنے کی منصوبہ بندی مکمل کر لی اور سکندر مئی ۳۲۷ ق م میں ایران سے ہندوستان کی طرف روانہ ہوا۔ ہندوکش پہاڑی سلسلہ عبور کرنے کے بعد ایک شہر موجودہ جلال آباد پہنچا۔ افغانستان کے تمام پہاڑی لوگوں اور قبائل پر قابو پانے کے بعد اس نے اپنی فوج کے دو حصے کیے۔ ایک کا کمانڈر جنرل ہیفاٹشن جبکہ دوسرے کا سربراہ جنرل پرڈیکاس اور خود ایک حصہ فوج کے ساتھ جلال آباد سے سیدھا وادی کنہڑ کا راستہ ٹیکسلا کی طرف کوچ کیا اور جنرل پرڈیکاس ایک حصہ فوج کے ساتھ سکندر کے پیچھے پیچھے چلتا رہا جبکہ اول الذکر حصہ دریائے کابل کے ساتھ ساتھ گندھارا (ٹیکسلا) کی طرف روانہ ہوا۔ یہ دونوں فوج کے حصے مختلف قبائل کو زیر کرتے ہوئے مارچ ۳۲۶ ق م کے وسط میں دریائے سندھ کے مقام (اٹک) کے پاس پہنچے۔ دریائے سندھ کو پار کرنے کے بعد تمام فوج ٹیکسلا پہنچی جس کا راجہ امبھی انتظار کر رہا تھا۔ یاد رہے کہ سکندر کی فوج نے ابھی دریائے سندھ پار نہیں کیا تھا کہ ٹیکسلا کے بادشاہ کی طرف سکندر کا ایلچی آیا۔ یونانی مورخ کیوریٹس کے بیان کے مطابق کہ راجہ امبھی نے سکندر کے ایلچی کی اچھی طرح دیکھ بھال کی اور اطاعت کا وعدہ بھی کیا۔ اس نے ایلچی کے ساتھ بہت سارے تحائف اور اپنی طرف سے سفارت بھیج کر مقدونوی فوج کے ہاتھ مضبوط کرنے کا بھی وعدہ کیا۔ اس طرح راجہ امبھی سکندر کا اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ سکندر ۳۲۶ ق م اپریل کے اول میں ٹیکسلا پہنچا جہاں راجہ امبھی نے مقدونوی فوج کی خوب میزبانی کی۔

سکندر ایک ماہ تک ٹیکسلا میں رہا اور اس دوران سکندر نے اپنے سی آئی ڈی کے افسران کو طلب کیا اور ان کے ذمے تمام جنوب مشرق کے علاقوں کی رپوٹ مانگی جس کے لیے راجہ امبھی کے آدمی بھی سکندر کے لوگوں کی مدد کے لیے ساتھ ساتھ رہے۔ انہوں نے ٹیکسلا سے لے کر

دریائے جہلم تک تمام علاقوں کے متعلق رپورٹ پیش کی۔اس رپورٹ کو دیکھنے کے بعد سکندر نے
حسب دستور ان بادشاہوں کی طرف اپنے ایلچی بھیجنے کا فیصلہ کیا جس میں صرف ابھسار کا راجہ
ابھیشر یس جو موجودہ پنڈی کے گردنواح کے علاقوں کا حکمران تھا،اطاعت قبول کرنے پر راضی ہو
گیا جبکہ یہی راجہ اس سے پہلے پورس کے ساتھ گٹھ جوڑ کر چکا تھا کہ سکندر کی فوج کے ساتھ لڑائی میں
وہ ہندی فوج کی مدد کرے گا۔اس کے لیے وہ تیاری بھی کر رہا تھا لیکن راجہ امبھی کے مشورے
سے انہوں نے اپنا سفیر سکندر کے پاس روانہ کر دیا۔ڈیوڈرس باب ۱۷ صفحہ ۸۷ کے بیان کے
مطابق اس راجہ نے اپنے سفیر کو بہت سارے اعلیٰ قسم کے تحائف اور اپنے تمام مقبوضات کو سکندر
کے حوالے کرنے کا اعلان نامہ بھی بھیج دیا۔جس سے سکندر کو یہ امید ہوئی کہ اب اس راجہ کی طرح
پورس بھی سرِ تسلیم خم کر دے گا۔ یہ بات بھی اس کے دماغ میں بار بار شوشا کر رہی تھی کہ سکندر! کب
تم ہندوستان کے آخری سرے، جسے یونانی سورج کی دھرتی یعنی سورج جہاں سے نکلتا ہے، تک
پہنچو گے؟ کیونکہ اب جب یونانی فاتح ہندوستان میں وارد ہو چکا اور اس نے کچھ حصہ پر قبضہ کر لیا
تو اس وقت اس کے سامنے پورے ہندوستان کا نقشہ ظاہر ہو چکا تھا۔

اب صرف اور صرف سکندر کے سامنے مشکل اور ایک دیوار کی طرح بند باندھے ہوئے تھی تو
وہ راجہ پورس کی باصلاحیت اور طاقتور فوج تھی جس کی قوت سے صرف سکندر ہی نہیں بلکہ اس کی
پوری فوج گھبرا رہی تھی۔ سکندر پہلے دیکھ چکا تھا کہ ہندوستانی بادشاہ کا ایک فوجی دستہ جس میں
خونخوار جنگی ہاتھی بھی شامل تھے، ان سے لڑنے کے لیے ایران تک جا پہنچے تھے۔اس کی باہمت
فوج اپنے ملک سے ہزاروں میل دور اپنی طاقت کا مظاہرہ کر رہی تھی تو اس کی اپنے ملک اور اپنے
ہی وطن میں کیا صلاحیت ہو گی؟ یہ سب باتیں سکندر کے دل و دماغ میں چکرا رہی تھیں جب وہ ٹیکسلا
میں راجہ امبھی کے پاس ٹھہرا ہوا تھا۔آخری وقت میں راجہ امبھی کی چال بازی اور حکمتِ عملی نے
کام کر دکھایا جب کوہستانی علاقے ابھسار کے راجہ ابھشیر یس نے سکندر کی اطاعت قبول کر لی
کیونکہ اس سے پہلے یہ راجہ پورس کے ساتھ مل کر سکندر کی فوج سے مقابلے کے لیے تیاری کر رہا

تھا۔سکندر نے دیکھا کہ پورس کے قریبی ہمسایہ ریاست کے راجہ بھی امبھی کی طرح ہمارے ساتھ مل چکا ہے اور فوجی امداد کی یقین دہانی بھی کروادی ہے۔اب یونانی فوج کی ہمت بڑھ گئی۔سکندر نے حسبِ دستور اپنا ایلچی کلیوکیرس بھیجا اور پیغام دیا کہ دوسرے ہندوستانی حکمرانوں کی طرح پورس بھی ان کی اطاعت قبول کرلے اور یونانی بادشاہ کی خدمت میں اپنا سفیر بھیج کر اطاعت کا وعدہ بھی کرے۔ساتھ اپنی ریاست کی سرحد پر یونانی شہنشاہ اور فوج کا استقبال بھی کرے۔اس پر پورس نے جواب دیا، اور اس جواب کو فردوسی نے اپنے شاعرانہ انداز میں تحریر کیا ہے کہ وہ غرور سے بولا کہ "ہاں ہاں! ہم اپنی سرحد پر ضرور ملاقات کریں گے لیکن یہ کسی دسترخوان پر نہیں بلکہ میدان جنگ میں ہوگی۔"

سکندر نے جب یہ جواب سنا تو اس نے اپنی فوج کو کوچ کا حکم دیا۔یوں یونانی فوج نے مئی ۳۲۶ کے وسط میں ٹیکسلا سے کوچ کیا۔اس وقت یونانی فوج کے ہمراہ ۵۰ ہزار فوجی اور ۸۵ جنگی ہاتھی بھی تھے جو راجہ امبھی نے بطور امداد دیے تھے۔اس طرح یونانی فوج مئی کے آخر تک دریائے ہائیڈاسپس یہ نام یونانی مورخین نے دیا تھا، اصل نام دریائے جہلم، کے مغربی کنارے پہنچے۔یہ ۱۱۰ میل کا فاصلہ ہے ٹیکسلا سے دریائے جہلم تک جو یونانی فوج نے ۱۵ دنوں میں طے کیا۔اس سست رفتاری کا اندازہ آپ خود لگا سکتے ہیں۔سکندر ٹیکسلا سے روانگی سے قبل اور دریائے جہلم تک پورس اور اس کی فوجی صلاحیت کا بغور جائزہ لیتا رہا۔بالکل اسی طرح جیسے آجکل فاتح امریکہ حملے سے پہلے اس ملک کی جنگی صلاحیت کا جائزہ لیتا ہے اور پھر اسے اردگرد کے ہمسایہ ریاستوں سے تنہا کر کے حملہ کرتا ہے۔جیسا کہ امریکہ نے عراق اور افغانستان میں کیا۔سکندر بھی امریکہ کی طرح فاتحِ عالم تھا لیکن پورس کی فوجی طاقت اس کو اس طرح ڈرا رہی تھی کہ وہ پھونک پھونک کر قدم بڑھا رہا تھا۔سکندر پورس کی ہمسایہ ریاستوں، جن میں دوست اور دشمن دونوں شامل تھے، پورس کے خلاف کرنے اور اپنے ساتھ ملانے میں کامیاب ہوگیا۔یہ تمام انتظامات مکمل ہونے کے بعد سکندر اپنی فوج، جس میں ٹیکسلا کی فوج بھی شامل تھی، دریائے جہلم کے مغربی

کنارے پہنچا تو تیز بارشوں کا موسم تھا۔ یونانی فوج کے لیے یہ سفر بھی بہت مشکل اور دشوار تھا۔

سکندر نے ٹیکسلا سے دریائے جہلم تک کون سا راستہ اختیار کیا؟ جنرل چیسنکی کے خیال کے مطابق سکندر نے جہلم کے لیے سیدھا راستہ اختیار نہیں کیا بلکہ وہ کوہ نمک کے جنوبی سرے (سالٹ رینج) کے علاقوں سے ہوتا ہوا روہتاس اور ٹلہ جوگیاں کے جنوب میں واقع بھنڈ رندی کی گزرگاہ سے ہوتے ہوئے جلال پور شریف کے شمال میں جہلم کے کنارے پہنچا۔ کننگھم بھی جنرل چیسنکی کی اس رائے سے متفق ہیں۔ وہ بھی مراقم ہیں کہ سکندر نے پنڈی مانکیالا، روہتاس کا راستہ اختیار نہیں کیا بلکہ جنوبی ڈھڈیال، اسانوت، ونگ سے ہوتے ہوئے جلال پور پہنچا جبکہ یورپی تاریخ دان اے برنس، جنرل کورٹ، جنرل ایبٹ، وی اے سمتھ اور ای آر بیوان مذکورہ بالا مورخین کے بیانات سے متفق نظر نہیں آتے۔ ان تمام کے خیال میں سکندر نے بالکل سیدھا راستہ اختیار کیا یعنی درہ بکڑالہ شاہ ڈھیری اور روہتاس سے ہوتا ہوا جلال پور پہنچا۔ قدیم مورخ سٹرابو نے بھی موخرالذکر مورخین کے بیانات کو صحیح تسلیم کیا ہے اور ان کا کہنا ہے کہ سکندر ہمیشہ اپنی نقل و حمل کے لیے پہاڑوں کے دامن کو ترجیح دیتا تھا کیونکہ کھلے میدانوں کی نسبت پہاڑی سلسلہ میں دریاؤں کے پاٹ بہت کم اور کنارے سخت ہوتے تھے۔ اس طرح دریا پار کرنا آسان ہوتا تھا۔ چنانچہ سکندر جب دریائے جہلم کے مغربی کنارے پہنچا تو دریائے جہلم کے دوسرے کنارے پر اس کا حریف پورس اپنی فوج کے ساتھ خیمہ زن تھا۔

سکندر دریائے جہلم کے مغربی کنارے:

اب یونانی فوج دریائے جہلم کے مغربی کنارے جلال پور شریف کے سے ۲ میل شمال مشرق میں اور سید پور سے ۴ میل تک جبکہ شاہ کبیر سے ۶ میل کے فاصلے تک پھیلی ہوئی تھی۔ دریائے جہلم اس وقت موسم برسات اور ساتھ ساتھ برف پگھلنے کی وجہ سے خوب طغیانی میں تھا۔ یہاں دریا کا پاٹ ۸۰۹ گز تھا۔ ساتھ ہی دریائے جہلم ایسا تند خو اور جوشیلا محسوس ہو رہا تھا کہ اس کو پار کرنا صرف مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن لگ رہا تھا۔ دریا کی دوسری جانب پورس جیسا باصلاحیت

دشمن ایک دیوار کی صورت میں خیمہ زن تھا۔ ہندی فوج جس کی تعداد تقریباً ۵۰ ہزار تھی، دیوہیکل ہاتھیوں، گھوڑوں کی قطاریں، بگھیوں کی لائنیں، خیمے اور قناطیں، ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہ کوئی بارونق شہر ہے۔ اس حالت میں یونانی فوج کے لیے دریائے جہلم کو پار کرنا، جب ہیبت ناک ہاتھیوں کی مسلسل نگرانی، تجسس، اعصاب شکن، ہوشیار اور توقعات سے بڑھ کر، فوج تناؤ کا شکار نظر آ رہی ہو، مشکل تھا۔ ایرین کا بیان ہے کہ یہ بالکل ظاہر تھا کہ یونانی سواروں کے گھوڑے جن پر سکندر کو ناز تھا، ان ہندی دیوہیکل ہاتھیوں کے مقابلے میں ان بلند قطاروں تک نہ پہنچ سکیں گے جہاں خونخوار ہاتھی ایک دیوار کی طرح موجود تھے۔ اس لیے ان مشکل حالات اور ان کے حل کے لیے کسی سیاسی حکمت عملی کی ضرورت تھی جس کے لیے سکندر کو کچھ دن انتظار کرنا تھا۔

اس وقت سکندر نے اپنے جنرل کوئنوس کو حکم دیا کہ دریائے سندھ کو عبور کرنے کے لیے جو کشتیاں بنائی گئی تھیں ان کو توڑ کر لایا جائے اور ان کو دوبارہ جوڑ کر دریا پار کرنے کے قابل بنایا جا سکے۔ ان کشتیوں کو دوبارہ جوڑ کر دریا پار کرنے کے لیے ایک بیڑا تیار کیا گیا۔ یونانی فوج کو دو مشکلیں درپیش تھیں۔ ایک تو ان کے سامنے ٹھاٹھیں مارتا ہوا دریا تھا جبکہ دوسرا مشرقی کنارے پر طاقتور ہندی فوج جو دشمن کے ساتھ لڑائی کے لیے تیار کھڑی تھی، موجود تھی۔ یونانی فوج یہ دیکھ چکی تھی کہ پورس کو دست بدست لڑائی میں شکست دینا اتنا آسان کام نہیں، جتنا وہ سمجھ رہے تھے۔ ضرور ان حالات میں یونانی فوج میں خوف کی فضا پائی جاتی ہوگی۔ اسی وجہ سے سکندر کی فوج ایک ماہ تک مغربی کنارے پر انتظار کرتی رہی اور کسی نہ کسی موقع کی تلاش میں رہی۔

دوسری جانب پورس کی فوج راستہ روکنے اور حملے کو پسپا کرنے کی لگاتار کوشش میں تھی۔ اس لیے ہندی فوج نے دریا کی نگرانی سخت کر دی۔ اس عرصہ میں یونانی فوج نے کئی بار دریا عبور کرنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکے کیونکہ ان کو ہر بار ہندی فوج شکست دے کر پسپا کر دیتی تھی۔ اگرچہ سکندر اپنی فوج کو اکتوبر تک انتظار کرنے کا مشورہ دے چکا تھا لیکن وہ مسلسل کسی ایسے مقام کی تلاش میں تھا کہ جہاں سے کسی وقت دریا عبور کیا جائے۔ دوسری طرف مسلسل نگرانی اور عین

اس وقت جب دریا عبور کیا جا رہا ہو، اس صورت میں پورس کی فوج کے یونانی فوج پر حملے کے امکان کو مدنظر رکھتے ہوئے سکندر پریشان تھا۔ سکندر مزید کچھ عرصہ انتظار کرتے ہوئے ایسے خفیہ راستے کی تلاش میں تھا جس سے پورس کو خبر نہ ہو اور وہ دریا عبور کر لے۔ ویسے بھی دریا کے مغرب کا تمام تر علاقہ اور آباد قبائل، حکمران سکندر کی امداد میں تھے اور عقب سے یونانی فوج کو کوئی خطرہ نہ تھا۔ سکندر کو مقامی مخبروں اور جاسوسوں کا تعاون بھی حاصل تھا۔ دوسری طرف مسلسل ٹیکسلا کا راجہ امبھی یونانی فوج کی ہر طرح سے مدد کر رہا تھا۔ مالی اور فوجی لحاظ سے امبھی کا تعاون بروقت پہنچ رہا تھا کیونکہ راجہ امبھی اپنے دشمن پورس کی شکست چاہتا تھا۔ اس کے خیال میں یہ منصوبہ بھی تیار تھا کہ اگر ہندوستان کے علاقے سکندر کے قبضے میں آ گئے تو وہ تمام تر اس کے تصرف میں آ جائیں گے۔

اس کی ایک تو سلطنت میں وسعت پیدا ہو جائے گی، دوسرا دشمن کی طرف سے خطرہ بھی ٹل جائے گا جو ہمیشہ امبھی کے سر پر سوار رہتا تھا۔ راجہ امبھی اور پورس کے درمیان کئی مرتبہ جنگ ہو چکی تھی، اس لیے امبھی یونانی فوج کی دل کھول کر مدد کر رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی طرح اس کے دشمن پورس کی فوجی قوت کمزور پڑ جائے۔ اس لیے راجہ امبھی سکندر کے سامنے سب کچھ پیش کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔

آرین کے بیان کے مطابق کہ اس وقت ٹیکسلا کے بادشاہ راجہ امبھی نے چاندی کے ۲۰۰ توڑے، جن کی مالیت سونے کے ۱۵ توڑے بنتی ہے، سکندر کو پیش کیے۔ اس وقت ایک توڑا تین ہزار سونے کے سکوں، جنہیں ورک کہا جاتا تھا، کا ہوتا تھا۔ ایک ورک کی قیمت ۵ ڈالر کے برابر لگائی جا سکتی ہے۔ اس طرح راجہ امبھی نے ۴۵ ہزار ورک جن کی مالیت ۲۲۵۰۰۰ ڈالر بنتی ہے، یونانی فوج کو دیے اور ان کے علاوہ تین ہزار بیل، دس ہزار بھیڑیں، ۷۰۰ گھوڑے، ۳۰ ہاتھی اور پانچ ہزار فوجی، ساتھ ہی اپنی خدمات اور حاضری، یہاں تک کہ دارالحکومت ٹیکسلا بھی یونانی فوج کے لیے خالی کرنے کی بھی پیش کش کی تھی۔ امبھی سکندر کو اتنی بڑی تعداد میں امداد اور فوجی دے رہا تھا، اس کی کیا وجہ ہو سکتی تھی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ راجہ امبھی کے دماغ میں دو مقصد

تھے۔ ایک تو یہ کہ سکندر کا اعتماد حاصل کر لے اور دوسرا یہ کہ یونانی فوج کی قوت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے اردگرد کے ماحول کو دشمنوں سے صاف کر لے۔ یہی وجہ تھی کہ امبھی خود پانچ ہزار فوجیوں کے ساتھ سکندر کی حفاظت پر مامور تھا۔ وہ یونانی فوج کے عقب میں ہر خطرے سے نمٹنے کے لیے تیار تھا۔ اس لیے سکندر بے فکر ہو کر اپنی تمام تر توانائی صرف اور صرف پورس اور اس کی فوج کے خلاف استعمال کر رہا تھا۔ ایک طرف سکندر ایک خفیہ راستے کی تلاش میں تھا کہ کسی طرح پورس کو کانوں کان خبر بھی نہ ہو اور دریا عبور کر لیا جائے۔ دوسری طرف مشرقی کنارے پر پورس بھی تمام تر صورتحال کو دیکھتے ہوئے اپنے ہاتھیوں سمیت یونانی فوج کی مخالف سمت پیش قدمی کرتا رہتا تھا۔ ہر رات حملے پسپائی، پیش قدمی، تعاقب اور آنکھ مچولی ہوتی رہتی تھی۔ اسی دوران جنگی جھڑپیں ہوتی رہیں اور فوجی اسلحہ سے لیس اپنی تلواریں ہاتھوں میں لیے کشتیوں پر سوار ہو کر مسلسل دریا میں گشت کرتے رہے۔

کبھی کبھی بڑھتے ہوئے جزیروں پر چڑھ جاتے اور دونوں اطراف کے فوجیوں کے درمیان مقابلہ ہوتا۔ ایک روز یونانی فوج کے کمانڈر رسماکوس اور نکانو کچھ جذباتی سپاہیوں کے ہمراہ ایک چھوٹے سے جزیرے اترے جہاں پہلے سے پورس کے فوجی موجود تھے۔ ان مقدونوی حملہ آوروں نے کچھ ہندی فوجیوں کو ہلاک کر دیا تاہم پورس کی طرف سے فوج کا ایک دستہ جب اس جزیرے پر پہنچا اور مقدونوی فوجیوں پر جوابی حملہ کیا تو کافی تعداد میں سکندر کے فوجی ہلاک ہو گئے اور ان میں کچھ جان بچا کر واپس بھاگ گئے اور اپنے پڑاؤ میں جا کر دم لیا۔ اس معرکہ کو دیکھ کر پورس کی فوج میں مسرت و شادمانی جبکہ یونانی فوج میں مایوسی پھیل گئی۔ ایک طرف دونوں کناروں پر فوجوں کے درمیان رسہ کشی اور جھڑپیں جاری رہیں تو دوسری طرف سکندر کسی طرح دریا کو عبور کرنے اور پورس پر حملہ کرنے کی منصوبہ بندی کرتا رہا۔ تقریباً ایک ماہ انتظار اور لگاتار کوششوں کے بعد فوج کے اعلیٰ عہدیداروں یعنی سی آئی ڈی افسران کی مشاورت سے ایک ایسی جگہ کا انتخاب کر لیا گیا جہاں یونانی فوج خاموشی سے دریا عبور کر سکتی تھی۔ یہ جگہ فوجی پڑاؤ سے تقریباً

۱۷ / ۱۸ میل جنوب شمال میں تھی جہاں سے دریا مغرب کی طرف رخ موڑ لیتا تھا۔ یہ مقام جلال پور کے شمال مشرق میں واقع تھا۔ یورپی مورخین کننگھم اور تارن کی تحقیق کے مطابق جلال پور کے قریب ندرنالہ جبکہ آرین بھی جلال پور کے قریب کا مقام تسلیم کرتے ہیں۔

لیکن ایبٹ اور سمتھ کا خیال ہے کہ جلال پور کے قریب منڈیالہ اور کوٹھرا گاؤں کے درمیان دریا میں کوئی موڑ نہیں، اس لیے یہ جگہ جہلم شہر سے کوئی ۱۴ / ۱۵ میل دور تھی لیکن سکندر کے ہم سفر مورخین نے لکھا ہے کہ انہوں نے اپنے کیمپ سے ۱۷ میل دور جنوب میں دریا عبور کیا۔ اگر سکندر اپنے پڑاؤ سے شمال کی طرف جا کر دریا عبور کرتا ہے تو ایبٹ اور اسمتھ کا قول درست مانا جائے اور اگر دریا جنوب جا کر عبور کیا گیا پھر تو کننگھم اور تارن، آرین کا خیال درست ہے۔ اتنا قدیم واقعہ جس کو ۲۳۰۰ سال گزر گئے ہیں، اس وقت اور آج کا دریا راستہ کافی حد تک تبدیل ہو چکا ہے۔ جو معلومات ہم تک پہنچی ہیں، وہ تمام کی تمام ان یونانی مورخین کے بیانات ہیں جو اس وقت سکندر کے ہم سفر تھے۔ وہ اجنبی ہونے کی وجہ سے علاقہ اور جگہ کے نام کا تعین نہیں کر سکتے تھے، اس لیے انہوں نے اندازہ لگا کر کہا کہ سکندر نے اپنے کیمپ سے تقریباً ۱۷ میل دور جا کر دریا عبور کیا۔ جبکہ مقامی طور پر کسی بھی ہندوستانی قدیم تحریر یا مذہبی پرانا جات میں اس جنگ سے متعلق کوئی واضح بیان نہیں ملتا۔ اسی لیے تمام مورخین اس جنگ کے موقع محل اور جنگی کارنامے، فتح اور شکست کے صحیح نتائج جاننے کیلئے مشکلات کا شکار رہے۔ اس بات کو دنیا میں عام کر دیا گیا کہ سکندر نے پورس کو شکست دی جبکہ خود یونانی مورخین کے بیانات نے واضح کر دیا کہ شکست پورس کو نہیں بلکہ سکندر کو ہوئی تھی جس کی تفصیل اس مضمون کے آخر میں آئے گی۔

آخر کار سکندر نے اس مقام کا انتخاب کر ہی لیا جہاں سے انہوں نے دریا پار کرنا تھا۔ بہت محتاط طریقے سے نقل و حمل کی منصوبہ بندی کی گئی۔ فوج کے دو حصے کیے گئے۔ ایک حصہ خاص جو انہوں نے اپنی کمان میں ساتھ لے لیا، جن میں شہسوار گھڑ سوار، تیر انداز شامل تھے۔ جبکہ دوسرا حصہ فوج تھی جس میں ۵ ہزار ہندوستانی فوجی بھی شامل تھے، وراجہ امبھی نے بطور امداد دیے

تھے۔ یونانی جرنیل پولی پرکان، الکتاس، آراکوشین کمان میں کہا گیا کہ وہ اس وقت تک دریا کے مغربی کنارے اپنے کیمپ میں موجود رہیں، جب تک کہ وہ دریا کی دوسری جانب ان دہشت کی علامت ہاتھیوں کو جنگ میں مصروف نہ کر لے۔ جب یہ تمام انتظام مکمل ہو گئے تو سکندر نے ایک مہلک جنگی چال چلی۔ اس کے افسروں میں ایک اطلوس نام کا جنرل تھا جس کی شکل وصورت اور قدوقامت بالکل سکندر کے مشابہ تھی۔ مماثلت اتنی تھی کہ وہ کسی کو بھی شبے میں ڈال سکتا تھا۔ سکندر نے بڑی چالاکی سے اطلوس کو شاہی تاج اور لباس پہننے اور سکندر کے ذاتی خیمے میں رہنے کی اجازت دے دی۔ شاہی حفاظتی دستہ جو سکندر کی حفاظت کے لیے مامور تھا۔ بدستور تعینات رہا اور شاہی جھنڈا بھی لہراتا رہا۔

باقی ماندہ فوج کو حکم دیا گیا کہ وہ نعرے بازی اور آگ کے بڑے بڑے آلاؤ جلائے رکھیں اور ہندی فوج کے سامنے اپنی نقل وحمل پہلے کی طرح جاری رکھیں تاکہ پورس اور اس کی فوج یہ سمجھے کہ یونانی فوج ابھی تک اپنے کیمپ میں موجود ہے اور اس کا دریا عبور کرنے کا کوئی ارادہ نہیں۔ دوسری طرف پورس جنگی حکمت عملی اور اپنی تمام تمام تر توانائی اس بات پر مرکوز کیے ہوئے تھا کہ سکندر کی فوج کسی طرح آسانی سے دریا عبور نہ کر سکے۔ پورس یہ چاہتا تھا کہ یونانی فوج جس وقت دریا عبور کر رہی ہو، عین اسی وقت ہندی فوج پر ہلہ بول دیا جائے تاکہ وہ جنگ کے لیے اپنی تیاری مکمل نہ کر سکے۔

اسی حکمت عملی پر چلتے ہوئے پورس نے اپنے بیٹے اور ایک دوسرے کمانڈر کو خاص فوجی دستوں کے ساتھ یہ ذمہ داری سونپ رکھی تھی کہ وہ دریا کی مکمل نگرانی کریں تاکہ کہیں سے بھی سکندر کی فوج دریا آسانی سے پار نہ کر سکے۔ دوسری طرف مقدونوی کمانڈر مسلسل اس کوشش میں تھا کہ موقع ملنے پر وہ کسی طرح خاموشی سے دریا عبور کر کے دشمن فوج پر حملہ کر دے۔ ایک رات جب بارش کے ساتھ تیز آندھی چل رہی تھی، آسمانی بجلی کی چمک اور دل دہلا دینے والی کڑک دار آوازیں ایسے خوفناک مناظر جیسے پہاڑیاں اور جنگل دہشت ناک انداز میں گونج رہے تھے، اس سیاہ رات

میں سکندر نے اپنی فوج کو دریا عبور کرنے کا حکم دیا۔ مقدونوی فوج نے ایسی حکمت عملی ترتیب دی کہ ہر ۱۰۰ سے ۵۰ گز کے فاصلے پر ایک ہرکارہ کھڑا کیا گیا جو ایک دوسرے کو دیکھ سکتے تھے۔ یہ فوج کے دونوں گروپ کے درمیان پیغام رسانی کا کام سرانجام دے رہے تھے۔ سکندر اپنی آدھی فوج کے ساتھ آہستہ آہستہ چلتا ہوا آخر کار ایک ایسے مقام تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا جہاں سے دریا میں موڑ تھا اور ایک دریائی نالہ اس دریا سے الگ ہو رہا تھا، اس کی وجہ سے ایک تو دریا کا پاٹ کم ہو جاتا تھا، دوسرا دریا میں پانی بھی کم تھا۔ رات کے تیسرے پہر جب بارش تھم چکی تھی اور بادلوں نے آسمان کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا، سکندر نے اپنی فوج کے کمانڈروں کو حکم دیا کہ دریا یہاں سے پار کیا جائے۔

یونانی تاریخ دان ارسطو بولس کے بیان کے مطابق مقدونوی فوج وہ کشتیاں جو ٹکڑے ٹکڑے کر کے ساتھ لائی تھی اور ان کو دوبارہ جوڑ کر کناروں پر موجود درختوں میں چھپا رکھا تھا، کے ذریعے دریا عبور کرنا شروع کر دیا۔ گھڑسواروں نے اپنے گھوڑوں کے ذریعے جبکہ باقی فوج اور اسلحہ ان کشتیوں پر لاد کر اپنا سفر شروع کیا۔ سکندر خود ایک بڑی کشتی پر سوار تھا جو اس قافلے کے آگے آگے چل رہی تھی۔ تاہم اس علاقے سے لاعلمی کی وجہ سے مقدونوی فوج اپنے ہدف کی بجائے ایک ایسے مقام تک جا پہنچی جہاں ایک جزیرے کی وجہ سے دریا کا پاٹ بہت چوڑا اور وسیع ہوتا چلا جاتا تھا جبکہ جزیرے کے اردگرد پانی بھی گہرا تھا۔ گھڑسوار اپنے گھوڑوں کی گردن کے سوا پانی میں ڈوبے ہوئے تھے جبکہ تیراک فوج بھی گردن تک پانی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ دوسری طرف بارش کی وجہ سے اوپر کی طرف سے آنے والے پانی کے ریلے اتنے تیز تھے کہ یونانی فوج کے لیے سنبھلنا مشکل تھا۔ اس صورت حال میں بہت سارے فوجی اور ساز و سامان پانی میں بہہ گیا۔ تمام یونانی فوج حوصلہ ہار گئی۔ خود سکندر بھی اس موقع پر اتنا بے چین ہوا کہ اس نے اپنے اجداد کے نام سے دعائیہ کلمات کہنا شروع کر دیے کہ "اے اہلِ ایتھنیز! کیا تم یقین کرو گے کہ میں نے تمہاری وفاداری اور خوشی کے لیے ان خطرناک راستوں سے سفر اختیار کیا ہوا ہے، آپ ہی

ہماری مدد کریں۔" آخرکار بڑی مشکل اور کئی جانوں کے ضائع ہونے کے بعد سکندر اپنی فوج کے ہمراہ دریا عبور کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ سب سے پہلا شخص سکندر تھا جس نے دریا کے مشرقی کنارے پر قدم رکھا۔ یہ کری کا میدان تھا، اس کے مشرق میں چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں تھیں اور یہ ۴ / ۵ میل تک پھیلا ہوا تھا۔ یہ وہ مقام تھا جہاں آج کل سروال، بکڑال اور سکھ چین، نکایا کے گاؤں آباد ہیں۔ دریا پار کرنے بعد سکندر صفیں درست کرنے، توپخانے اور گھڑسوار دستوں کے ساتھ آگے بڑھنے کی تیاریوں میں مصروف ہی تھا، یعنی ابھی سکندر کی فوجیں سنبھلنے نہ پائی تھیں کہ پورس کے بیٹے کی قیادت میں پنجابی فوج کے ایک دستے نے سکندر کا راستہ روک لیا۔ یونانی مورخ ارسطوبولس جو سکندر کے ساتھ تھا، کہتا ہے کہ پورس کے بیٹے نے سکندر پر دھاوا بول دیا۔ فوج کے اس دستہ میں ۶۰ بگھیاں شامل تھیں جبکہ تولومی کا بیان ہے کہ ۱۲۰ بگھیاں اور دو ہزار فوجی شامل تھے۔

میدان جنگ:

ہم نے یونانی اور یورپی مورخین کے بیانات کو تفصیل کے ساتھ تحریر کیا ہے جس سے یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ سکندر نے اپنی کچھ فوج کے ساتھ دریا عبور کیا۔ یونانی فوج دریا کے مشرقی کنارے پر اتری ہی تھی کہ پورس کے بیٹے نے دو ہزار گھڑسواروں کے ہمراہ سکندر کی فوج پر حملہ کر دیا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ مقدونوی کمانڈر اپنی آدھی فوج کے ساتھ خوفناک سیاہ رات اور بارش کے ساتھ ساتھ بپھرے ہوئے طوفان میں دریا عبور کرنے کے لیے اپنے کیمپ سے بڑے خفیہ طریقے سے نکلے اور اس مقام سے جہاں سکندر اور پورس کی فوجیں مدمقابل خیمہ زن تھی، تقریباً ۱۷ میل دور، اس سے سفر کم بھی ہوسکتا ہے، جہاں دریا بالکل دونوں اطراف سے گھنے درختوں میں گِھرا ہوا تھا، پہنچے۔ رات کے تیسرے پہر یعنی صبح صادق سے کچھ دیر قبل، مقدونوی فوج نے دریا عبور کرنا شروع کیا اور صبح ہونے تک وہ مشرقی کنارے پر پہنچ گئے۔ اس بات کو تو تمام مغربی تاریخ دان بیان کرتے ہیں اور ہمیں بھی یونانی فوج کی حکمت عملی اور خفیہ کارناموں کو ضرور تسلیم کرنا

پڑتا ہے کہ سکندر نے بڑے احسن انداز سے یہ حکمت عملی ترتیب دی لیکن میرا سوال یہ ہے کہ ایک فاتحِ عالم جس نے اپنا سفر مقدونیہ سے شروع کیا تھا اور پورے ایشیا، کوچک اور ایرانی شہنشاہ دارا جیسے طاقتور حکمران کو اپنے پیروں تلے روندتا ہوا دریائے جہلم کے مشرقی کنارے پہنچا تھا، وہ کون سے طاقتور ہاتھ تھے جنہوں نے اس فاتحِ عالم کو اس طرح پریشان کیا کہ وہ جنگ بندی کرنے پر مجبور ہو گیا اور اسے اپنے تمام مفتوحہ علاقے اس کے حوالے کرنے کا اعلان کرنا پڑا۔ مجھے بڑا افسوس ہے ہندو پاک کے تاریخ دانوں اور مورخین پر کہ انہوں نے اس دھرتی اور اپنی مٹی کا حقِ نمک ادا نہیں کیا بلکہ انہوں نے ان یونانی تاریخ دانوں کے بیانات کو صحیح مان کر اس بات کی تصدیق کر دی کہ جہلم کی جنگ میں فتح سکندر کو ہوئی اور راجہ پورس گرفتار ہو کر مقدونوی کمانڈر کے سامنے پیش ہوا۔ حالانکہ یہ اس فاتح کے خلاف بہت بڑا پروپیگنڈا تھا جو اپنے وطن، اپنی ریاست، دھرتی اور علاقے کی عزت اور وقار کی خاطر اپنی جان دینے تک تیار ہو گیا۔ فاتحِ عالم کو دریا جہلم کے مغربی کنارے سے لے کر کابل، ایران، ایشیا، کوچک، مصر اور مقدونیہ تک مکمل سپورٹ اور حمایت حاصل تھی۔

دریا جہلم کی دوسری جانب موجود ہندوستانی حکمران پورس کے لیے ہر طرف سے امداد کے راستے بھی بند کر دیے گئے تھے۔ یہاں تک کہ پورس کے وہ ساتھی جو اس سے پہلے وعدہ کر رہے تھے کہ اگر آپ فاتحِ عالم کے خلاف مزاحمت کرتے ہیں تو ہم آپ کے ساتھ ہیں، وہ بھی جنگ کے وقت وعدہ خلافی کر کے مقدونوی فوج کی مدد کرتے رہے۔ ان تمام حالات کے باوجود یہ عظیم لیڈر دشمن فوج کے سامنے سیسہ پلائی دیوار کی مانند پرعزم انداز سے ڈٹا رہا اور دشمن فوج کی ایک ایک حرکت کو بڑے احسن انداز سے دیکھتا رہا۔ ہم نے ارسطوبولس کے بیان کو دیکھا جس میں انہوں نے کہا کہ پورس کا بیٹا فوجی ٹیم کے ساتھ جاسوسی کے لیے گشت کر رہا تھا کہ حادثاتی طور پر سکندر کی فوج سے جا ٹکرایا۔ میرے خیال کے مطابق پورس نے مقدونوی فوج کے اس دستہ کے مقابلے میں باقاعدہ جنگی فوجی ٹیم روانہ کی تھی جس کی قیادت اس کا بیٹا کر رہا تھا۔ اس وقت دریا کے اندر

موجود پورس کے فوجی نوجوانوں نے خبر دی ہوگی کہ جب سکندر کی فوج کا ایک حصہ اپنے کیمپ سے روانہ ہوا تھا۔ ہندی فوج کے جاسوس اس مقدونوی فوجی دستہ کی مکمل نگرانی کرتے رہے ہوں گے اور دشمن فوج کی تمام حرکات کو دیکھتے رہے ہوں گے۔ اس کی اطلاع لمحہ بہ لمحہ پورس کو پہنچتی رہی ہو گی۔ جب پورس کو یہ اطلاع ملی ہوگی کہ یونانی فوج کا ایک دستہ دریا پار کرنے کی کوشش میں مغربی کنارے کے ساتھ ساتھ چل رہا ہے تو ضرور پورس نے دشمن کے مقابلے کے لیے فوجی دستہ روانہ کیا ہوگا جو تمام ضروری اسلحہ سے لیس تھا۔ ہاں ایک غلطی ہندوستانیوں سے ضرور ہوئی کہ وہ یہ اندازہ نہ لگا سکے کہ کیا خود سکندر کیمپ میں ہے؟ یا اس دستہ میں شامل ہے جو دریا عبور کرنے کی کوشش کر رہا ہے؟ ہندی فوج نے یہ سمجھا ہوگا کہ سکندر خود تو پڑاؤ میں موجود ہے اور اس کا جنرل کچھ فوج کے ساتھ دریا عبور کر رہا ہے۔ مورخین کے بیان کے مطابق ایسا پہلے کئی مرتبہ کیا گیا تھا جس میں مقدونوی فوج ناکام ہوتی رہی تھی۔ میرے خیال میں پورس سے ایک بڑی غلطی یہ ہوئی تھی کہ وہ یہ نہ سمجھ سکا کہ یونانی بادشاہ اسی دستہ میں شامل ہے۔

اگر پورس کو یہ بات معلوم ہو جاتی کہ سکندر خود اپنی فوج کے آدھے حصہ کے ساتھ دریا پار کر رہا ہے تو پھر پورس بھی خود اچھی خاصی فوجی قوت کے ساتھ سکندر کے مقابلے کے لیے جاتا۔ آپ جنگی تاریخ کا مطالعہ کر لیں۔ جنگ میں اصل ہدف فوج کا سپہ سالار یا حاکم ہوتا ہے، جیسا کہ آپ نے دیکھا ایرانی فوج کو شکست کیوں ہوئی؟ دارا خود دورانِ جنگ میدان سے غائب ہو گیا تو اس کی فوج نے سکندر کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔ اس لیے اگر پورس کو سکندر کے بارے میں یقین ہو جاتا تو پورس پوری طاقت کے ساتھ حملہ کرتا۔ اس موقع پر ممکن ہے کہ سکندر کا کام تمام کر دیتا لیکن اس کو اطلاع مقدونوی فوج کے ایک دستے کی تھی، اس لیے اس نے ایک کمزور حملہ کیا۔ لیکن یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ پورس کا بیٹا سکندر کے سامنے اچانک نمودار ہوا ہو۔ دریا کے دونوں کناروں پر ایک جیسی حکمت عملی تیار کی گئی تھی۔ سکندر اگر اس خیال میں تھا کہ وہ ہندی فوج کی لاعلمی میں دریا عبور کر لے گا تو یہ اس کی خام خیالی تھی۔ ادھر پورس کے فوجی دستے سکندر کے تعاقب میں

ان کے ساتھ ساتھ پیش قدمی کر رہے تھے۔ جونہی سکندر اور اس کی فوج نے دریا عبور کر کے خشکی پر قدم رکھنا چاہا، آگے پورس کے بیٹے نے دشمن فوج پر حملہ کر دیا۔ ہم یہ پہلے بیان کر چکے ہیں کہ ہندوستانی فوج سکندر کی فوجی طاقت کا صحیح اندازہ نہ لگا سکی تھی، اس لیے جلد بازی میں مختصر فوجی قوت کے ساتھ حملہ کیا گیا۔ پھر بھی ہندوستانی سپاہیوں نے بڑی دلیری کے ساتھ دشمن کا مقابلہ کیا اور مقدونوی فوج کو کافی نقصان پہنچایا۔

حملہ کی شدت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ تولومی کا بیان ہے کہ اس حملے میں سکندر خود بھی زخمی ہو گیا اور اس کا گھوڑا ابوکفالس بھی ہلاک ہو گیا۔ مورخ جٹسن کا بیان ہے کہ جب سکندر کا گھوڑا منہ کے بل زمین پر آ گرا، اس وقت اگر فوراً سکندر کے معاونین اور محافظ دستہ اس کی طرف نہ لپکتا تو ممکن ہے کہ سکندر گھوڑے کی طرح خود بھی ہلاک ہو جاتا۔ سکندر نے اس اچانک حملے میں شکست کے پیشِ نظر اپنی فوج کو پیچھے ہٹنے کا حکم دیا۔ مقدونوی دستوں نے دریا کے کنارے گھنے درختوں کی آڑ میں خود کو منظم کیا۔ سکندر نے فوج کی صفوں کو درست کیا اور تیر اندازوں اور گھڑ سواروں کو دوبارہ پیش قدمی کا حکم دیا۔ پورس کے دستوں کو دو طرح کی مشکلات درپیش تھیں۔ ایک تو یہ کہ وہ دشمن کی نسبت تعداد میں کم تھے جبکہ دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ بارش کی وجہ سے پانی خاصا جمع ہو چکا تھا جس سے زمین چکنی ہو گئی تھی۔ ہندی فوج کی بگھیاں کو چلنا مشکل ہو گیا تھا۔ یعنی ان کے لیے دشمن کا مقابلہ ناممکن ہو کر رہ گیا تھا۔ پورس کے فوجی سکندری فوج کے تیروں سے بچنے کے لیے ان بگھیوں کی آڑ میں چھپ کر مقدونوی فوج پر تیر برسا رہے تھے۔ تیر اندازی کا یہ سلسلہ ابھی تک جاری تھا۔ اسی دوران راجہ پورس کو اطلاع کر دی گئی کہ سکندر خود اپنی آدھی فوج کے ساتھ دریا پار کر چکا ہے اور دونوں فوجی دستوں کے درمیان جھڑپیں جاری ہیں۔

مورخ کیوریٹس کا بیان ہے کہ پورس کو جب یہ اطلاع ہوئی تو اس نے فوراً اپنے بھائی ہگاس کو چار ہزار گھڑ سوار اور ایک سو بگھیوں کے ساتھ روانہ کیا اور دشمن فوج کو گھیرے میں لینے کا حکم دیا۔ بعد میں خود پورس بھی باقی ماندہ فوج کی صف بندی کرتا ہوا میدانِ جنگ کی طرف تیزی سے

روانہ ہوا۔ مقدونوی فوج جو ابھی تک دریا کے پار موجود تھی، اس کے مختلف سمت ایک مختصر فوج چھوڑی جس میں پانچ سو سپاہی اور ۸۵ ہاتھی تھے۔آرین کی تحقیق کے مطابق پورس جس فوجی دستہ کی کمان کر رہا تھا، اس میں چار ہزار گھڑسوار، تین سو بگھیاں، دوسو ہاتھی اور تیس پیادے شامل تھے۔ڈالیوڈورس کہتا ہے کہ ایک ہزار گھڑسوار، ۵۰ پیادے اور ۱۳۰ بگھیاں تھیں جبکہ پلوترک کا بیان ہے کہ پورس کی فوج میں دو ہزار گھڑسوار اور بیس ہزار پیادے شامل تھے۔ہم ان مورخین کی آرا کو تسلیم کرتے ہیں کہ پورس کی جو فوج تھی، وہ اس کے ہمراہ تھی۔ جب میدانِ جنگ میں پہنچا تو اس وقت دونوں فوجوں کے درمیان لڑائی جاری تھی۔لڑائی میں دونوں طرف سے نقصان ہو رہا تھا لیکن ہندی فوجی دستے مقدونوی فوج کے دباؤ میں آ رہے تھے۔اس وقت میدانِ جنگ کے حالات اچانک تبدیل ہو گئے جب پورس اپنی باقی ماندہ فوج کے ساتھ نمودار ہوا۔ یونانی فوج پورس کے لشکر کو دیکھ کر سوچ میں پڑ گئی کہ ہر طرف دیہکل ہاتھیوں، بڑی بڑی بگھیوں اور شہسواروں کے علاوہ ویشنو گھنیش دیوتا کی تصویر والے جنگی پرچم لہرا رہے تھے۔ یوں ہندی فوج ایک قلعہ نما شہر کا منظر پیش کر رہی تھی۔ کیوریٹس اور پولیا نوس دونوں کا بیان ہے کہ یونانی صرف ان وحشی ہاتھیوں کو نہیں بلکہ خود پورس کو دیکھ کر بھی ششدر رہ گئے کیونکہ پورس ایک لمبے قد کا آدمی تھا۔

ہندی فوج کی جب صف بندی کی گئی تو اس میں سب سے آگے ۸۰ ہاتھی تیس تیس گز کے فاصلے پر کھڑے کیے گئے اور ہاتھیوں کے پیچھے آتشیں ہتھیاروں سے لیس سپاہی تعینات کیے گئے۔مورخ تارن کا بیان ہے کہ جب ہندی فوج کی صف بندی مکمل کی گئی تو پورس ایک طویل قامت اور عظیم ہاتھی پر سوار تھا جس کی وجہ سے وہ تمام لشکر سے نمایاں نظر آ رہا تھا۔اسے دیکھ کر یونانی فوجیوں میں عجیب سی ہیبت پیدا ہو گئی جو اس سے پہلے بائیں جانب ہتھیار سنبھالے جنگ کے لیے تیار کھڑے تھے۔اب مجبوراً ان کو پیچھے ہٹنا پڑا۔سکندر جو خود بھی دشمن فوج کا بغور جائزہ لے رہا تھا، پریشان حال فوج کی اگلی صفوں میں پہنچا اور اس نے یونانی فوج سے خطاب کرتے ہوئے یہ تاریخی جملہ کہا کہ" ہمارے سامنے ایک ایسا خطرہ موجود ہے جو ہماری ہمت و حوصلے کے

شایانِ شان ہے، ہمیں وحشی ہاتھیوں کے ساتھ ساتھ غیر معمولی دلیری کے حامل فوجیوں سے ایک ساتھ مقابلہ کرنا ہے۔"

سکندر کے اس خطاب کے بعد یونانیوں نے اپنی صفیں درست کیں۔ سکندر نے لڑائی کے لیے ایک سادہ حکمت عملی اختیار کی اور لشکر کے دائیں اور بائیں جانب گھڑسواروں کو تعینات کیا۔ درمیان میں برق رفتار دستہ جسے یونانی ہپاسپٹس کہتے تھے اور زرہ بند فالینکس کھڑے کیے گئے تھے اور لشکر کے اردگرد ہتھیاروں سے لیس سپاہی تعینات کیے گئے۔ دریا کی دوسری جانب جو پڑاؤ میں یونانی لشکر موجود تھا، اس کو حکم دیا گیا کہ جب تک وہ ان ہاتھیوں کو جو دہشت کی علامت سمجھے جاتے تھے، جنگ میں مصروف نہ کرلیں، اس وقت تک آپ انتظار کریں۔ جونہی ہندی فوج اور ہاتھی مصروف جنگ ہو جائیں تو آپ فوراً عقب سے حملہ کریں گے۔ سکندر نے اپنی فوج کے دو حصے کیے۔ ایک کی کمان اس نے خود سنبھالی اور دوسرے کی جنرل کوہنوس کے سپرد کی معلوم۔ ایسا ہوتا ہے کہ یونانی فوج میں سکندر کا اہم ترین اور پر اعتماد جرنل کوہنوس ہی تھا۔ سکندر نے گھڑسواروں اور تیراندازوں کی بڑی تعداد اپنے ساتھ رکھی اور خود ہندی فوج پر سامنے حملہ آور ہوا جبکہ کوہنوس کے پاس پیادہ فوج زیادہ، شہسوار کم تھے، اس لیے اس کو حکم دیا گیا کہ لڑائی کے دوران دشمن فوج پر عقب سے حملہ کرنا ہے جبکہ ان کے سامنے پورس فوج بھی مکمل ہو چکی تھی۔

جنگ کا دوسرا حصہ:

جب دونوں اطراف سے جنگی حکمت عملی اور فوجی تیاری مکمل ہوگئی تو اس موقع پر جنگ سے پہلے راجہ پورس نے سکندر کو اپنے حوالے کرنے اور گرفتاری کا حکم دیا کیونکہ وہی اس کا ذاتی دشمن تھا۔ مغربی مورخ جٹسن کا بیان ہے کہ سکندر نے اس مطالبے کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے فوج کو عام حملے کا حکم دیا۔ مورخ تارن کا بھی بیان ہے کہ جب دونوں طرف سے فوجی تیاریاں مکمل ہوگئی تو پورس نے سکندر کو گرفتاری دینے کا حکم دیا یعنی حوالگی کا مطالبہ کیا۔ ان حالات سے پوزیشن واضح ہو جاتی ہے کہ پورس اپنی فوجی قوت پر بھروسا کیے ہوئے تھا، نہ کہ کسی دباؤ میں تھا۔ اس نے یونانی

فوج کو شکست دینے کا تہیہ کر رکھا تھا۔ سکندر نے کوئی موقع ضائع کیے بغیر فوج کو حملہ کرنے کا اشارہ کیا تو یونانی تیر انداز ہندی فوج پر تیزی سے حملہ آور ہوئے۔ سکندر خود شہسواروں کی کمان کر رہا تھا۔ تابڑ توڑ حملے شروع کر دیے گئے۔ پورس کے سپاہی ابھی تک اپنی صفوں میں تھے، اس لیے اچانک حملے کی وجہ سے پورس کی فوج دو حصوں میں بٹ گئی۔ مغربی مورخین، آرین، جٹسن اور ڈایو ڈورس کے بیانات کو بدھا پرکاش نے بڑی تفصیل کے ساتھ تحریر کیا ہے کہ یونانی فوج کے پہلے حملے میں ہندی فوج کا کافی جانی نقصان ہوا۔ اس وقت پورس کی فوج دو مشکلوں میں پھنس گئی۔ ایک تو یونانی فوج کا حملہ اچانک اور اتنا شدید تھا کہ جسے روکنا مشکل تھا۔ پورس کا ایک اہم ہتھیار بگھیاں تھیں جو بارش کے پانی اور کیچڑ کی وجہ سے اس حملے کو روکنے میں ناکام ہو رہی تھیں۔ اس موقع پر ہندی فوج کو مجبوراً پیچھے ہٹنا پڑا اور شہسوار دستوں کو دشمن فوج کا مقابلہ کرنے کا حکم دیا گیا۔ پورس کے گھڑ سوار دستوں نے دشمن فوج پر چاروں اطراف سے حملہ کیا۔ یونانی فوج کا دستہ جو سکندر کی کمان میں تھا، ہندی سپاہیوں کے گھیرے میں آ گیا اور اس کو کافی جانی نقصان پہنچا۔ اس حملے میں سکندر کے کئی سپاہی اور گھوڑے ہلاک ہو گئے لیکن پورس کے فوجی اس مشکل حالت میں پھنس گئے جب یونانی فوج کے جرنل کوہنوس نے پورس کی فوج پر عقب سے حملہ کر دیا۔ یونانی فوج ہندوستانی فوج کی صفوں میں داخل ہو گئی۔ اس سے پورس کا لشکر دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ سامنے سے سکندر نے دھاوا بول دیا جبکہ عقب سے کوہنوس نے شدید حملہ کر دیا، اب پورس کے سپاہی اپنا دفاع کرنے پر مجبور ہو گئے۔

گھڑ سواروں نے بھاگ کر بگھیاں اور ہاتھیوں کے پیچھے اور درمیان میں پناہ لی۔ اب پورس نے پیادہ فوج کو کاروائی کرنے کا حکم دیا لیکن یونانی شہسواروں کو غضبناک حملہ کرتے اور اپنے سپاہیوں کو ہلاک ہوتے دیکھ کر پورس نے فوراً اپنا اہم ہتھیار آزمانے کا فیصلہ کیا اور ہاتھیوں کی پیش قدمی کا حکم دیا۔ دیوہیکل وحشی ہاتھی چیختے چنگھاڑتے ہوئے آگے بڑھے اور یونانی گھوڑوں کو اس طرح دہشت زدہ کر دیا کہ گھوڑے میدانِ جنگ سے بھاگنے پر مجبور ہو گئے۔ ہاتھیوں کے حملوں

سے میدانِ جنگ کا نقشہ تبدیل ہونے لگا تو سکندر نے دوبارہ اپنی فوج منظم کی۔ ایک بار پھر یونانی گھڑسوار حریف فوج پر حملہ آور ہوئے لیکن ہاتھی ایسی بلائیں تھیں جن کا توڑ یونانیوں کے پاس نہیں تھا۔ اب گھمسان کی سی لڑائی ہو رہی تھی۔ ہر طرف لاشیں ہی لاشیں پڑی تھیں۔ دوست دشمن کی پہچان مشکل ہو رہی تھی۔ ان ہاتھیوں نے یونانی لشکر میں خوف و ہراس پھیلا دیا۔ ان کی دل دہلا دینے والی چنگھاڑوں نے صرف گھوڑوں، بلکہ یونانی فوجیوں کو بھی اس طرح خوف زدہ کر دیا کہ وہ صفوں کو توڑ توڑ کر بھاگنے لگے۔ وہ یونانی فوج جو تھوڑی دیر پہلے فتح مندی کے نعرے لگا رہے تھے اب ان ہاتھیوں کے حملوں سے بچنے کے لیے گھنے درختوں میں چھپنے کی جگہ تلاش کر رہی تھی۔

ان بدلتے ہوئے حالات کو دیکھ کر سکندر نے اپنی اگریانی اور تھراشین بٹالین کو ہاتھیوں کے مقابلے کے لیے میدانِ جنگ میں اترنے کا حکم دیا۔ یہ فوج کا پیدل دستہ جو ہلکے ہتھیاروں سے مسلح تھا، دست بدست جنگ میں مہارت رکھتا تھا۔ اس نے ہاتھیوں اور مہاوتوں پر تیر کی بارش کر دی۔ مورخ ڈایوڈورس حملے کے بارے تحریر کرتا ہے کہ یونانی سپاہیوں نے مہاوتوں کے ساتھ ساتھ ہاتھیوں کو بھی زخمی کر دیا۔ ان زخموں کی وجہ سے ہاتھی غضبناک ہو کر یونانیوں کو پاؤں تلے روندتے ہوئے ان کا کچومر نکالنے لگے۔ زیادہ خوفناک صورت یونانیوں کے لیے اس وقت پیش آئی جب یہ ہاتھی یونانی سپاہیوں کو سونڈ میں لے کر اوپر بیٹھے مہاوتوں کے آگے پھینک دیتے۔ کئی مورخین نے جنگ کی اس صورت حال کے متعلق لکھا ہے کہ اب یونانی فوج حملہ کرتے اور جب ہاتھی ان کی طرف بڑھتے تو وہ بھاگ کر قریبی جنگلات میں پناہ لیتے۔ اس صورتحال کو دیکھ کر سکندر نے گھوڑوں پر موجود آتشگیر مادے کو آگ لگا کر ان ہاتھیوں کے بیچ میں چھوڑ دیا۔

گھوڑے آگ کی وجہ سے ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ ان گھوڑوں کے ساتھ ساتھ وحشی ہاتھی بھی ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ یونانیوں نے بھاری کلہاڑوں اور خم دار تلواروں سے ہاتھیوں کے پیروں اور سونڈوں پر کاری ضربیں لگائیں۔ مورخین کا بیان ہے کہ اس موقع پر زخمی جانور بلبلا اٹھے مہاوتوں کے لیے انہیں کنٹرول کرنا مشکل ہو گیا۔ زخمی ہاتھی پلٹے اور انہوں نے خود اپنی فوج کے ہی

کچھ سپاہیوں کو کچل کر رکھ دیا۔ اس صورتحال سے پورس اور اس کے جرنیلوں میں مایوسی پیدا ہو گئی۔ ان بدلتے ہوئے حالات کو دیکھ کر حاضر دماغی اور تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے پورس نے چالیس ہاتھیوں کا ایک دستہ اپنے ہاتھ میں لیا۔ ڈایوڈورس تفصیل سے لکھتا ہے جسے بدھا پرکاش نے اپنی کتاب میں تحریر کیا ہے کہ پورس، جو ایک عظیم الشان ہاتھی پر سوار تھا، نئے حوصلے اور ہمت کے ساتھ دشمن فوج پر ٹوٹ پڑا۔ مورخ پلوترک کا بیان ہے کہ پورس کی طاقت تمام فوجیوں سے زیادہ تھی۔ اس کا قد اور زرہ بند چھاتی جو عام ہندستانی فوجیوں سے دگنی تھی، وہ جو نیزہ پھینکتا، یونانیوں کو چیرتا چلا جاتا۔ اس موقع پر میدانِ جنگ کا جو نقشہ کیوریٹس نے بیان کیا ہے اور آرین بھی اس کی تائید کرتے ہیں کہ میدانِ جنگ میں دہشت ناک ہاتھی جھوم رہے تھے، مہاوتوں نے ہاتھیوں سے اتر کر ایک طرف پناہ لے لی تھی، سکندر کے تمام شہسوار دستے اب ایک بٹالین میں جمع ہو گئے تھے اور ہاتھیوں پر ہلکے ہتھیاروں سے حملہ کرتے لیکن جب ہاتھی ان پر ٹوٹ پڑتے تو یونانی بھاگ کر جنگل میں پناہ لیتے۔ بے قابو ہاتھی ادھر ادھر جھوم رہے تھے۔ وہ سامنے آنے والے ہر شخص کو روند ڈالتے یا سونڈ میں جکڑ کر ہلاک کر دیتے۔ اسی دوران جرنل کراترس دریا عبور کر کے لڑائی میں شامل ہو گیا تھا۔

اس نے دشمن فوج کو کافی جانی نقصان پہنچایا۔ آٹھ گھنٹے جاری رہنے والی لڑائی میں دونوں اطراف سے کافی جانی و مالی نقصان ہوا۔ آرین اور کیوریٹس کے بیان کے مطابق اب پورس بھی زخمی ہو چکا تھا۔ اس کے دائیں کندھے پر گہرا زخم آیا تھا جبکہ ہاتھی کے جسم میں بھی کافی تیر پیوست تھے۔ مہاوتوں نے پورس کو نیچے اتار کر آرام کرنے کا مشورہ دیا جبکہ دوسری طرف خود سکندر بھی زخموں سے چور چور ہو چکا تھا۔ اس کا گھوڑا زخموں کی وجہ سے نیچے گر گیا تھا۔ پورے میدانِ جنگ میں وحشی ہاتھی دہشت ناک حالت میں پھر رہے تھے۔ جس طرف ان کا منہ آتا بڑھتے جاتے۔ انسان حیوان جو بھی ان کے سامنے آتا، وہ اس کو روند ڈالتے۔ ان کو دوست دشمن کی کوئی پہچان نہ رہی تھی۔ دونوں فوجوں کے درمیان ایک فرق ضرور تھا، وہ یہ تھا کہ پورس کے سپاہی میدانِ جنگ

ہی میں بگھیوں کے پیچھے پناہ لیے ہوئے تھے۔ایک تو وہ دشمن فوج کے تیروں سے بچ جاتے، دوسرا ان ہاتھیوں کے حملے سے بچ جاتے تھے جو بے ہوشی کی حالت میں پورے میدان جنگ میں جھوم رہے تھے۔ یونانی فوجی ہاتھیوں سے بچ کر حملہ کرتے لیکن جب یہ وحشی ہاتھی ان کی طرف لپکتے تو وہ بھاگ کر جنگل میں پناہ لینے پر مجبور ہو جاتے۔صبح سے شروع ہونے والی لڑائی مسلسل تیسرے پہر جاری تھی۔دونوں طرف کی فوجوں کا یقیناً اتنا نقصان ہوا کہ جس کا کوئی حساب نہیں لگایا جا سکتا۔ سپاہیوں کے علاوہ یونانی فوج کے اکثر گھوڑے ہلاک ہو چکے تھے جبکہ پورس اور سکندر خود بھی شدید زخمی تھے۔مورخ آرین اور تارن دونوں کا خیال ہے کہ سکندر کی فوج کا جانی نقصان زیادہ ہوا تھا۔

سکندر کے اس وقت حالات خراب ہو گئے جب یونانی سپاہیوں نے لڑنے سے انکار کر دیا۔ حبشی (ایتھوپیائی) عہد نامے سیوڈو کالستھنز میں مغربی مورخ بج کی تحقیق کے مطابق کہ یونانی فوجیوں نے ایک موقع پر یہ بھی کہہ دیا کہ ہم ہتھیار پھینک کر پورس سے جا ملیں گے۔اسی مورخ نے مزید لکھا ہے کہ سکندر کے اکثر گھوڑے تہِ تیغ کر دیے گئے تھے۔ یونانی فوجی روتے اور کتوں کی طرح بین کرتے تھے۔سکندر ان حالات کو دیکھ کر اپنے سپاہیوں کے درمیان آ کھڑا ہوا۔اس وقت سکندر خود بھی ذہنی طور پر ٹوٹ پھوٹ کا شکار اور پریشان تھا کیونکہ یونانی فوج میں مایوسی پھیل گئی تھی۔

فوج کا ایک بڑا حصہ برباد ہو گیا تھا۔ باقی فوج نے اکٹھے ہو کر لڑنے سے انکار کر دیا۔ کچھ مورخین کا خیال ہے کہ یونانی فوج کا ایک گروپ جس میں یونانی ایتھنیز اور ایرانی شامل تھے، بغاوت کرنے اور میدانِ جنگ سے بھاگنے کی تیاری کر رہے تھے۔ان حالات کو دیکھتے ہوئے سکندر کے وفادار جرنیلوں نے جنگ روکنے اور امن معاہدہ کرنے کا مشورہ دیا۔سکندر نے جنگ کا پانسہ پلٹتے دیکھ کر فوراً جنگ بند کرنے کا حکم دیا اور اپنی فوج کی صفوں سے باہر نکل کر بلند آواز میں ہندی فوج اور بادشاہ کے نام پیغام دیا کہ "اے پورس شہنشاہ ہند! سنو میں تمہاری قوت اور بہادری

کا اندازہ لگا چکا ہوں۔اب میرا دل شکست خوردہ ہے۔ مجھے اپنی تھکن کا احساس ہے۔ میں خود اپنی زندگی ختم کرنے کی کیفیت سے دوچار ہوں۔ میں اپنے سپاہیوں کو اس پر مجبور نہیں کرتا کہ وہ اپنی زندگیاں ہمارے لیے ختم کریں۔" حوالہ بدھا پرکاش صفحہ نمبر ۱۰۴ / ۱۰۵ جبکہ مورخ پلوترک بھی بیان کرتا ہے کہ سکندر لڑائی بند کرنے اور صلح کا خواہش مند تھا۔ پورس قطعی طور پر یونانیوں سے بات چیت کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔سکندر اور اس کی فوج مایوس ہو چکی تھی لیکن دوسری جانب پورس خود بھی شدید زخمی تھا اور اس کی فوج کے بھی کافی سپاہی ہلاک ہو چکے تھے۔ ہندی فوج کی بھی خواہش تھی کہ کسی طرح لڑائی بند ہو جائے۔

جنگ بندی:

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ لڑائی بند کیسے ہوئی اور کیوں ہوئی؟ اس سوال کے جواب کے لیے ہم اپنا نقطہ نظر یہ پیش کرنے سے پہلے ان مغربی مورخین کے بیانات کا مطالعہ کرتے ہیں جنہوں نے اس جنگ سے متعلق تحقیق کی ہے۔ان تمام مورخین کے بیانات کو بدھا پرکاش نے اپنی کتاب "مہاراجہ پورس" میں تحریر کیا ہے۔آرین کا بیان ہے کہ پورس میدانِ جنگ سے بھاگا نہیں تھا، وہ اس وقت تک لڑائی میں مصروف رہا جب تک ہندوستانی فوج متحد ہو کر لڑ رہی تھی۔ آرین کے بیان سے واضح ہو جاتا ہے کہ پورس قطعی طور پر لڑائی نہیں کرنا چاہتا تھا اور نہ سکندر سے کوئی شرائط یا امن معاہدہ کرنا چاہتا تھا۔آرین نے اپنے بیان میں یہ بھی کہا ہے کہ سکندر کا ایلچی ٹیکسلیس نامی شخص جب پورس کے پاس پیغام لے کر آیا تو پورس نے اس پر نیزے سے وار کیا لیکن ٹیکسلیس جان بچا کر بھاگ گیا۔

کیوریٹس جنگ کا اختتام کچھ یوں بیان کرتا ہے کہ سکندر پورس کے تعاقب میں خود جانا چاہتا تھا لیکن اس کا گھوڑا زخموں سے چور منہ کے بل گر کر ہلاک ہو گیا تھا۔سکندر کو گھوڑا تبدیل کرنے میں تاخیر ہوگئی، اس لیے ٹیکسلیس ایلچی کو بھیجا گیا۔کیوریٹس کا بیان ہے کہ پورس نے بلند آواز میں کہا کہ میں آپ کے بھائی کو جانتا ہوں جس نے سلطنت بیچ دی۔اس کے ساتھ ہی پورس نے ایک

زہریلا تیر ٹیکسیلیس کو مارا جو اس کی پشت سے ہوتا ہوا سینہ سے نکل گیا۔ اس کے ساتھ ہی پورس نے اپنی فوج کی کمان سنبھالی اور یونانی دستوں کا مقابلہ کرنے کے لیے دوبارہ پیش قدمی کی۔ کیوریٹس اس جھڑپ کے متعلق لکھتا ہے کہ مقدونوی سپاہیوں نے پورس کے لشکر پر نیزوں سے شدید حملہ کیا۔ اس حملہ میں پورس کو شدید زخم آئے۔ وہ ہاتھی سے نیچے اتر آیا بلکہ خود شاہی ہاتھی بھی زمین پر بیٹھ گیا۔ کیوریٹس بیان کرتا ہے کہ اس موقع پر جب بہت سے ہندوستانی سپاہی اور ہاتھی پورس اور اس کے ہاتھی کے ارد گرد جمع ہو گئے تو سکندر کو گمان ہوا کہ پورس لڑائی میں مر گیا ہے۔ کچھ یونانی سپاہی پورس کی طرف بڑھے کہ اس کے جسم سے آہنی زرہ اور ہتھیار اتار لیں تو پورس کے ہاتھی نے خطرہ محسوس کرتے ہوئے پورس کو اپنی سونڈ کے ذریعے دوبارہ اپنی پشت پر سوار کیا۔ اس کے ساتھ ہی دوبارہ یونانی فوج نے پورس پر تیروں کی بارش کر دی جس سے اس کی موت واقع ہوگئی۔ اس کو ایک گاڑی میں بٹھایا گیا۔ معلوم نہیں کہ کیوریٹس جنگ کے اختتامی حالات لکھتے وقت کس حال میں تھے، ایک طرف انہوں نے کہا کہ پورس کی موت واقع ہوگئی، دوسری طرف بیان کرتا ہے سکندر جب زخمی پورس کے پاس پہنچا تو اس نے پورس سے سوال کیا کہ آپ مجھ سے کیسے سلوک کی امید رکھتے ہیں۔

کیوریٹس اور آرین کے بیانات میں کافی حد تک تضاد پایا جاتا ہے۔ کیوریٹس کا بیان کہ پورس زخمی ہونے کے باوجود میدانِ جنگ سے باہر نکلا اور سکندر اس کا تعاقب کرنا چاہتا تھا لیکن گھوڑا زخمی ہونے کی وجہ سے ایسا نہ کر سکا۔ دوسرا بیان کہ پورس کے تعاقب سے پہلے سکندر نے ٹیکسلیس کو پورس کے پاس بھیجا تو پورس نے غصے میں آ کر اسے نیزہ مارا جس سے وہ زخمی ہو گیا۔ کیوریٹس نے پہلا بیان دیا کہ خود ٹیکسلیس پورس کے پاس گیا اور وہ پورس کے تیر سے زخمی ہو کر مر گیا۔ اب وہ کہتا ہے کہ ٹیکسلیس کا بھائی گیا اور زخمی ہوا۔ تیسرے بیان میں کیوریٹس کہتا ہے کہ ٹیکسلیس کا بھائی زخمی ہو کر مر گیا جس سے یونانی فوج غصے میں آئی اور انہوں نے پورس پر تیروں کی بارش کر دی۔ ہاتھی جس پر پورس سوار تھا، کو ہلاک کر کے زخمی پورس کو گرفتار کر لیا گیا۔ لیکن آرین اس

واقع کو اس طرح بیان کرتا ہے کہ کئی سفارتی مشنوں کی ناکامی کے بعد سکندر نے آخر میں پورس کے دوست میروس کو بھیجا جس نے بڑی کوشش کے بعد پورس کو مجبور کر کے دونوں جرنیلوں کی ملاقات کروائی۔ ممتاز مورخ ڈیوڈورس کا نکتہ نظر کیوریٹس سے مختلف ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ پورس انتہائی دلیری کے ساتھ لڑتا رہا۔ وہ زیادہ زخموں کی وجہ سے اور خون بڑی مقدار میں بہنے سے نقاہت محسوس کرنے لگا۔ کچھ دیر کیلئے انہیں آرام کا مشورہ دیا گیا اور ہاتھی پر سوار کرایا گیا۔ میدانِ جنگ میں افواہ پھیل گئی کہ پورس مر گیا ہے، اس صورتحال کے پیشِ نظر ہندوستانی فوجی میدانِ جنگ سے بھاگ نکلے اور اس طرح پورس کو زخمی حالت میں گرفتار کر لیا گیا۔ اس تبصرے میں کہیں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ ٹیکسلیس خود یا اس کا بھائی میروس اور دیگر ایلچی سکندر کی طرف سے پورس کے پاس جنگ بندی کے لیے اور نہ ہی اس بات کا ذکر ہے کہ سکندر اور پورس کے درمیان کوئی بات چیت ہوئی۔ ایک اور تاریخ دان پلوترک جنگ کے خاتمے کی بابت تحریر کرتا ہے کہ جب پورس کو قیدی بنا لیا گیا تو سکندر نے اس سے پوچھا کہ بتاؤ تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔ پورس نے جواب دیا کہ جو ایک بادشاہ دوسرے بادشاہ سے کرتا ہے۔

سکندر نے پورس سے دریافت کیا کہ کوئی تمہاری خواہش تو پورس نے کہا کہ سب کچھ۔ اس کے بعد سکندر نے پورس کو بادشاہت پر بحال کر دیا اور ساتھ ہی اپنے تمام مفتوحہ علاقے شاہی خطاب (ستراب) وائسرائے بھی عطا کیا۔ پلوترک کا بیان ہے کہ سکندر نے پورس کو شاہی خطاب دیا ستراپ کا وئسرائے مقرر کیا حالانکہ اس قسم کا بیان کسی دوسرے مورخ نے نہیں دیا۔ باقی کے نزدیک صرف پورس کی سلطنت اس کو واپس کر دی گئی۔ ایک اور راوی جٹسن کی داستان ہے، وہ لکھتا ہے کہ پورس جب دوسری بار زخمی ہوا تو اس کو قیدی بنا کر ایک مکان میں بند کر دیا گیا۔ وہاں اس نے کھانے پینے سے انکار کر دیا اور نہ ہی اپنے علاج معالجہ کی اجازت دی۔ جٹسن کا بیان ہے کہ پورس شاید کسی چیز کی بھی خواہش نہیں رکھتا تھا۔ سکندر نے اس کی بہادری کا احترام کرتے ہوئے اس کی جان بخشی اور ساتھ ہی اس کی سلطنت واپس کر دی اور ستراپ کا وائسرائے بھی مقرر

کر دیا۔ ایشیائی اور افریقی روایتیں جن پر سکندر اور پورس کے درمیان جنگ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ کس طرح سکندر کے گھوڑوں اور سپاہیوں کو تہہِ تیغ کر دیا گیا جس سے یونانیوں کے اندر مایوسی کی لہر دوڑ گئی۔ یہاں تک کہ یونانی روتے اور کتوں کی طرح آوازیں نکالتے تھے۔ ان کی بے بسی اس انتہا تک پہنچ گئی کہ وہ سکندر کا ساتھ چھوڑ کر پورس کے فوج میں شامل ہونے کا سوچنے لگے جبکہ ایک حبشی (ایتھوپیائی) عہد نامے میں اس جنگ سے متعلق یوں لکھتا ہے کہ سکندر نے جب اپنی فوج میں بزدلی کا حال دیکھا تو اپنے سپاہیوں کے درمیان کھڑا ہو گیا جو خود بھی ذہنی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو چکا تھا۔ فوجیوں کو جنگ روکنے کا حکم دیا اور بلند آواز میں چلاتے ہوئے کہا کہ "مجھے تمہاری تھکن کا احساس ہے، معلوم نہیں کیوں ہم یہاں آ کر خوار ہو رہے ہیں۔ اب اگرچہ میں خود اپنی زندگی ختم کرنے کی کیفیت میں ہوں اور یونانی جوانوں کو ایسے حالات کا شکار کرنے کا بھی ذمہ دار ہوں۔"

اس کے فوراً بعد سکندر نے جنگ بندی منصوبے پر کام تیز کر دیا اور پورس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "اے پورس! مجھے آپ کی بے پناہ قوت کا اندازہ ہو چکا ہے۔ یہ مناسب نہیں کہ ہم اپنی وفادار فوج کے بدلے اپنی زندگی بچائیں۔ آؤ ہم دونوں فوجوں کی لڑائی بند کرنے کا حکم دیں۔"

جبکہ ایک دوسرے مورخ جوزف بن گوریان نے اپنی کتاب "تاریخ یہود" میں تحریر کیا ہے کہ جب سکندر کو اپنی فوج کی بزدلی کا علم ہوا تو اس نے شاہِ ہند کی طرف ایک پیغام بھیجا کہ جنگ بندی کر کے اور فوجوں کو پیچھے ہٹا کر اپنی ہی تلواروں سے دونوں جنگ کا فیصلہ کر لیں یا امن معاہدہ شامل تھا۔ ان کے علاوہ فردوسی بھی اپنی تصنیف شاہ نامہ میں ایشیائی، افریقی، حبشی عہد نامے اور جوزف بن گوریان کے بیانات کی تائید کرتے ہوئے راقم طراز ہے کہ جب لڑائی انتہائی نکتے تک پہنچ گئی تو سکندر نے پورس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ "اے عظیم انسان! ہم دونوں کی فوجیں لڑائی سے تھک گئی ہیں۔ جنگلی درندے ہاتھی انسانی کھوپڑیاں کچل رہے ہیں۔ گھوڑوں کے پاؤں سپاہیوں کی ہڈیاں توڑ رہے ہیں اور ہم دونوں دلیر اور ہم پلہ ہیں تو پھر فوجیوں کا قتل عام کیوں اور یہ زخمی زندگی کس کام کی۔"

فردوسی نے آخر میں لکھا ہے کہ معلوم ہوتا ہے سکندر کی فوج کا جانی نقصان زیادہ ہوا جس کی وجہ سے اسے لڑائی بند کرنے کی راہ اختیار کرنا پڑی۔ ممتاز مورخ تارن بھی ان قدیم روایتوں کو درست مانتے ہیں۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہم ان مغربی مورخین جن کی تعداد پانچ چھ ہے کے بیانات کو کس طرح سے دیکھیں جنہوں نے پورس اور سکندر کے درمیان جنگ کے واقعات کو قلم بند کیا۔ یہ تمام کسی ایک نکتہ پر متفق ہوتے نظر نہیں آتے لیکن ایک بات جو تمام مورخین نے دبے الفاظ میں بیان کی ہے، وہ یہ کہ سکندر نے خود لڑائی روکنے اور پورس سے بات چیت کرنے کے لیے ایلچی بھیجے اور پورس کو اس کی تمام سلطنت واپس کر دی۔ ساتھ ہی انہوں نے تحریر کیا ہے کہ سکندر نے پورس کی بہادری کا احترام کرتے ہوئے ان سے نرم رویہ اختیار کیا۔ وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ سکندر جیسا سخت مزاج انسان، جس نے مقدونیہ سے لے کر ایشیا کو چک ایران اور ہندوستان تک انسانوں کا قتل عام کیا، نے مساگا کے قیدیوں کی جان بخشی کے وعدوں کے باوجود قتلِ عام کیا اور ایرانیوں کے قتل عام کا حکم دیا۔ جو اپنی فوج کے کئی جرنیلوں کو قتل کرنے کا مجرم بھی تھا۔ یہ باتیں مورخ بھول جاتے ہیں کہ سکندر کے ہاتھ سے دشمن تو کیا خود دوست بھی محفوظ نہ رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پوری دنیا کی تاریخ ماسوائے پیغمبر اسلام اور خلفاء کے علاوہ کوئی فاتح مفتوح قوم کے ساتھ رحم دلی یا نرمی اختیار نہیں کرتا۔ یہاں تو معاملہ اس سے بھی آگے ہے کہ سکندر پورس کو اس کی سلطنت کے علاوہ تمام فتح کیے ہوئے علاقے بھی دینے پر تیار ہو گیا۔ مورخ یہ بیان کرتے ہوئے بھی نتیجہ اخذ نہ کر سکے کہ میروس جس کو سکندر نے بطور ثالث مقرر کیا، پورس کا پرانا دوست بھی تھا جس نے اپنے دلائل سے پورس کو امن معاہدہ اور جنگ بندی پر راضی کر لیا۔ ہم حالات کے پیش نظر یہ کہنے کے لیے حق پر ہیں کہ شکست سکندر کو ہوئی اور فاتح پورس تھا۔ کیونکہ تمام شرائط منوانے کے بعد ہی پورس نے سکندر سے ملاقات کی اور صلح کا ہاتھ بڑھایا۔ جو شرائط ہندی بادشاہ کی طرف سے دی گئی تھی، ان کے نکات میں پورس کا شاہی اعزاز اور وقار بدستور سلطنت اور گردونواح کے مفتوحہ علاقوں سے سکندر کو بیدخل ہونا۔ یہ معاہدے اس وقت طے پائے گئے جب

جنگ ابھی جاری تھی، دونوں طرف کی فوجیں بھی لڑائی میں مصروف تھیں جب سکندر نے اپنی فوج کی صفوں سے نکل کر پورس کا استقبال کیا ان حقائق سے یونانی تاریخ دانوں کا جانبداری سے پردہ اتر جاتا ہے۔ حالانکہ آرین جو خود ایک مغربی مورخ ہے، اس کے اس بیان کے بعد کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی جس میں اس نے کہا کہ بات چیت میں پہل سکندر نے کی تھی۔

پورس کے جارحانہ رویہ نے یونانی بادشاہ کو امن معاہدے کے لیے مجبور کیا۔ سکندر یہ دیکھ چکا تھا کہ اگر اس نے صلح کا ہاتھ نہ بڑھایا تو ہندوستانی فوج کے ہاتھوں اسے مزید نقصان اٹھانا پڑے گا جس کے لیے اس کی فوج تیار ہی نہیں تھی۔ اس لیے سکندر پورس کی ہر بات تسلیم کرنے اور لڑائی بند کروانے میں کامیاب ہو گیا۔ سکندر اس لحاظ سے فتح یاب تصور کیا جا سکتا ہے کہ اس نے پورس کو جنگ بندی پر راضی کر کے اپنی اور فوج کی جانیں بچا لیں جبکہ پورس اس لیے فاتح ہے کہ اس نے اطاعت گزاری کے بجائے برابری کی بنیاد پر معاہدہ کیا اور اپنی سلطنت شاہی وقار کے ساتھ برقرار رکھی اور اس میں توسیع بھی کر لی۔ دونوں بادشاہوں نے اپنی اپنی جگہ کامیاب حکمت عملی اختیار کی۔ سکندر نے لڑائی میں شکست فاش سے بچنے کے لیے پورس کو جنگ بندی پر راضی کر لیا جبکہ پورس نے مزید خون خرابے سے بچ کر اپنی سلطنت کو محفوظ بنا لیا۔ یہ وہ حقیقت تھی جو آج تک ہندوستانیوں کے علم سے اوجھل تھی۔ جنگِ جہلم کے اصل حقائق کو دبا دیا گیا اور یونانی تاریخ دانوں نے تضادات کے پردے میں یہ بات مقبولِ عام کر دی کہ اس جنگ میں پورس کو شکست ہوئی جبکہ ہندوستانی تاریخ دان حقائق سے نظر چرا کر اختلافات کا شکار ہو گئے۔ اس طرح ہندوستانی ہیرو راجہ پورس کے کارنامے دھندلاہٹ کا شکار ہوئے۔

راجہ سوبھاتی (سوفائی ٹیز):

سکندر پورس کے ساتھ جنگ بندی اور امن معاہدے کے بعد تیس دن تک اس مقام پر مقیم رہا جہاں راجہ پورس کی فوجی چھاؤنی تھی۔ یہاں سکندر آرام کرنے کے ساتھ ساتھ زخمیوں کی مرہم پٹی اور علاج کیا جاتا رہا۔ بعد ازاں سکندر نے اپنا سفر شروع کرنے کے لیے تیاریاں کیں۔ ساتھ

ہی اس نے اپنے افسروں اور ہندی راجاؤں کے ایلچیوں کو ایک مجلس میں جمع کیا اور ان سے خطاب کرتے ہوئے اعلان کیا کہ دریائے جہلم سے چناب تک کا درمیانی علاقہ راجہ پورس کے حوالے کر دیا جائے۔ مورخین کے مطابق اس علاقے میں ۲ ہزار شہر آباد تھے اور جنوب میں دریائے جہلم کے دونوں اطراف میں آباد قبائل کی تعداد ۷ تھی۔ ان میں گلاؤ، کنکوئی اور گلاؤسی قبائل بھی شامل تھے۔ تاریخ دانوں کے مطابق اس علاقے میں ان کے ۳۷ شہر آباد تھے جن کو قبضہ کے بعد پورس کی سلطنت میں شامل کر دیا گیا۔ ہر شہر کی آبادی پانچ ہزار لوگوں پر مشتمل تھی بلکہ کچھ تو دس ہزار کے قریب بھی تھے۔ سکندر نے سفر شروع کرنے کے لیے ان کشتیوں کو جوڑا جو ان کے ساتھ لائی گئی تھیں۔ ایک بحری بیڑا تیار کیا جس میں تیس تیس چپوں والے آٹھ جہاز اور باقی چھوٹی کشتیاں تھی جو اکثر مال برداری کے لیے استعمال کی جاتی تھی۔ ان تمام کو ملا کر کل تعداد ۳۰۰ بنتی تھی۔ اس طرح یونانی فوج نے اکتوبر ۳۲۶ ق م کے آخر میں اپنا سفر شروع کیا۔ کشتیوں اور جہازوں کے علاوہ سکندر نے خود کو محفوظ رکھنے کے لیے گھڑ سوار فوج کی ایک بڑی تعداد کی کمان جرنل ہے فے اُٹسیٹن اور کریٹراس کے سپرد کرتے ہوئے انہیں حکم دیا کہ دریا کے دونوں کناروں کے ساتھ ساتھ چلیں جبکہ ایک اور جرنل فلپس کو ایک دستہ کے ساتھ اپنے پیچھے چلنے کا حکم دیا۔

گھڑ سواروں کے ساتھ ساتھ دو سو جنگی ہاتھی بھی موجود تھے۔ اس طرح یونانی فوج تین دن کے بعد ایک ایسے مقام پر پہنچی جہاں دریائے جہلم کے مغربی کنارے پر راجہ سو بھاتی کی حکومت قائم تھی۔ یہ سلطنت کوہستانِ نمک اور اس کے زیریں علاقوں پر مشتمل تھی۔ سٹرابو (باب ۱۵ صفحہ ۳۰) کے بیان سے راجہ سو بھاتی کی سلطنت میں ایک نمک کا پہاڑ بھی آتا تھا جو پورے ملک کے لیے کافی تھا۔ برٹش فوج کے افسر کننگھم اپنی کتاب (این شنٹ جیوگرافی صفحہ ۱۵۵) پر لکھتا ہے کہ راجہ سو بھاتی کی حکومت دریائے جہلم کے مغربی کنارے کے علاقوں پر مشتمل تھی۔ اس نے دو مقامات کی نشاندہی کی ہے کہ ایک احمد آباد اور دوسرا بھیرہ۔ میرے خیال میں مصنف کو اس مقام کی نشاندہی کرنے میں غلطی ہوگئی ہے۔ کیونکہ کننگھم سو بھاتی کی حکومت جہلم کے مغرب میں بتاتے

ہوئے ساتھ بھیرہ کا ذکر کرتے ہیں۔ بھیرہ شہر تو دریائے جہلم کے مشرقی کنارے پر واقع ہے۔ احمد آباد کا مقام صحیح ہوسکتا ہے کیونکہ ایک تو احمد آباد کا قصبہ ضلع خوشاب میں آتا ہے، دوسرا نمک کا پہاڑ بھی دریائے جہلم کے مغرب میں خوشاب ہی میں واقع ہے۔ اس طرح راجہ سوبھاتی کی سلطنت موجودہ ضلع خوشاب اور اس کے شمال میں واقع نیم پہاڑی سلسلے پر ہوگی۔ سکندر نے اپنے جرنل کیرایٹرس کو حکم دیا کہ وہ فوراً اس راجہ کی حکومت پر قبضہ کر لے۔ سکندر کو یہ خدشہ لاحق ہوا تھا کہ کہیں اس کے حملے سے پہلے ہندو راجہ یونانی فوج پر حملہ نہ کر دے۔ اس نے فوراً حکم جاری کر دیا۔ جب یونانی فوج اس راجہ کے ملک کی سرحدوں میں داخل ہوئی تو سوبھاتی نے جنگ سے قطع نظر خود کو سکندر کی اطاعت کے لیے پیش کر دیا حالانکہ اس کے پاس بھی ۱۰۰ جنگی ہاتھیوں کے علاوہ کافی بڑی فوج تھی۔ ممکن ہے کہ یونانی فوج کے مقابلے میں وہ خود کو کمزور سمجھتا ہو۔ سکندر نے اس مقام پر ایک دن اور ایک رات قیام کرنے کے بعد اور راستے کو اپنے لیے محفوظ بنانے کے بعد اپنا سفر جنوب کی طرف شروع کیا اور تیسرے دن یونانی فوج دریاؤں کے سنگم یعنی "تریموں" کے مقام سے شمال میں کچھ فاصلے پر پہنچی۔

تھل پر یونانی فوج کا حملہ

سکندر کی فوجیں جب تریموں سے کچھ فاصلے پر شمال میں خیمہ زن ہوئی تو سکندر نے سب سے پہلے اردگرد کے علاقوں میں موجود تمام قبائل کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لیے اپنے مخبر بھیجے۔ ممکن ہے کہ پورس نے بھی سکندر کو وہیکہ ریاست اور وہاں موجود سرکش قبائل کی نشاندہی کی ہو کیونکہ ایودھیا جیوی سمگھا قبائل جن میں ایک سے زیادہ قبائل کے اتحاد سے دریائے جہلم کے مغربی کنارے کے ساتھ ساتھ اس میدانی پٹی موجودہ تھل، جہاں اس وقت ایودھیا جیوی کی حکومت تھی، جسے ریاست وہیک کہا جاتا تھا، خود پورس کے قابو سے بھی باہر تھی تو اس نے سکندر کو حملہ کرنے کے لیے کہا ہوگا۔ اس مقصد کے لیے پورس نے کچھ مخبر بھی بھیجے ہوں گے۔ ان

جاسوسوں نے سکندر کو دو علاقوں کے متعلق اطلاع دی۔ ان میں ایک قوم سبوئی جو دریائے جہلم اور چناب کے زیریں علاقوں میں آباد تھے اور دوسری اگلسوئی قوم جو دریائے جہلم کے مغرب کی طرف اس وسیع میدانی پٹی میں حکومت کرتی تھی جس کو قدیم روایتوں میں وہیکا کہا گیا ہے۔ حالانکہ اگلسوئی اور سبوئی قوموں کا ذکر کسی بھی قدیم ہندی روایتوں میں نہیں ملتا۔ یہ نام صرف یونانیوں کے دیے ہوئے ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ سبی اور گلاکنوئی جن کا ذکر پلنی نے بھی کیا ہے۔ پلنی کے مطابق سبی دوسری قوموں سے مل کر گندھارا کے جنوبی میدانوں میں آباد تھے۔ یہ لوگ جنگ کو پیشہ کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ ان کے علاوہ چپ، وساطی، سبوئی یا صوبتی، امبا ستھے، کوشدرک اور مالوے یہ تمام لوگ یودھیا جیوی میں شامل تھے۔ بدھا پرکاش کے مطابق ان قبائل نے یونانی فوج پر اس وقت چھپ کر حملہ کیا جب وہ اپنے پڑاؤ میں تھے۔ اس حملہ میں یونانی فوج کا کافی نقصان ہوا اور خود سکندر بھی اس جھڑپ میں زخمی ہوا۔ یہ ایک چھاپہ مار کاروائی تھی جس میں مختصر فوج نے حصہ لیا تھا۔ اس کے بعد سکندر نے اپنے جرنل کیریٹراس جو مغربی کنارے کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا، کو حکم دیا کہ ان حملہ آوروں کا پیچھا کیا جائے اور انہیں عبرت ناک سزا دی جائے۔

وی اے سمتھ کے مطابق پانچویں دن یونانی فوج ان دریاؤں کے مقامِ اتصال جہاں دریائے جہلم اپنے سے بڑے دریا چناب سے ملتا تھا، وہ مقام جہاں ان دونوں دریاؤں کا پانی آپس میں ملتا تھا، بہت کٹاؤ یا گرداب پڑتا تھا۔ اسی مقام پر سکندر کو دو مشکلیں ایک ساتھ پیش آئیں۔ ایک یہ کہ یونانی فوج کے دو جہاز بمع فوجی غرق ہو گئے جبکہ وہ جہاز جس پر خود سکندر سوار تھا بڑی مشکل سے بچا تھا۔ دریا میں خطرے کی وجہ سے سکندر نے اپنی فوج کو خشکی پر اترنے کا حکم دیا۔ یہ واضح نہیں کہ یونانی یہاں کتنے دن تک ٹھہرے۔ دوسری یہ کہ مقامی قبائل نے یونانی فوج پر حملہ کر دیا۔ ایورٹی کا مضمون ”دی مہران اینڈ اٹس ٹری بیوٹریز“ جے۔ اے۔ ایس۔ بی ۱۸۹۲ء حصہ اول جس کو وی اے سمتھ نے تحریر کیا ہے کہ یہ بالکل صاف ہے نہ دریاؤں کے مواقع متعین ہو سکتے ہیں اور نہ ہی ہم ان کے کناروں پر آباد شہروں کے محل وقوع کا صحیح اندازہ لگا سکتے ہیں۔ آج

سے ۲۳۰۰ سو سال پہلے ان اقوام کے محل وقوع اور جائے سکونت کا پتہ چلانا جن سے سکندر کا واسطہ پڑا، بہت مشکل ہے۔ لیکن قدیم تاریخی شہادتیں اور ان آثارِ قدیمہ کی مدد سے جو ان علاقوں میں پائے گئے ہیں، سے کچھ حد تک اندازہ لگا سکتے ہیں۔ جیسا کہ ہم بڑی محنت اور تحقیق کے بعد اس نتیجہ پر پہنچ پائے کہ کس طرح یونانی فوج جہلم اور چناب کے سنگم "تریموں" کے قریب خیمہ زن ہو کر آس پاس کی قوموں کے خلاف جنگی کاروائیاں کرتی رہی۔ یہ نتیجہ ہم نے بڑی محنت اور کاوشوں کے بعد اخذ کیا کہ جب سکندر کی فوج پر مقامی قبائل کی جانب سے حملہ کیا گیا تو اس کے جواب میں سکندر نے اپنی فوج کے جرنیلوں کو ایک بڑی فوج کے ساتھ اتحادی اقوام پر حملہ کرنے اور ان کے ملک پر قبضہ کرنے کا حکم دیا۔ ساتھ یہ بھی ممکن ہے کہ پورس نے یونانی بادشاہ کو اس علاقے اور یہاں قابض قبائل کے بارے میں معلومات دی ہوں کیونکہ یونانی فوج کی بے پناہ طاقت کا فائدہ اٹھانا چاہتا تھا اور سکندر ہی کے ہاتھوں اپنے تمام دشمنوں کا خاتمہ چاہتا تھا۔

سکندر کی فوج جس کی قیادت کریٹراس کر رہا تھا نے بقول ڈیوڈورس، جبکہ آرین تحریر کرتا ہے کہ اگلسوئی قبائل کو صرف ڈیوڈورس نے ہی مشہور کیا ہے، ساتھ اس کا یہ بھی بیان ہے کہ اس میں بہت سی قومیں آباد تھیں، ان پر یونانی فوج نے حملہ کیا۔ اگلسوئی قبائل جو ۴۰ ہزار پیادے اور تین ہزار سواروں پر مشتمل تھے، نے مقابلہ کرنے کی ہمت کی۔ دوسری طرف ایک اور مغربی تاریخ دان کرٹیٹس کا بیان ہے کہ دریائے جہلم کے مغربی علاقوں میں آباد سبوئی قبائل ان نیم وحشی خانہ بدوش جاٹوں کے آباؤ اجداد تھے جبکہ مہابھارت میں تحریر ہے کہ یہ وہی جنگجو جتھے تھے جو کورو کی فوج میں شامل تھے۔ سنسکرت کے ادیب پنی نے انہیں سبوبتی، ورکا، بائیجاوپی، بلھسکا، دریتا، دھریتا قرار دیا ہے۔ تاہم ان میں سے اہم کشودرک اور مالوے تھے۔ یہ تمام قومیں ہندوستانی تحریروں کے مطابق یودھیا جیوی سمگھا میں شامل تھیں۔ ہم ان قبائل کے بارے میں پہلے تفصیلاً بیان کر چکے ہیں کہ یہ جنگجو گروپ جنگ کو بطور پیشہ اختیار کرتے تھے۔ ان میں زیادہ طاقتور قبیلے کشودرک اور مالوے تھے جو اس وقت مقامی لوگوں کی قیادت کر رہے تھے۔ یونانی فوج نے ان پر حملہ کیا اور

مقامی قبائل نے بھی مزاحمت کی۔ جب سکندر کی فوج کی طاقت کو نہ روک سکے تو بھاگ کر اپنے ملک کے اندرونی حصوں میں چلے گئے۔ مقامی لوگوں کا عبرت ناک نقصان ہوا، ہزاروں کی تعداد میں تلوار کی نذر ہوئے اور کچھ کو غلام بنالیا گیا۔ آرین کا بیان ہے کہ مقدونوی فوج ان کا پیچھا کرتی ہوئی ۳۰ میل آگے مغرب کی طرف چلی گئی، یہاں تک کہ ان کے پایہء تخت پر قبضہ کرلیا۔ خیال یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جب ان قبائل کے چھاپہ مار جتھوں نے یونانی فوج پر حملہ کیا ہوگا تو اس کے بدلے میں ضرور سکندر نے اپنی فوج کو حکم دیا ہوگا کہ ان کا پیچھا کرو اور ان کے ملک پر قبضہ کرلو۔

یونانی فوج نے مغرب کی طرف پیش قدمی شروع کی۔ مقامی لوگ مقابلہ کرنے کے لیے آگے بڑھے۔ لڑائی ہوئی لیکن ایک انتہائی طاقتور فوج کا مقابلہ ان کے بس کی بات نہ تھی۔ اس موقع پر ہندوؤں کو تہہِ تیغ کر دیا گیا۔ جو بچے انہوں نے بھاگ کر اپنے پایہ تخت میں پناہ لی لیکن یونانی فوج یہاں بھی پہنچ گئی۔ شہر کا محاصرہ کرلیا گیا۔ وہاں کے باشندوں نے بھی یونانی فوج کا مقابلہ کیا۔ اس مقام پر آرین کا بیان ہے جس میں انہوں نے ڈیوڈورس اور کرٹیٹس کا بھی حوالہ دیا ہے کہ جب سکندر کے سپاہی شہر کے اندر داخل ہوئے، اس وقت مقامی لوگوں نے ان پر حملہ کر دیا۔ گلیوں اور کوچوں میں جب یونانی فوج پھنس گئی اور شہر والوں نے اپنے گھروں سے نکل کر ان پر حملے کیے، تو اس موقع پر مقدونوی فوج کا کافی نقصان ہوا۔ سکندر کے فوجی جب بے بس ہو گئے تو انہوں نے شہر کو آگ لگا دی۔ ڈیوڈورس کا بیان باب ۱۷ صفحہ ۹۶ میں کہ مقدونوی جب کامیابی سے مایوس ہوئے تو انہوں نے شہر کو آگ لگا دی۔ جبکہ کرٹیٹس باب ۹ صفحہ ۴ میں ہے کہ مقامی لوگوں نے دشمن کے خطرے کے پیش نظر اپنے گھروں کو آگ لگا دی اور بیوی بچوں سمیت خود کو آگ میں جھونک دیا۔ شہر کو آگ لگانے کے دونوں واقعات قابلِ بھروسہ ہیں۔ مقامی لوگ دشمن کے خوف سے خود کو آگ لگا سکتے ہیں کیونکہ ایسے واقعات ہندوستان میں کئی مرتبہ پیش آ چکے ہیں۔ جیسا کہ ہندوستان کی تقسیم کے وقت بھی کچھ ایسے واقعات سننے میں آئے تھے۔ لیکن اول الذکر بیان کی اہمیت زیادہ ہے۔

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ یہ آگ یونانی لوگوں نے لگائی کیونکہ جس وقت شہر میں داخل ہوئے اور مقامی لوگوں نے اپنے گھروں میں چھپ کر دشمن پر حملے شروع کیے بقول آرین مقدونوی فوج کا کافی جانی نقصان ہوا۔ اب لڑائی کھلے میدان کی بجائے تنگ گلیوں میں ہو رہی تھی۔ لوگ اپنے گھروں سے نکل کر دشمن فوج پر وار کر رہے تھے اور یونانی سپاہی گلیوں میں پھنس کر رہ گئے تھے۔ ان حالات میں یونانی فوج نے شہر سے باہر نکل کر محاصرہ کر لیا اور شہر کو آگ لگا دی۔ شہر کا اکثر حصہ جل گیا مگر قلعہ اور اہم رہائشی عمارتیں جہاں شہر کا امیر طبقہ رہتا تھا، آگ سے بچ گیا۔ وی اے سمتھ اپنے مضمون "آف دی پنجاب کنکرڈ بائی الیگزینڈر دی گریٹ" میں اکتوبر ۱۹۰۳ء میں تحریر کرتے ہیں کہ سکندر نے یہ شہر فتح کرنے کے بعد وہاں اپنے ایک جرنیل فلپوس کو صوبہ دار مقرر کیا۔ مقامی فوجیوں کے علاوہ کچھ یونانی فوجی بھی اس کی کمان میں وہاں چھوڑے۔ اس واقعہ کے بارے میں ہم تفصیل سے روڑاں کے آثارِ قدیمہ باب میں ذکر کریں گے۔ موجودہ علاقہ تھل میں فتوحات کے بعد سکندر آگے مزید جنوب کی طرف بڑھے یہاں تک کہ وہ دریائے راوی کی زرخیز وادی میں آباد قوموں پر حملہ آور ہوئے۔ کچھ مقامی سرداروں کو گرفتار کیا گیا اور کچھ نے اطاعت قبول کر لی لیکن سکندر کو اس علاقے میں ایک مشکل ایسے شہر میں پیش آئی جس کا قلعہ ایک بلند مقام پر بنا ہوا تھا۔ یہ چھوٹا سا شہر تھا جس کی صحیح لوکیشن کا پتہ نہ لگایا جا سکا۔ کچھ مورخین کے خیال کے مطابق موجودہ ساہیوال سے ۴۰/۵۰ میل جنوب مغرب میں واقع ہوگا جبکہ آرین نے نہایت خوبی سے بیان کیا ہے اور ساتھ ہی انہوں نے ٹولمی کے مہیا کردہ مواد کی بنیاد پر بیان کیا ہے کہ یہ چھوٹا سا شہر تھا۔ سکندر نے حسب معمول خطرے کے باوجود جائزہ لینے کے لیے دیوار پر چڑھ گئے۔ اس کے ساتھ تین لوگ اور بھی شامل تھے۔ ایک پیوکسٹس، دوسرا لیوناٹاس اور تیسرا ابریس۔ یہ زرق برق اسلحہ پہنے ہوئے دیوار پر کھڑے تھے کہ قلعہ کے اندر سے پھینکے گئے تیروں اور نیزوں کا نشانہ بن گئے۔ ٹولمی کہتا ہے کہ ابریس ہلاک ہو گیا اور سکندر ایک درخت کے ساتھ جو دیوار کے قریب ہی تھا، پشت لگا کر کھڑا ہو گیا اور حملہ آوروں کے مقابلہ میں اپنی حفاظت کرتا رہا۔

وی اے سمتھ کا بیان ہے کہ اسی مقام پر سکندر نے ہندی گورنر کو قتل کیا جو ممکن نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ جب خود سکندر زخمی حالت میں اپنی جان بچانے کی کوشش کر رہا تھا، وہ اکیلا کیسے اس شہر کے سربراہ کو قتل کر سکتا تھا؟ ہاں یہ ضرور ممکن ہے کہ جب سکندر کی پوری فوج قلعہ میں داخل ہوئی ہوگی تو اس نے ہندی گورنر کو قتل کیا ہوگا۔ یہاں سکندر کے سینے میں ایک ایسا تیر لگا جس سے سکندر گر پڑا۔ پیوکس ٹس جو اس وقت سکندر کے ہمراہ تھا، نے اس ڈھال سے جو اسیان سے لائی گئی تھی، میں چھپا لیا۔ لیوناٹاس نے اردگرد کے حملوں سے سکندر کو محفوظ رکھا۔

جب مقدونوی فوج نے اپنے بادشاہ کی یہ حالت دیکھی تو فوجی اس کچی دیوار پر چڑھنے میں کامیاب ہو گئے۔ سکندر کے کچھ سپاہیوں نے قلعہ کے اندر داخل ہو کر دروازہ کھول دیا جس سے تمام یونانی فوجی اندر داخل ہو گئے اور انہوں نے مقامی لوگوں کا قتلِ عام کیا۔ غیظ و غضب سے بھری فوج نے بلاتمیزِ مرد و زن اور بچوں سب کو تہہ تیغ کر دیا۔ سکندر کو زخمی حالت میں کیمپ کے اندر لایا گیا جہاں اس کے سینے سے تیر کو جراحی کے عمل سے نکالا گیا جس کی وجہ سے خون زیادہ مقدار میں بہہ گیا اور سکندر کی فوری موت کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ مگر خوش قسمتی سے وہ بچ گیا۔ یہ شہر اور قلعہ کہاں واقع تھا؟ اس کے متعلق دو متضاد بیان سامنے آئے ہیں۔ ایک آرین کا وہ بیان جو انہوں نے ٹولمی کے حوالے سے دیا ہے کہ یہ شہر اور قلعہ دریائے راوی کے مغربی کنارے کے ساتھ آباد تھا۔ جبکہ سڑ یبو باب ۱۵ صفحہ ۳۳ ۱۳اس شہر کو ملتان (مولستان پور) قرار دیتے ہیں لیکن ریورٹی صفحہ ۶۴ ۱۳اور وی اے سمتھ کا مضمون جے۔ آر۔ اے۔ ایس اکتوبر ۱۹۰۳ کا خیال ہے کہ یہ شہر ملتان یا اس کے شمال میں واقع ہوگا کیونکہ ملوی قوم دریائے چناب اور راوی کے علاقوں میں آباد تھی۔ ان مورخین کا یہ بھی کہنا ہے کہ ٹولمی سکندر کی فوج میں شامل نہیں تھا۔ میرے خیال میں جس قلعہ میں سکندر کو زخم آئے، وہ موجودہ ملتان ہی کی جگہ پر تھا۔ ملوی قوم آباد ہونے کی وجہ سے پہلے اسے "مولستان پور" کہا جاتا تھا تو ممکن ہے کہ یہ وقت کے ساتھ ساتھ یہی نام ملتان میں تبدیل ہوا ہو۔ ویسے بھی ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ ہندوستان کے حوالے سے جو معلومات ہم تک پہنچی ہیں اور

جس طرح ان مورخین نے ہندوستان میں آباد شہروں اور اقوام سے متعلق جگہ اور نام تجویز کیے ہیں، وہ تمام کے تمام زمینی حقائق سے کچھ مختلف ہیں۔ اس لیے ہم اس بات کو نظر انداز نہیں کر سکتے کہ جن مقام اور اقوام کے لیے تحریری مواد پیش کیا جا تا ہے، اس میں کچھ حد تک ضرور غلطی کا احتمال موجود ہوتا ہے۔ سکندر کو کچھ دن علاج کے بعد دریائے چناب اور راوی کے مقام پر جہاں یہ ملتے ہیں، لے جایا گیا جہاں یونانی فوج ٹھہری ہوئی تھی۔ سکندر نے اپنے جرنیل فلپس کو ان مفتوحہ علاقوں اور اقوام کا صوبے دار مقرر کیا۔

اس طرح دریائے سندھ اور چناب کے درمیانی علاقہ کا صوبیدار فلپوس جبکہ دریائے چناب اور راوی کے علاقوں کا صوبیدار فلپس کو مقرر کیا گیا۔ اس کے بعد یونانی فوج نے مزید جنوب کی طرف اپنا سفر شروع کیا اور سکندر دریائے سندھ کے راستہ سے سمندر تک پہنچا۔ زیریں سندھ کے علاقہ الور موجودہ سکھر روہڑی اضلاع کے قریب واقع تھا، جہاں بقول آرین موسی کنات مملکت تھی۔ اس کو فتح کرنے کے بعد سکندر نے فوج کو تین حصوں میں تقسیم کیا۔ ایک حصہ جرنل کریٹراس کی سربراہی میں وطن واپس بھیج دیا گیا، جس میں زخمی اور بیکار فوجی اور ہندوستان سے لائے گئے ہاتھی شامل تھے۔ ان کو حکم دیا گیا کہ براستہ قندھار سیتان کرمانیہ تک جائیں جبکہ بحری بیڑے کی کمان امیر البحر نیارکس کے سپرد کی اور اسے حکم دیا کہ وہ ساحلِ سمندر کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا خلیج فارس سے ہو کر دریائے فرات کے دہانے پر پہنچے۔ تیسرے حصے کی خود سکندر نے کمان سنبھالی اور وہ ان جنگلی علاقوں گدروسیہ (مکران) کے راستہ سے ہوتا ہوا ایران میں داخل ہوا۔

سکندر دریائے دجلہ کے شمال مشرق میں سوسہ کے مقام پر پہنچا جبکہ یونانی فوج کا وہ حصہ جو بحری بیڑے پر مشتمل تھا، دریائے دجلہ کے راستہ سکندر سے جا ملا۔ اب دونوں فوجیں مل کر کرمانیہ اور اس سے آگے جون ۳۲۳ ق م میں بابل پہنچی تھی کہ سکندر جو ہندوستان سے زخمی حالت میں یہاں پہنچا تھا، اس کی حالت مزید بگڑ گئی اور وہیں پر اس فاتحِ عالم اور انسانیت پر مظالم ڈھانے والے کو موت نے گھیر لیا۔ اس طرح سکندر دو خواب دل میں لیے ہوئے مقدونیہ سے ہندوستان

تک پہنچا تھا، تعبیر پا کر بھی ادھورے رہ گئے۔ قدرت کے فیصلے کچھ الگ نوعیت کے ہوتے ہیں کہ اتنی بڑی سلطنت جس کے لیے اس نے لاکھوں جانوں کا قتلِ عام کیا، اس کا کوئی جانشین نہیں تھا۔ اس مقبوضہ سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ ہندوستانیوں نے بغاوت کر کے سکندر کے مقرر کردہ صوبیداروں کو قتل کر دیا اور خود مختیار ہو گئے۔ ایران سے لے کر مقدونیہ تک فوجی جرنیلوں نے اپنے اپنے علاقوں پر قبضے جما لیے۔ لیکن ہندوستان میں اس مہم سے کوئی تغیر وتبدل واقع نہیں ہوا۔ جنگ نے جو زخم دیے، وہ جلد مندمل ہو گئے۔ ویران کھیت، بارکش اور محنتی کاشتکاروں کی کاشتکاری چند سالوں میں پھر سے ہرے بھرے ہو گئے۔ مقتولوں کی جگہ روز افزوں بڑھتی ہوئی آبادی نے لے لی۔ ہندوستان پر یونانی تہذیب کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ انہوں نے مقدونوی حملہ آوروں کے ظلم کو بہت جلد فراموش کر دیا اور پہلے کی طرح شاندار علیحدگی اور خود مختاری کی زندگی بسر کرنے لگے۔ ایک مصنف میتھیو آرنلڈ اس حملے کے متعلق یہ الفاظ استعمال کرتا ہے کہ مشرق نے مقدونوی طوفان کے آگے نفرت وحقارت سے سر تسلیم خم کر دیا۔ فوجیں تمام تباہیوں کو ہم رکاب لیے ہوئے اس کے سر پر سے گزر گئیں اور وہ پھر اپنے خیال میں محو ہو گئے۔

چندر گپت موریہ اور اس کا خاندانی پس منظر

(۲۹۸ ق م سے ۳۲۱ ق م)

چندر گپت کے بارے میں مختلف روایات پائی جاتی ہیں۔ ایک روایت یہ ہے کہ اس کا خاندانی نام چندرا گپتا تھا اور موریہ اس کا لقب تھا جو اس کی والدہ کے نام کی وجہ سے ملا تھا۔ ایک اور روایت میں کہا گیا ہے کہ چندر گپت مگدھ کے شاہی خاندان میں پیدا ہوا مگر اس کی والدہ یا نانی ایک نیچ ذات سے تھی اور اس وقت ہندو مذہب میں مادر نسبی یعنی بچے کی خاندانی نسبت اس کی ماں سے دی جاتی تھی، اس لیے چندر گپت کو نیچ ذات سے تعلق رکھنے کی وجہ سے ذلتوں کو برداشت کرنا پڑا۔ ایک مرتبہ تو ایسا اتفاق ہوا کہ مگدھ کا بادشاہ جو اس کے خاندان کا سربراہ بھی تھا، جس کا نام

راجہ مہا پد مانند تھا، ناراض ہو گیا اور چندر گپت کو قتل کرنے کا حکم جاری کر دیا۔ اسی ڈر کی وجہ سے چندر گپت جان بچا کر مغربی پنجاب کی طرف بھاگ گیا۔ ایک اور روایت جو قدیم ہندو مذہب کی روایتوں، تحریروں اور پرانا جات سے ہے کہ چندر گپت ایک نہایت ادنیٰ خاندان میں پیدا ہوا۔ جب اس نے مگدھ کے حاکم نندرس (نند) کی کسی وجہ سے ہتک کی جس کے الزام میں اس کو گرفتار کرنے اور قتل کا حکم ہوا، تو چندر گپت کو مغربی ہند کے علاقے گندھارا میں پناہ لینی پڑی۔ ہم بار بار اس بات کی طرف اشارہ کر چکے ہیں کہ ہندوستان کی تمام تر قدیم تاریخ ایسی دھندلاہٹ کا شکار ہوئی کہ کسی بھی تاریخی واقعہ سے متعلق یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ قطع نظر اس کے کہ ہم ان یورپی یا مغربی مورخین کے اکتسابات پر بھروسہ کریں۔ اسی طرح چندر گپت کے متعلق بھی میک کرنڈل صفحہ ۳۲۷-۴۰۵ پر مدرا راکش کے ناٹک کا حوالہ دیتے ہوئے بیان کرتے ہیں کہ چندر گپت مگدھ کے بادشاہ کا بیٹا تھا جبکہ اس کی ماں کسی اور خاندان سے تھی یا کسی عام قوم کی ہو سکتی ہے۔ مورخ کا بیان ہے کہ چندر گپت کو اسی وجہ سے جلاوطن کر دیا گیا۔ مورخ جٹسن بھی اپنے بیان میں کرنڈل کے ساتھ اتفاق کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ چندر گپت مگدھ کے شاہی خاندان کا فرد تھا جس کو جلاوطن کر دیا گیا۔ یا انہوں نے کسی وجہ سے از خود اپنے ملک سے بھاگ کر گندھارا کے علاقے ٹیکسلا میں پناہ لی۔ اس وقت عالمِ شباب تھا۔ عمر ۲۵ سال تھی۔ اس کے ساتھ ممکن ہے کہ خاندان کا کوئی فرد بھی نہ ہو۔ وہ مغربی پنجاب کے علاقوں کو بڑی غور سے دیکھتا رہا۔ شاہی خاندان کا اثر تو اس کے خون میں شامل تھا۔ اس کی سوچ اور منزل بہت آگے تھی۔ وہ کسی موقع کی تلاش میں تھا جس سے وہ کچھ فائدہ اٹھا سکے۔ چلتا چلتا جب وہ گندھارا کے پایہ تخت ٹیکسلا تک پہنچا تو اسے امید کی کرن نظر آئی کیونکہ مغربی شمالی ہندوستان میں ٹیکسلا شہر کو علم و ادب کے لحاظ سے ایک خاص اہمیت حاصل تھی۔ کہا جاتا ہے کہ ایرانی و آچمینی دور سے ہی ٹیکسلا میں ایک بہت بڑی یونیورسٹی قائم تھی۔ چندر گپت نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور حصولِ تعلیم کے لیے اسی جگہ کا انتخاب کیا۔ کچھ عرصہ تک تو اس نے عام شہری کی طرح زندگی بسر کی اور اپنی تعلیم پر توجہ مرکوز رکھی لیکن اسی دوران

چندر گپت کی ملاقات ایک ہندو برہمن، جس کا نام کوتلیہ چانکیہ تھا، سے ہوئی۔کوتلیہ ٹیکسلا یونیورسٹی کے ایک مایہ ناز استاد اور لائق و ہوشیار عالم سمجھے جاتے تھے۔ وہ کوتلیہ جس کو ہندوستانی ارسطو کا لقب دیا جاتا ہے، کی ایک ہی نظر نے بھانپ لیا کہ شاہی خاندان کا سپوت باصلاحیت اور باہمت ہے اور چندر گپت اس قابل ہے کہ تباہ حال ملک کو اور پریشان قوم جو آپس کی سیاسی بدنظمی اور یونانی حملوں سے بکھری ہوئی ہے، کو مجتمع کر سکتا ہے۔ کیونکہ کوتلیہ خود اس قابل نہیں تھا کہ وہ کوئی فوجی یا شاہی منصب سنبھال سکتا۔کوتلیہ کے اندر علمی صلاحیت، سیاسی سوچ، علاقائی طرز کی فکر اس کے دل و دماغ پر ہر وقت اثر انداز ہوتی رہتی لیکن اس کی جسمانی حالت یہ تھی کہ وہ ٹانگوں سے معذور تھا۔ ٹیڑھی ٹانگوں کی وجہ سے چلنے پھرنے سے قاصر تھا۔اس لیے اس کی سوچ کو عملی جامہ پہنانے کے لیے جس طرح کی قیادت کی ضرورت تھی، وہ باصلاحیت نوجوان چندر گپت میں نظر آئیں جس کی کوتلیہ کو ضرورت تھی۔

اپنی سوچ کو مدنظر رکھتے ہوئے کوتلیہ نے دوران تعلیم چندر گپت کی بالکل اسی طرح فوجی اور عملی تربیت کی جس طرح ارسطو نے سکندر کی تربیت کی تھی۔ یہ چندر گپت کی خوش نصیبی تھی کہ اس کو کوتلیہ جیسا لائق و ہوشیار عالم و مشیر مل گیا تھا۔ چندر گپت کو استاد کے مشوروں اور عملی تربیت کی مدد سے تخت و تاج ملا اور مغربی ہندوستان کے ایک وسیع علاقے پر اپنی سلطنت قائم کی۔اس کے علاوہ جب چندر گپت ٹیکسلا یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کر رہا تھا تو اس دوران ۳۲۶ ق م میں سکندر اعظم ہندوستان میں وارد ہوا۔ یہ یونانی بادشاہ اپنی فوج کے ہمراہ ایک ماہ تک راجہ امبھی کے ہاں ٹیکسلا میں رہا تو چندر گپت کو سکندر سے ملنے کا صرف موقع ہی نہیں ملا بلکہ اس نے یونانی فوج کی قوت اور صلاحیت کا بغور جائزہ بھی لیا۔اس وقت سے اس کے دل اور دماغ میں جذبہ اور حسرت سی پیدا ہو گئی اس غیر ملکی حملہ آور کے رویے سے کہ وہ کس طرح بے دھڑک ہندوستان کو اپنے پیروں تلے روند رہا ہے۔ بالآخر چندر گپت نے مادر وطن کی حفاظت کو اپنا معمول بنا لیا اور انہی جذبوں کی بدولت اس نے ایک وسیع سلطنت کی بنیاد رکھی۔

چندر گپت کی سلطنت

(۳۲۶ق م تا ۲۹۸ ق م)

۳۲۱ق م میں جب مغربی ہند افراتفری کا شکار ہو چکا تھا اور مقامی قبائل نے یونانیوں کے خلاف بغاوت کر کے خود مختاری حاصل کر لی تھی۔ سکندر کی موت کے ساتھ ہی ان کی سلطنت کا شیرازہ بکھر چکا تھا۔ سکندر کے جرنیلوں نے سلطنت کے کئی حصے کر کے آپس میں بانٹ لیے تھے۔ کیونکہ اس وقت مغربی پنجاب گندھارا اور کوہ ہمالیہ کے جنوب میں واقع وسیع میدانی خطہ "تھل" مقامی قبائل کی خانہ جنگی کی وجہ سے سیاسی لحاظ سے دو چار ہو چکا تھا تو چندر گپت نے اس وقت مغربی پنجاب اور خاص کر گندھارا کی سیاسی صورت حال کا اندازہ کرتے ہوئے اپنی کوششیں تیز کر دیں۔ وہ اس خلا کو پر کر رہا تھا جو مقامی ریاست اور تباہ حال قبائل کے تتر بتر ہونے اور یونانی فوج کا نو مفتوحہ ہندوستانی صوبوں پر سے عمل دخل ختم ہونے سے پیدا ہوا تھا۔ ۳۲۰ یا ۳۲۱ق م کے دوران جنوبی گندھارا کے میدانی علاقے موجودہ تھل کی سیاسی صورتحال بگڑ چکی تھی۔ اس صوبے کے یونانی صوبیدار جنرل فلپوس کو مقامی افراد نے قتل کر دیا تھا اور خود مختاری حاصل کر لی تھی۔ ساتھ ہی سکندر کی موت سے ہندوستانی علاقوں سے یونانیوں کا اثر زائل ہو چکا تھا۔ سب سے پہلے ہندوستان کے اس علاقے کے مقامی قبائل نے خود مختاری کا اعلان کیا جس صوبے کا گورنر فلپوس تھا۔ انہوں نے یونانی گورنر کو قتل کر کے خود مختاری حاصل کر لی اور یقیناً یہ یودھیا جیوی قبائل تھے جو ریاست وہیک تھل کے باسی تھے۔ شمال مغرب کے اکثر قبائل نے راجہ امبھی سے بغاوت کر کے کہ انہوں نے ایک ظالم غیر ملکی حملہ آور کی مدد کی، اس وجہ سے علیحدگی اختیار کر لی اور ایک باوقار نوجوان قیادت چندر گپت موریہ کو اپنا سربراہ تسلیم کر لیا۔

وی اے سمتھ نے ایک قدیم ہندی تحریر ناٹک کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ چندرا گپتا شمالی مغربی سرحدی علاقوں کی جنگجو اقوام سے مل کر ایک طاقتور فوج جمع کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ لیکن ضرور اس کام میں اس کے استاد اور مشیر کوتلیہ کا بھی ہاتھ ہو گا۔ اس فوج کی مدد سے پہلے پہل تو

چندر گپت نے غیر ملکی افواج کو ہلاک اور ملک بدر کر دیا۔ اس کام کے لیے چندر گپت نے گندھارا کے جنوبی خطہ کو اپنا مرکز بنایا اور ان جنگی سرداروں سے اتحاد قائم کیا جو ریاست وہیکا کے میدانی خطے میں آباد تھے۔ ہم پہلے باب میں یہ واضح کر چکے ہیں کہ خطہ "تھل" کے مقامی راجاؤں نے یونانی فوج کے خلاف سب سے پہلے علم بغاوت بلند کیا تھا اور یونانی گورنر فلپوس کو ہلاک دیا تھا۔ چندر گپت نے بھی انہی لوگوں سے اتحاد کیا کیونکہ کوئی ایسی شہادت نہیں ملتی جس سے یہ واضح ہو جائے کہ چندر گپت نے بھی کسی راجا یا بادشاہ سے اتحاد کا معاہدہ کیا ہو اور ان کو کسی بادشاہت پر فائز کیا گیا ہو۔ ہمیں اس بارے میں جو معلومات ملی ہیں ان سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ چندر گپت نے جب مغربی پنجاب کی سیاسی افراتفری اور غیر معتدل حالات اور روز افزوں بڑھتی ہوئی خانہ جنگی جبکہ ساتھ ہی یونانی فوج کی کمزوری جو سکندر کی موت کے وجہ سے پیدا ہوئی تھی۔ ہندوستان میں کسی مرکزی سیاسی قیادت کی غیر موجودگی ان تمام حالات کے پیش نظر عام زندگی سے نکل کر چندر گپت نے تقریباً ۳۲۲ ق م کے دوران عملی سیاسی زندگی کا آغاز کیا۔ ضرور ایسا ہوا ہو گا کہ ریاست وہیکا کے صدر مقام میں کچھ عرصہ رہنے اور وہاں پر ایک فوج جمع کرنے کے ساتھ ساتھ ان مقامی سرداروں کا اعتماد حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہے ہوں گے۔ چندر گپت اس وقت تک جنوبی گندھارا "تھل" کے کسی ایسے مقام پر رہا جب تک اس نے تمام اقوام کو اپنی گرفت میں نہ لے لیا ہو گا۔ تقریباً ایک سال کا عرصہ جنوبی علاقوں میں گزارنے اور مقامی قبائل کی طرف سے ہر قسمی مالی و فوجی و سیاسی سپورٹ حاصل کرنے کے بعد چندر گپت نے ۳۱۸ ق م کے آخر میں شمال کا رخ کیا۔ وہیکا "تھل" کے لوگوں کو جو سکندر کے حملے اور یونانی فوج کی قتل و غارت گری اور زخموں سے چور چور اپنی سیاسی اور فوجی طاقت کھو چکے تھے، کسی ایسی سیاسی قیادت کی اشد ضرورت تھی جو ان کی عزت و وقار کو بحال کر سکے۔ ان مشکل حالات کے پیش نظر ان قبائل نے چندر گپت موریہ کو نجات دہندہ سمجھ کر اپنا بادشاہ تسلیم کر لیا۔ ایک اچھی خاصی فوج جمع کرنے اور کئی سرداروں کو اپنے ساتھ ملانے کے بعد اب چندر گپت کا اگلا سفر گندھارا کے دارالسلطنت ٹیکسلا پر قبضہ تھا کیونکہ اب کو تلیہ

کی بھی کوشش تھی کہ کسی طرح جنگ کے بغیر ہی ٹیکسلا چندر گپت کے قبضے میں آ جائے۔اسی دوران جب ٹیکسلا پر حملہ ہوا تو اس وقت کوتلیہ نے بڑا اہم کردار ادا کیا اور بغیر جنگ یا خون خرابے کے راجہ امبھی کو اس بات پر راضی کیا کہ وہ اپنا تخت و تاج چندر گپت کے حوالے کر دے کیونکہ اس سے پہلے امبھی مقامی قبائل کا رویہ دیکھ چکا تھا کہ یونانی فوج کے سامنے ہتھیار ڈالنے اور ان کی اطاعت گزاری کی وجہ سے عوام ان کے خلاف اٹھ چکی تھی ہر طرف بغاوت اور خود مختاری کی آوازیں آ رہی تھیں۔ان حالات کے پیش نظر امبھی نے آخر کار ۳۱۷ ق م میں اپنی سلطنت چندر گپت کے حوالے کر دی۔

ٹیکسلا کو باقی ماندہ ہندوستان کی نسبت ایک خاص مقام اس لیے حاصل تھا کہ یہ مغربی دنیا اور حملہ آوروں کے راستے میں تھا۔ ہندوستان میں تمام تر بیرونی حملے کابل، پشاور اور ٹیکسلا کے راستہ سے ہوتے۔اس لیے سرحد چوکی اور مقام کی حیثیت رکھتا تھا۔باقی ہندوستان کو محفوظ رکھنے کا بھی ٹیکسلا ہی ایک ذریعہ تھا۔چندر گپت کا ٹیکسلا پر مکمل قبضہ اور کنٹرول حاصل کرنے اور باضابطہ شاہی نظام حاصل کرنے کے بعد اس نے اپنے استاد کوتلیہ کو اپنا ایک سینئر وزیر و مشیر مقرر کیا۔ کوتلیہ کے پاس قانون، دفاع، اور امور داخلہ،فوجی حکمت عملی کے محکمے تھے۔ چندر گپت اس کے علاوہ کوتلیہ کو ہر اہم اور ضروری معاملات میں بھی شریک کرتا بلکہ کوتلیہ کی ہی حکمت عملی اور مشوروں سے چندر گپت اپنا ہدف یا سفر اختیار کرتے۔جبکہ کچھ مورخین کا خیال ہے کہ کوتلیہ چندر گپت کے ساتھ اقتدار میں برابر کا شریک تھا۔اگر ان دونوں کے درمیان حکومت مشترکہ نہیں تھی تو پھر یہ بات یقینی ہے کہ کوتلیہ کو حکومت میں ایک اہم حیثیت حاصل تھی۔ چندر گپت اپنا کوئی بھی قدم اپنے وزیر کوتلیہ چانکیہ کے مشورے کے بغیر نہیں اٹھاتا تھا۔دراصل تاریخ میں ہر دور میں ایسا ہوتا ہے کہ حکومت کے اندر شہنشاہ کے علاوہ تقریباً کسی ایک فرد کو مرکزی اہم حیثیت حاصل ہوتی۔ ۳۱۷ ق م تک ٹیکسلا پر مکمل کنٹرول اور قبضہ کرنے کے بعد چندر گپت موریہ کا وہ خواب جس کو وہ پورا کرنے کے لیے بے تاب تھا،اس کی کوشش تھی کہ جتنا جلد ہو سکے، وہ اپنے ملک پر قبضہ کر لے۔

انہی حالات کو سامنے رکھتے ہوئے چندر گپت نے اپنی فوجی طاقت میں اضافہ کرنے کی کوشش شروع کردی جس میں وہ کامیاب بھی ہوگیا۔ چندر گپت شمالی مغربی پنجاب کی جنگجو اقوام اور راجہ امبھی سے ورثہ میں ملنے والی فوج کے ہمراہ بدنام رشتہ داروں کی سلطنت مگدھ پر حملہ آور ہوا۔ وہ کامیاب ہوا اور فتح اس کی مقدر ٹھہری۔ مگدھ کے بادشاہ نے اپنا تخت چندر گپت کے حوالے کر دیا۔ اب مگدھ سے لے کر ٹیکسلا دریائے سندھ تک اس کی حکومت تھی کیونکہ اس وقت تک راجہ پورس قتل یا ہلاک ہو چکا تھا جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یونانی جنرل یوڈیمس جو سکندر کی طرف سے پورس اور امبھی پر نگران تھا، نے دھوکے سے پورس کو قتل کر دیا اور ہندوستان سے فرار ہو گیا۔

مگدھ پر قبضہ اور چندر گپت کی فوجی طاقت و صلاحیت کو دیکھتے ہوئے مگدھ کی عوام اس نوجوان بادشاہ کا خیر مقدم کرتے ہوئے بڑی تعداد میں اس کی فوج میں شامل ہو گئے جو نند خاندان سے تنگ تھے۔ مگدھ پر قبضہ کے بعد وہاں سے ایک بڑی فوج چندر گپت کے ہاتھ آئی۔ ۳۰۵ ق م تک مغربی ہندوستان کے تمام علاقے ایک مرکزی حکومت میں آ چکے تھے جہاں پہلے مختلف قبائل نے چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم کی ہوئی تھیں۔ اب چندر گپت کے پاس اتنی طاقت موجود تھی کہ وہ کسی طرح کے بھی بیرونی خطوں کا مقابلہ کر سکتا تھا۔ اسی دوران تقریباً ۳۰۵ یا ۳۰۴ قبل مسیح میں سکندر کے ایک جرنیل سائلوکس نیکسٹار نے اپنے پیش رو کے فاتحانہ راستے پر قدم بقدم چلتے ہوئے دریائے سندھ کو عبور کیا اور سلطنت گندھارا پر حملہ آور ہوا۔ یونانی کمانڈر کو یہ معلوم نہ تھا یا وہ اندازہ ہی نہ کر پایا کہ ہندوستان اب ایک عظیم شہنشاہت و سلطنت کے دھارے میں بدل چکا ہے اور ہندوستانی بادشاہ ایک ایسی فوجی طاقت بن چکا ہے کہ جس کو شکست دینا صرف مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن بھی تھا۔ چندر گپت کی فوجی صلاحیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کے پاس ۹ ہزار جنگی ہاتھی، ۳۰ ہزار سوار، ۶۰ ہزار پیادے اور ایک بڑی تعداد رتھوں کی بھی موجود تھی۔ یونانی فوج کو ایک سخت مقابلے کے بعد شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ سائلوکس نے بڑی ہوشیاری کے ساتھ چندر گپت سے امن معاہدہ کر لیا اور چندر گپت کی سلطنت کو تسلیم کر لیا گیا۔ ایک روایت میں

یہاں تک کہا گیا ہے کہ دونوں بادشاہ رشتہء ازدواج میں منسلک ہونے پر راضی ہوئے اور معاہدہ کے تحت یونانی جرنل نے اپنی بیٹی کا رشتہ چندر گپت کو دے دیا۔ اس کے بدلے میں چندر گپت نے تحفہ کے طور پر ۵۰۰ ہاتھی سائلوکس کو دیے۔ یونانی جرنل جب ہندوستان سے واپس ہوا تو اس نے دریائے سندھ کے مغرب میں مفتوحہ علاقے جن میں پیرو پنی، سڈنی، آریہ یا آرا کوسیہ موجودہ کابل، ہرات اور قندھارا شامل تھے، چندر گپت کی سلطنت میں شامل کر دیے۔ مغربی مورخ میگا ستھینز جس کو سائلوکس نے ایلچی کے طور پر چندر گپت کے دربار میں چھوڑا تھا، کا بیان ہے جو انہوں نے اپنی تحریر انڈیکا میں دیا کہ یہ معاہدہ ۳۰۳ ق م میں ہوا۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ ۳۰۱ ق م تک شمالی مغربی ہندوستان کا از روئے تاریخ چندر گپت وہ پہلے وائسرائے یا شہنشاہ ہے جس کی سلطنت کی سرحدیں مشرق میں گنگا اور خلیج بنگال جنوب مغرب میں بحیرۂ عرب سے ہوتی ہوئی کابل ہرات، آرا کوسیہ تک پھیلی ہوئی تھی۔ بقول میگا ستھینز چندر گپت دنیا کی ایک عظیم الشان سلطنت اور فوج کے مالک بن چکے ہیں۔ چندر گپت موریہ نے کل ۲۳ برس حکومت کی وہ ۲۹۸ ق م میں تخت و تاج سے دستبردار ہوا جبکہ ایک روایت کے مطابق اس کی طبعی موت واقع ہوئی تھی۔ اس کے بعد سلطنت کا وارث اس کا بیٹا بندوسار ہوا۔ چندر گپت کے بارے میں بہت کم تاریخی مواد دستیاب ہے بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ چندر گپت کے دورِ حکومت کے حوالے سے ایک اہم مغربی مورخ میگا ستھینز اس کے دربار میں بطور سفیر تھے، اس کے نوٹس جن کو بعد میں ایک کتاب کی شکل دے دی گئی اور انڈیکا کے نام سے مشہور ہوئی۔ حالانکہ ان بیانات کے چند اجزا محفوظ رہ گئے ہیں۔ ان بیانات کو شوان بیک نے جمع کیا اور بعد از تصحیح میگا ستھینز کے نام سے ایک کتاب کی شکل میں شائع کیا۔ جبکہ ۱۸۴۶ء میں اس کا ترجمہ میک کرنڈل نے کیا "ان شنٹ انڈیکا ایز ڈس کرائبڈ بائی" اور آرین نے اس کا ترجمہ ۱۸۷۷ء میں "میگا ستھینز اینڈ ایرین لندن ۱۸۷۷ء" کے نام سے کیا۔ حالانکہ چندر گپت کے مشیر خاص اور استاد کوتلیہ نے بھی ایک کتاب ارتھ شاستر کے نام سے لکھی جو صرف قانونی اور فوجی اصلاحات کے حوالے سے ہے۔ اس کتاب میں بھی چندر گپت موریہ کے

تاریخی حوالے سے کسی قسم کی معلومات نہیں ملتی۔اس کو میں نے بڑی مشکل سے حاصل تو کر لیا لیکن یہ قدیم تاریخ تھل کے لیے مددگار نہیں ہو سکی۔

ایک دوسری قدیم ہندی تحریر جسے ناٹک کے نام سے پکارا جاتا ہے، پانچویں صدی عیسوی میں مدارا کش نے لکھی تھی جس کا مطالعہ ہم نہیں کر سکے۔اس میں بھی چندر گپت کے خاندانی اور سیاسی صورتحال پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

بندوسار (۲۹۸ق م) اور اشوک اعظم

جب چندر گپت موریہ ۲۹۸ق م میں مر گیا یا تخت سے دستبردار ہوا تو اس کے بعد اس کا بیٹا بندوسار سلطنت کا جانشین مقرر ہوا لیکن وہ اس قابل نہیں تھا کہ اتنی بڑی سلطنت کا انتظام فوجی اور سیاسی لحاظ سے قابو میں رکھ سکے۔ بندوسار ایک مغرور اور سخت مزاج کا آدمی تھا۔ وہ اپنے شہزادگی کے دور سے ہی احمقانہ حرکتیں کرتا رہتا تھا۔تخت پر بیٹھنے کے بعد اس کے لیے مشکل کام تھا کہ وہ اپنے سیاسی حریفوں کو کنٹرول کر سکے۔سب سے پہلے تو اس نے اپنے مخالفین کی ایک بڑی تعداد کو قتل کروا دیا جس کی وجہ سے وہ ایک لقب "امترگھاٹ" سے بھی مشہور ہوا تھا جس کے معنی ہیں دشمن کش یا دشمنوں کو قتل کرنے والا۔ بندوسار نے کسی نہ کسی طرح اپنے باپ کی سلطنت کو محفوظ رکھنے کے لیے پوری پوری کوشش کی جس میں اس کے بیٹے وردھن اشوک کا بھی کافی حد تک سیاسی عمل دخل شامل تھا۔بعض روایتوں میں آیا ہے کہ حالات کی مشکلات کے پیشِ نظر بندوسار نے اپنے بیٹے اشوک کو شریک اقتدار کر لیا اور اس کو سلطنت کے شمالی مغربی علاقوں کا نائب مقرر کیا جس میں مغربی پنجاب، کشمیر اور دریائے سندھ کے مغربی علاقے شامل تھے۔ اشوک نے بطور نائب گندھارا کے مرکز ٹیکسلا کو دارالسلطنت قرار دیا کیونکہ ٹیکسلا کو اس دور میں شمال مغربی ہندوستان میں ایک اہم اور مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ اہم ادبی و مذہبی علوم اور فنون کے سبب اس کو باقی شہروں کی نسبت اہم درجہ حاصل تھا۔مغربی ہندوستان کے اعلیٰ طبقوں اور خاندان کے بچے ٹیکسلا

یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے آتے تھے۔علمی اورادبی اہمیت کے علاوہ ٹیکسلا کوایک سیاسی مقام بھی حاصل تھا۔سرسبز وشاداب جگہ جبکہ موسم گرما میں لوگ مری کی طرح ٹیکسلا کارخ کرتے تھے۔

اسی لیے اشوک نے اپنے ولی عہد کے زمانے میں سے ہی ٹیکسلا ہی کا انتخاب کیا۔ٹیکسلا ریاست گندھارا کا مرکز تھا جس کے شمالی کوہستان کے علاقوں کے ساتھ جنوب کے میدانی علاقے "تھل" تھے جو زراعت اور کاشتکاری کے لیے موزوں تھے۔دریائے سندھ اور چناب کا میدان اناج اگانے والا سب سے زرخیز علاقہ مانا جاتا تھا۔اشوک کچھ عرصہ تک ان علاقوں میں نائب کے طور پر حکومت کرتا رہا۔ ۲۷۲ ق م میں بندوسار کی وفات کے بعد اس نے سلطنت کا مکمل انتظام سنبھالا۔اشوک کی تاج پوشی ۲۶۹ ق م میں ہوئی۔اشوک کے زمانے میں موریہ سلطنت کی وسعت اور حدود کا اندازہ تقریباً صحت کے ساتھ کیا جا سکتا ہے جس کی سرحدیں شمال مغرب میں کوہستان ہندوکش اور افغانستان کا اکثر مشرقی علاقہ جبکہ موجودہ بلوچستان، سندھ اور جنوب میں سمندر تک اور مشرق میں نیپال اور کشمیر تک پھیلی ہوئی تھیں۔اشوک نے ۳۷ سال حکومت کی۔اس نے اپنے دورِ حکومت میں بہت ساری اصلاحات بھی کیں۔دور دراز شہروں کے درمیان راستے اور مہمان خانے بنوائے۔عوام کو چوروں اور لٹیروں سے بچانے کے لیے محافظ چوکیاں اور نگران مقرر کیے۔عوام کے لیے معاشی ذرائع پیدا کیے۔اشوک کی زندگی کا ایک اہم واقعہ کالنگ کی جنگ ہے جس میں تقریباً ایک لاکھ کے قریب افراد ہلاک ہوئے۔اس خونی جنگ کی وجہ سے اشوک کے اندر ایک ایسی تبدیلی آئی کہ وہ مکمل طور پر بدل گیا اور اس نے جنگ وجدال سے بالکل کنارہ کشی اختیار کرلی۔

یونانی اور پارتھی خاندان:

۱۸۵ ق م کے آخر میں موریہ بادشاہ برہدرتھ کے قتل اور موریہ سلطنت کے خاتمہ تک کوہ ہندوکش موریہ سلطنت اور باختر کے حکمران یونانی بادشاہ اوکس تھیوس کے درمیان ایک سرحد موجود تھی۔ہندوکش کے شمال مشرق میں ہندوستان کے وسیع میدانوں اور وادیوں پر جو سکندر اعظم کے

تباہ کن حملوں کے بعد ہندی صوبے جن کو یونانی جرنل سائلوکس اپنے قابو میں نہ رکھ سکا، بالآخر وہ تمام علاقے چندر گپت موریہ کے آہنی پنجے میں آ گئے۔ یہ بعد میں اشوک اور اس کے جانشین کے قبضے میں رہے۔ ہمیں اس امر میں شک کرنے کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی کہ دریائے سندھ کے مغربی علاقے کتنی حد تک سائلوکس نے اپنے ہندوستانی حریف بادشاہ کے حوالے کیے تھے لیکن اس بات کے ضرور اشارے ملتے ہیں کہ راجہ اشوک کی موت اور اس کے جانشینوں کا خاتمے تک کوہستانِ ہندوکش موریہ سلطنت کی حدِ فاصل تھا۔ یہ امر یقینی ہے کہ راجہ اشوک کی موت کے بعد فوراً موریہ سلطنت کا وہ اتحاد و یگانگت باقی نہ رہا جو چندر گپت سے لے کر اشوک کے زمانے تک تھی۔ راجہ اشوک کی موت کی وجہ سے اس سلطنت میں اس زبردست شخصیت کا اثر اٹھ گیا اور موریہ سلطنت کو اندرونی اور بیرونی خطرات نے گھیر لیا۔ ملک کے دور افتادہ علاقوں اور صوبوں کی اقوام اور قبائل نے اطاعت کا طوق اپنی گردنوں سے اتار پھینکا اور خود مختار سلطنتیں قائم کر لی۔ قدیم ہندی تحریر "وشنو پران اور وایو پران" سے معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح موریہ فوج کے سپہ سالار پشی متر نے اپنے آقا برہدرتھ موریہ کو قتل کر کے مگدھ کے تخت پر قبضہ کر لیا اور سنگ خاندان کی بنیاد ڈالی۔ اس واقعہ کا حال ساتویں صدی عیسوی کے شاعر ہبان نے تحریر کیا ہے کہ پشی متر برہدرتھ موریہ کی فوج کا سپہ سالار تھا۔ اس نے ایک موقع پر تمام فوج کو بہانے سے اکٹھا کیا اور جائزہ لینے کی غرض سے کہ وہ فوج کو بادشاہ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہے، اس موقع پر پشی متر نے تمام فوجی جرنیلوں سے سازباز اور فوج کی مدد سے برہدرتھ کو قتل کر دیا اور مگدھ کی حکومت پر بھی قبضہ کر لیا۔

پشی متر ایک قابل اور جنگجو خصلت کا مالک تھا۔ اسی وجہ سے بڑی جلدی تمام مگدھ اور قریب کے صوبوں نے اس غاصب کی اطاعت قبول کر لی۔ یہاں تک کہ کچھ مورخین کا خیال ہے، جس میں وی اے سمتھ جس نے ولنس کا بیان نقل کیا ہے اور جو تھیٹر آف دی ہندوز جلد دوم صفحہ ۳۵۳ کننگھم کرانیکل ۱۸۷۰ء صفحہ ۲۷۷ میں کہ پشی متر کی فتوحات پنجاب کے تمام میدانی علاقوں دریائے سندھ تک پہنچ گئی تھیں۔ لیکن یہ امر قرین قیاس نہیں کہ پشی متر کا موریہ سلطنت کو غصب

کرنے کے بعد کافی عرصہ تک پنجاب اور دریائے سندھ کی وادی میں تمام علاقوں پر موریہ خاندان کے آخری تاجدار قابض اور حکمران رہے۔ ان بیانات میں کافی حد تک ابہام پایا جاتا ہے کہ بقول وی اے سمتھ اور انہوں نے خود اپنی تحریروں میں ثابت کیا ہے کہ دیمیستریئس یونانی جو صوبہ باختر کا حاکم تھا، ۱۹۰ ق م کے دوران کابل اور شمالی ہند، پشاور اور ٹیکسلا پر حملہ آور ہوا جبکہ ایک بیان کے مطابق دیمیستریئس ۱۹۰ ق م تک شمالی و مغربی پنجاب کے ایک بڑے حصے پر قابض ہو چکا تھا جو ٹیکسلا سے لے کر وادیٔ سندھ کے میدانی علاقوں اور ملتان تک کے علاقے شامل تھے۔ لیکن مشرقی ہندوستان کے علاقے جس میں مرکزی مقام مگدھ شامل تھا، ۱۸۵ ق م تک پشی متر کے قبضے میں تھے۔ ممکن ہے کہ برہدرتھ کے قتل اور پشی متر کے موریہ تخت پر قبضے کے بعد خود موریہ شہزادوں نے مغربی پنجاب کے علاقے باختری بادشاہ کے حوالے کر دیے ہوں لیکن پشی متر کسی بھی طرح شمالی مغربی پنجاب کے علاقوں پر حکمران نہیں رہا اور نہ ہی دیمیستریئس اور پشی متر کے درمیان کسی جنگ یا امن معاہدہ کا کوئی حوالہ ملتا ہے۔ خود باختری حکمران بھی مغربی شمالی پنجاب اور سندھ کے کچھ علاقوں تک حاکم رہے۔ ان میں صرف مننڈر جو یوکرے ٹائیڈز کی طرف سے کابل کا گورنر تھا، یوکرے کی موت کے بعد ۱۵۵ ق م میں مگدھ اور مالوہ تک جا پہنچا لیکن یہ بہت بعد کا واقعہ ہے۔

دیمیستریئس جب دریائے سندھ کے مشرقی میدانوں پر حملہ آور ہوا تو اس وقت ان علاقوں پر موریہ خاندان کے کچھ افراد قابض تھے۔ موریہ خاندان کی کمزوری کو دیکھ کر دیمیستریئس نے ان علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ ان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ یوتھی ڈیمس کے بیٹے اور انٹی اوکس کے داماد تھے۔ انہیں باختر کا خود مختار بادشاہ تسلیم کر لیا گیا۔ اس یونانی باختری حکمران نے ۲۰ سال تک ہندوستان کے شمالی مغربی علاقوں پر حکمرانی کی جو شمال میں کوہستان ٹیکسلا سے لے کر جنوب میں دریائے سندھ اور چناب کے درمیان تمام میدانی علاقے اس کی سلطنت میں شامل تھے۔ دیمیستریئس کو اپنے ملک باختر میں اس وقت سلطنت سے ہاتھ دھونا پڑے جب اس کے ایک فوجی جرنل یوکرے ٹائیڈز نے بغاوت کر کے باختر پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد دیمیستریئس کو صرف مشرقی

صوبوں تک محدود ہونا پڑا۔ اس یونانی بادشاہ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ ایک قابل اور رحم دل بادشاہ تھا۔ اس نے ہندوستانی عوام کے دل جیت لیے۔ یہاں تک کہ دیمیستریئس "شاہ ہندیاں" کے نام سے مشہور ہوا یعنی ہندوستانیوں کا بادشاہ۔ دیمیستریئس ۱۷۵ ق م تک مغربی پنجاب پر قابض رہا لیکن اس کے متعلق ابھی تک واضح نہیں ہو سکا کہ اس کا دارالسلطنت کس مقام اور شہر میں تھا؟ صرف یہ کہ اس کی فوجی چھاؤنی دریائے سندھ اور چناب کے درمیان تھل کے علاقے میں واقع تھی جہاں اس کی یوکرے ٹائیڈز سے ۱۶۵ سے ۱۶۰ ق م میں آخری لڑائی ہوئی اور دیمیستریئس قتل یا گرفتار ہوا۔

یوکرے ٹائیڈز:

یوکرے ٹائیڈز دیمیستریئس کی فوج کا جرنل تھا اور ہندوستان پر حملہ کے وقت یوکرے کو باختر میں انتظامی امور کا سربراہ مقرر کیا گیا جس نے ۱۷۵ ق م کے دوران دیمیستریئس کے ملک سے باہر ہونے کی وجہ سے بغاوت کر دی اور باختر قابض ہو گیا۔ اکثر قبائل کو ساتھ ملانے اور ایک بڑی فوجی طاقت حاصل کرنے کے بعد خود مختاری اور خود سے شہنشاہت کا لقب اختیار کر لیا۔ خود مختاری اور فوجی قوت حاصل کرنے اور باختر کے آس پاس کے علاقوں پر اپنا تسلط قائم کرنے کے بعد اس کے دماغ میں یہ فتور بھی پیدا ہونے لگا کہ وہ اپنی سلطنت کو وسعت دینے کے لیے دیمیستریئس کے قدم بقدم چلنا چاہتا تھا۔ اپنی سوچ کو عملی جامعہ پہنانے کے لیے اس نے ۱۶۵ ق م میں اپنے چھوٹے بیٹے ہیلیوکلیز کو باختر میں بطور جانشین چھوڑا اور خود بڑے بیٹے اپالوڈوٹس کے ہمراہ ایک بڑی فوج کے ساتھ کابل پر حملہ کیا۔ کابل کے علاقوں کو باآسانی فتح کرتے ہوئے آگے مشرق کی طرف بڑھا کیونکہ خود دیمیستریئس بھی دریائے سندھ کے مشرقی میدانوں میں موجود تھا۔ یوکرے نے کابل پر اپنا قبضہ مکمل کرنے کے بعد ایک اپنے فوجی کمانڈر مننددر کو کابل میں چھوڑا اور خود اپنے بیٹے اپالوڈوٹس کے ہمراہ مغربی ہند کا رخ کیا۔ یوکرے دریائے سندھ پار کر کے شمالی گندھارا کے تمام علاقوں کو روندتا ہوا جنوبی میدانی پٹی تھل تک جا پہنچا جہاں پہلے سے دیمیستریئس اپنی فوج کے

ساتھ موجود بیٹھا تھا۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ پہلے تو دیمیستریئس کی فوج نے یوکرے کا راستہ روکا لیکن کافی جنگ وجدل کے بعد دیمیستریئس کو شکست کا سامنا کرنا پڑا اور یوکرے نے تھل کے تمام علاقوں پر تقریباً ۱۶۰ ق م سے پہلے اپنا قبضہ مکمل کرلیا۔ دیمیستریئس کو جرنل ہونے کے باوجود بغاوت کرکے اسے تھل کے تمام علاقوں سے بے دخل کر دیا۔ یوکرے اور دیمیستریئس کے درمیان آخری جنگ تقریباً ۱۶۵ سے ۱۶۰ ق م کے درمیان ہوئی۔ یہ کس مقام پر ہوئی؟ اس کے متعلق کسی بھی جگہ یا مقام کی نشاندہی نہ ہوسکی۔ جس قلعے میں یہ جنگ ہوئی، اس کے متعلق صرف اتنی معلومات بہم ہیں کہ اس لڑائی میں یوکرے کی فوج کی تعداد صرف ۳ / ۴ سو تھی جبکہ دیمیستریئس کے پاس ۶۰۰۰ ہزار فوجی تھے اور یہ لڑائی ۵ مہینوں تک جاری رہی۔ یوکرے کے تین سو فوجیوں نے ایک قلعے میں بند ہوکر دیمیستریئس کے ۶۰۰۰ ہزار فوجیوں کا مقابلہ کیا لیکن پھر بھی دیمیستریئس کی فوج کو شکست ہوئی جس کے بعد تمام مغربی پنجاب کے میدانی علاقوں پر یوکرے کا قبضہ ہو گیا۔

اپالوڈوٹس:

اپالوڈوٹس یوکرے ٹائیڈز کا بڑا بیٹا تھا لیکن اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ پارتھی النسل تھا۔ یوکرے کی ایک بیوی جو پارتھی خاندان سے تھی، اس کا بیٹا تھا۔ پارتھی قوم ایک وحشی اور جفاکش قوم تھی جو ایرانی ریگستانوں کے جنوب مشرق کی طرف بحیرۂ خضر کے بے آب وگیاہ علاقوں میں آباد تھی۔ اس کا وطن کورسموئی سگڈ وئی اور اراردی خوارزم، سمرقند اور ہرات علاقوں میں تھا اور یہ لوگ بعد میں یونانیوں کے باختر اور ایران پر قبضہ کے وقت سے فرمابردار اور اطاعت پذیر تھے۔ اپالوڈوٹس اسی خاندان سے تھا۔ غالباً وہ اپنے باپ یوکرے کے ہمراہ کابل اور ہندوستان پر فوجی مہم میں ساتھ تھا۔ ان دونوں باپ بیٹے نے کابل اور مغربی ہندوستان کے علاقوں کو فتح کیا۔ ان تمام فتوحات کے بعد باپ بیٹے کے درمیان اس بات پر اختلاف پیدا ہو گیا کہ اپالوڈوٹس چاہتا تھا کہ ہندوستان کے مفتوحہ علاقے اس کی حکمرانی میں ہونے چاہیں لیکن یوکرے نے پہلے تو باختر کا حکمران اپنے چھوٹے بیٹے ہئیلیوکلیز کو مقرر کیا جبکہ کابل میں ایک فوجی کمانڈر منندر کو چھوڑا اور اب وہ

پنجاب کے قبضہ والے علاقوں پر کسی دوسرے آدمی کو سربراہ مقرر کرنا چاہتا تھا۔ اس پر اپالوڈوٹس نے بغاوت کر دی اور اپنی فوج سے ساز باز کر کے دریائے سندھ کے مشرق موجودہ تھل کے کسی مقام پر اپنے باپ یوکرے کو قتل کر دیا۔ اپالوڈوٹس کے دل میں یوکرے کے خلاف دشمنی اور حسد کی ایک ایسی آگ بھڑک رہی تھی کہ اس نے باپ کی لاش کو دفن بھی نہ کرنے دیا۔ اس طرح اپالوڈوٹس ۱۶۰ ق م کے قریب ان تمام علاقوں کا از خود حاکم بن گیا جو اس نے یوکرے کے ساتھ مل کر فتح کیے تھے۔ اس نے شہنشاہ کا بھی لقب اختیار کر لیا اور اپنے نام کے سکے بھی جاری کر دیے۔ یاد رہے کہ ان تمام باختری حکمران کے متعلق جنھوں نے مغربی ہند کے میدانوں پر قبضہ کیے رکھا، کے متعلق کسی مرکزی جگہ یا مقام سے متعلق کوئی نشاندہی نہیں ہوتی اور نہ ہی یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کس کس شہر میں اپنا مرکز قائم کیے ہوئے تھے۔ اسی طرح اپالوڈوٹس سے منسوب کسی شہر یا قلعہ کے بارے وضاحت سے کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن اس کے نام کے کچھ سکے ہمیں ملے ہیں جو ہندوستانی سکوں سے سائز اور وزن میں بھاری تھے۔ یہ سکے بندۂ ناچیز کے گاؤں "روڑاں" کے کھنڈرات میں پائے گئے ہیں۔ ممکن ہے کہ ان کا مرکز یہ علاقہ جو آجکل روڑاں کے نام سے مشہور ہے، رہا ہو لیکن اس کے بارے سوائے سکوں کے کوئی ٹھوس شواہد نہیں ملے۔ اپالوڈوٹس نے مغربی پنجاب موجودہ تھل کے علاقوں پر کتنا عرصہ حکومت کی؟ اس کے بارے میں صرف یہ بیان کیا گیا ہے کہ جب ہیلیوکلیز کو خبر موصول ہوئی کہ اپالوڈوٹس نے اپنے باپ یوکرے کو قتل کر کے مفتوحہ علاقوں پر خود حاکم بن چکا ہے تو اس نے کابل کے گورنر منندر کو ایک مراسلہ بھیجا جس میں حکم دیا گیا تھا کہ وہ اپالوڈوٹس پر حملہ کر کے اس کو زندہ یا مردہ گرفتار کر کے باختر اس کے پاس بھیج دے۔ کیونکہ منندر باختری حکمران کے تحت کابل پر حکومت کر رہا تھا۔ منندر نے تقریباً ۱۵۶ یا ۱۵۵ ق م میں جب مغربی پنجاب کے ان علاقوں پر حملہ کیا تو اس وقت وہاں باختری فوج کی طرف سے ایک دوسرا کمانڈر سرئیو اول حاکم موجود تھا اور اپالوڈوٹس پہلے ہی مر چکا تھا یا قتل ہو چکا تھا۔ اس کی ہلاکت کے متعلق دو روایتیں ہیں۔ ایک یہ کہ یوکرے کی موت کے تھوڑا عرصہ بعد باختری فوج

نے بغاوت کر کے اپالوڈوٹس کو قتل کر دیا اور تمام علاقوں کا انتظام سرئیواول جو فوج کا ایک جرنل تھا، کے سپرد کر دیا جبکہ دوسری روایت میں یہ کہا گیا ہے کہ اپالوڈوٹس طبعی موت مرا اور اس کے بعد بطور جانشین سرئیواول نے انتظام سنبھالا۔ جب مننددر نے ان علاقوں پر فوج کشی کی تو اس وقت اس کی سرئیواول سے جنگ ہوئی۔

مننددر اور سرئیواول:

باختر کے بادشاہ ہئیلیو کلیز کے حکم پر کابل کے گورنر مننددر نے دریائے سندھ کے اس پار مغربی پنجاب کے میدانی علاقے تھل پر حملہ کیا تو اس وقت یہاں باختری فوج کا ایک جنرل حکومت کر رہا تھا۔ مننددر تقریباً ۱۵۵ ق م میں پنجاب پر اس غرض سے حملہ آور ہوا کہ وہ اپالوڈوٹس کو ہلاک یا گرفتار کر کے باختر بھیج دے لیکن اپالوڈوٹس پہلے ہی مر چکا تھا۔ مننددر جب ان علاقوں میں پہنچا تو اسے کسی قسم کی مزاحمت کا سامنا نہ کرنا پڑا بلکہ سرئیو نے مننددر کے آگے ہتھیار ڈال کر خود اس کی فوج میں شامل ہونے کا اعلان کر دیا۔ سرئیواول نے کیوں مننددر کے سامنے ہتھیار ڈال کر اطاعت قبول کر لی؟ اس کی دو وجوہات ہوسکتی ہیں۔ ایک یہ کہ سرئیو نے باختری فوج سے مل کر بغاوت کی اور اپالوڈوٹس کو قتل کیا، اس غرض سے کہ وہ ہئیلیو کلیز باختر کے بادشاہ سے وفاداری قائم رکھ سکے اور دوسری یہ کہ جب مننددر نے ان علاقوں پر حملہ کیا، جہاں سرئیو قابض تھا اور سرئیو کی فوجی حالت انتہائی کمزور ہو چکی تھی، باختری فوج اور اور سردار کئی حصوں میں بٹ چکے تھے اور خود مختاری کا اعلان کر دیا، ان حالات کے پیش نظر سرئیو مننددر کی فوجی طاقت سے مقابلہ کرنے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے اس نے مننددر کے ساتھ اطاعت اور وفاداری اور امن معاہدہ کر لیا لیکن کوئی بھی وجہ ہو، یہ ظاہر ہے کہ مننددر نے سرئیو کے حصے کی فوج کے ساتھ مشرق کی طرف پیش قدمی کی اور دریائے جہلم کو پار کر کے سنگ کے اقتدار پر حملہ کیا جو مشرقی ہند پر حکمران تھا۔ سنگ خاندان کا ایک فرد پشی متر جس نے آخری موریہ بادشاہ برہدرتھ کو قتل کر کے مگدھ تخت پر قبضہ کر لیا تھا، نے سنگ بادشاہ نے مننددر کے حملے کو روکا اور مننددر کا حملہ ناکام ہو گیا۔

اس جنگ کے متعلق صرف اتنا کچھ معلوم ہے کہ یہ تقریباً ۱۵۲ یا ۱۵۱ ق م میں ہوئی تھی جبکہ ایک دوسری شہادت جس میں پشی متر کی وفات ۱۴۹ ق م میں ہوئی اور پشی مترا اور منندر کے درمیان جنگ ضروری ہوئی تھی لیکن دو سال پہلے واقع ہوئی تھی۔ منندر کو جب پشی متر کے مقابلے میں شکست کا سامنا کرنا پڑا تو اس نے مغربی پنجاب کے ان علاقوں پر اپنی گرفت مضبوط کر لی اور دریائے راوی تک تمام علاقوں پر اپنی گرفت کو مضبوط کیا۔ منندر کے حملے سے متعلق ایک اہم شہادت سٹر یبو باب ۱۱ / ۱۵ حصہ ۱۱ / ۲ فصل ۱ / ۳ کا راوی اپولوڈورس ارٹی مٹیا کا باشندہ تھا۔ ان کا بیان ہے کہ منندر نے دریائے ہائی پے فس (بیاس) جو سکندر کے حملے کی حد تھا کو عبور کیا اور اسامس تک بڑھتا چلا گیا۔ یہ معلوم نہیں کہ اسامس کا شہر کس جگہ واقع تھا۔ منندر آخر کار جنوب مغرب کی طرف سراشٹر کاٹھیا واڑ اور دریائے سندھ کے مثلثی دہانے کے مقام سیروئیس تک کے علاقوں کو زیرنگیں کیا جبکہ دریائے سندھ کے مغربی ساحلی علاقے موسومہ سگرڈس جو غالباً راجن پور اور رحیم یار خان اضلاع میں واقع تھے، تک اپنی سلطنت کی سرحدیں بڑھا لیں۔ ان بیانات کی مزید تائید پری پیلس یا پلس کے مصنف کے بیان سے ہوتی ہے۔ یہ کتاب ۸۰ء میں لکھی گئی تھی۔ جس نے پہلی صدی عیسوی کے اختتام پر یہ دیکھا تھا کہ اپالوڈوٹس اور منندر کے یونانی سکے بیری گیزا (بھڑوچ) کی بندرگاہ میں عام طور پر رائج تھے لیکن منندر کے سکے گنگا اور جمنا کی وادی میں پائے گئے۔ ان کی شہادت کے لیے ایک قدیم ہندو نجومی پتن جلی کے بیانات جو سنسکرت میں علم ہیت کی کتاب موسومہ (گارگی سمہتا) پتن جلی کے ان الفاظ کو کئی مورخین نے تحریر کیا ہے جن میں پروفیسر بھنڈارکر، گولڈسکر شامل ہیں۔ انہوں نے پتن جلی کے سن وفات کو ۱۵۰ ق م قرار دیا ہے (ہسٹری آف انڈین لٹریچر) جبکہ انڈین انٹی کویری ۱۹۰۴ء صفحہ ۲۱۷ کا بیان ہے کہ منندر کے سکے پنجاب اور اس سے آگے دریائے جمنا کے جنوب میں میں ہیلم پور کے ضلع میں پائے گئے ہیں جو مصنف کے پاس لائے گئے تھے۔

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ منندر بہت آگے تک اپنی سلطنت کو وسیع کرنے میں کامیاب ہو

گیا تھا۔ منندر کو دو سال بعد مجبوراً واپس آنا پڑا کیونکہ منندر کو اپنی ہی سلطنت میں کئی خطرات لاحق تھے جن کے لیے وہ اپنی طاقت صرف کرنا چاہتا تھا۔ اس کے اپنے وطن کے ہمسایوں سے کئی تنازعات تھے۔ منندر ۱۴۸ ق م میں مر گیا۔ اس کی موت کے بارے میں ہمیں کوئی تفصیل نہیں ملی۔ اس کی موت کے بعد سرئیو اول پنجاب اور کابل کا حکمران بنا۔ منندر کے بارے مشہور ہے کہ وہ ایک نہایت عادل حکمران تھا۔ جب وہ مرا تو اس کا جنازہ بڑی دھوم دھام سے اٹھایا گیا۔

اب باختری افواج کی کمان سڑئیو اول کے ہاتھ میں تھی اور دریائے جہلم اور سندھ کے علاقے "تھل" سے لے کر کابل تک کا علاقہ اس کی دسترس میں تھا۔ سڑئیو اول نے ٹیکسلا کو اپنا مرکز بنایا اور ۱۴۰ ق م تک امن و امان کے ساتھ حکومت کی لیکن ۱۳۸ ق م کے دوران ایران کے پارتھی بادشاہ متھراڈیٹس جو ایک طاقتور اور لائق حکمران تھا، نے اپنی سلطنت کو وسعت دینے کے لیے دریائے سندھ اور بیاس کے درمیان تمام اقوام اور علاقوں کو اپنے ساتھ ملحق کر لیا۔ مورخ ویٹس کے مطابق ٹیکسلا اور مغربی پنجاب "تھل" کے سردار اپنے آپ کو ایرانی یا پارتھی بادشاہ کے زیرِ فرمان تصور کرتے تھے۔ ان حالات سے اس بات کے اشارے ملتے ہیں کہ ۱۴۰ ق م کے بعد سڑئیو اول کی گرفت ملک میں کمزور ہو گئی تھی یا پھر سڑئیو ۱۴۰ ق م کے قریب ہی مر گیا جس کے بعد اس کے پوتے سڑئیو ثانی نے حکومت سنبھالی۔ وہ بظاہر ٹیکسلا کے مقام پر ہی تھا کہ چند غیر ملکی جنگجو سرداروں کو، جو ممکن ہے کہ سک ہوں یا ایرانی یا پارتھی ہوں، اس نے بے دخل کر دیا۔ اس بات کے اشارے بھی ملتے ہیں کہ سڑئیو ثانی فلو پیٹر نے پارتھی بادشاہ غالباً متھراڈیٹس (ثانی) جو فراٹیس اور ارتابانس کے بعد ۱۲۵ ق م میں پارتھی سلطنت کا حاکم بنا اور اس نے شہنشاہ اعظم کا لقب بھی اختیار کیا۔ ایرانی طاقت پھر سے لوٹ آئی۔ اس طاقتور بادشاہ نے ان صوبوں کا انتظام جن پر پہلے دونونیس اور ان کا خاندان حکمران تھا، اپنے ہاتھ لیے اور اس کے علاوہ پنجاب کے دور افتادہ صوبے موجودہ تھل پر بھی اپنا شہنشاہی حق نئے سرے سے قائم کر لیا۔ اس طرح دریائے سندھ کے مشرقی میدانی علاقے ٹیکسلا تک ایک مرتبہ پھر ایران کی نگرانی میں چلے گئے لیکن دوسری طرف ۱۲۰ ق م تک مغربی پنجاب کی صورتِ حال کچھ غیر یقینی سی نظر آتی ہے جہاں پارتھی باختری،

سک اور ہندی اقوام اور سردار گڈ مڈ ہو چکے تھے۔ یہاں کشانوں کی آمد سے پہلے کئی ایک بادشاہ نام و بے نام کا ذکر کیا گیا ہے جن کی تفصیل اگلے باب میں آئے گی۔

سک اقوام

سک ایک بڑی قوم یا قبائل میں شمار ہوتے تھے۔ سک قوم میں سک کے علاوہ مختلف قبائل بھی شامل تھے۔ ان کی جائے پیدائش بقول مورخ سٹر یبو (ترجمہ وی اے سمتھ صفحہ ۳۴۳ حوالہ نمبر ۲) دریائے جیچوں سیر (سیر دریا، آمو دریا) اور اس کے گردونواح کے علاقے تھے۔ کینگر النسن (ترجمہ ہیروڈوٹس جلد ۲ صفحہ ۴۰۳۔ جلد ۵ صفحہ ۱۷۰) کے مطابق سک قوم کاشغر اور یارقند کے علاقوں میں آباد تھی۔ وی اے سمتھ دی سکازان ناردرن انڈیا (زیڈ۔ ڈی۔ ایم۔ جی ۱۹۰۷ء صفحہ ۴۰۳/ ۴۲۱) اور ڈاکٹر ایف۔ ڈبلیو ٹامس (جے۔ آر۔ ایر۔ ایس ۱۹۰۶ء صفحہ ۴۲۰-۴-۱۸۱-۲۱۶) کی بحث کے مطابق سک قوم ۱۶۰ ق م سے پہلے دریائے جیچوں جسے آمو دریا بھی کہا جاتا ہے، کے علاقوں میں آباد تھے جو اب روسی فیڈریشن کے جنوب مشرق میں واقع ہے۔ تقریباً ۱۶۰ ق م کے قریب ہی یو چی قبائل جو چین سے نقل مکانی کر کے آئے تھے، نے سکوں کی چراگاہوں پر قبضہ کر لیا اور مجبوراً سک قوم کو اپنے ہم وطن قبائل کے ساتھ مل کر جنوب کی طرف نقل مکانی کرنی پڑی۔ ان خانہ بدوش قبائل کے حملے کا سیلاب باختر اور پارتھی پر پڑا۔ پارتھی بادشاہ فراٹیز ثانی جو متھراڈیٹس کا جانشین تھا، سک قبائل کے حملے کو روکنے کے لیے آگے بڑھا۔ تقریباً ۱۲۷ ق م ان کے درمیان جنگ ہوئی جس میں فراٹیز مارا گیا اور سک قوم نے باختر اور پارتھیا کے اکثر علاقوں پر قبضہ کر لیا لیکن فراٹیز کے جانشین ارتابانس اول نے بھی ان وحشی قبائل کا راستہ روکنا چاہا اور شکست کھا کر مارا گیا۔ باختر میں آخری یونانی بادشاہ ہیلیوکلیز تھا جو پہلے ہی پارتھی اور ایرانی طاقت کے عروج کی وجہ سے کمزور پڑ رہا تھا لیکن سک قوم کے حملوں کے بعد تو یونانی سلطنت ہندوکش کے شمالی علاقوں سے ہمیشہ کے لیے کالعدم ہو گئی۔ پارتھیا اور باختر پر اپنا قبضہ مکمل

کرنے کے بعد سک قبائل نے مشرق اور جنوب دونوں اطراف پیش قدمی کی۔

ان میں سے کچھ گروپ نے جنوب کی طرف دریائے ہیلمند ر (اریمینڈس) کی وادی کی طرف جو "سکستینے" یعنی ملک سک کے نام سے مشہور ہوا، اس پر سک قوم نے قبضہ کرلیا۔ جبکہ دوسرا اس وحشی قبائل کے جنگجو جتھوں، جو ہندوستان کے شمالی مغربی دروں میں، شمالی مغربی پنجاب میں داخل ہوئے، نے سب سے پہلے ٹیکسلا کے مقام پر اور دریائے جمنا کے کناروں پر آبادیاں قائم کیں۔ ان میں سے ایک قبیلہ مزید جنوب کی طرف بڑھا اور سراشتر یا کاٹھیاواڑ کے جزیروں پر قابض ہوگیا۔ یہاں انہوں نے سک خاندان کی بنیاد ڈالی جو تقریباً ۳۹۰ء تک حکومت کرتے رہے۔ آخر میں چندر گپت ثانی بکر جیت نے ان کو شکست دی۔ دوسری طرف ٹیکسلا کے مقام پر یونانی بادشاہ سٹرٹیو اول، جو اپالوڈوٹس اور منندر کے بعد کابل اور پنجاب کا حاکم بنا تھا، کا پوتا سٹرٹیو ثانی فلو پیٹر مغربی پنجاب (موجودہ تھل اور ٹیکسلا) کے علاقوں پر قابض تھا۔ بقول وی اے سمتھ صفحہ ۲۸۳ باب-۹ چند غیر ملکی صوبیدار یا گورنر کمانڈروں نے، جبکہ مورخ مزید لکھتا ہے کہ ممکن ہے یہ سک ہی ہوں جنھوں نے فلو پیٹر کو بے دخل کر دیا، یہ بات وضاحت سے بیان کی گئی ہے کہ جنوبی میدانی پٹی "تھل" متھرا اور ٹیکسلا کے حملہ آوروں کے درمیان قریبی تعلق تھا۔ ان گروپوں کے سرداروں یا سربراہوں کا لقب "سترپ" تھا۔ سترپ ایرانی زبان کا لفظ تھا جس کے معنی ہیں "گورنر" یا "صوبیدار" اور درست معنی صوبیدار ہوسکتا ہے کیونکہ تمام کے تمام سک سرداروں کو سترپ کا خطاب دیا گیا تھا۔ یہ سک سترپ ایرانی، شکانی اور پارتھی حکمرانوں کے ماتحت تھل اور شمال مشرقی علاقوں پر حکومت کرتے تھے۔ پہلے یہ سردار اپنے اپنے علاقوں پر قابض تھے جیسا کہ متھرا کے سترپ ٹیکسلا اور جنوبی علاقے تھل کے سترپ جو اپنی اپنی ریاستوں میں رہ کر ایرانی سلطنت کے ماتحت کام کرتے تھے۔

آخر کار ۱۲۰ ق م کے قریب ہی میوس ایک ایسا بادشاہ تھا جو بظاہر ان ہندی پارتھی بادشاہوں میں سب سے پہلا تھا جو پنجاب کا مالک بنا اور شہنشاہ اعظم کا لقب اختیار کیا، نے اپنے نام کا سکہ بھی جاری کیا جس کے ایک طرف ہاتھی کا سر اور دوسری طرف گریک زبان میں بادشاہ کا

نام اور نشان فتح بل سسپنڈ نڈ تھا۔ وزن میں یہ سکے ۱۳۰ گرام کے ہیں۔ یہ وہ پہلا بادشاہ تھا جس کا تعلق سک خاندان اور ایرانی پارتھی حکمرانوں سے تھا۔ میوس صرف مغربی پنجاب یعنی دریائے سندھ سے لے کر دریائے بیاس اور راوی تک کے علاقوں کا حکمران تھا۔ خاص کر تھل کے علاقے اس کی حکومت میں شامل تو تھے لیکن ان میدانی علاقوں "تھل" میں ایک سے زائد سک یا ہندی پارتھی جن میں باختری یونانی گروپ بھی شامل تھے، نیم خودمختاری کے تحت اپنے اپنے علاقوں میں حکومت کرتے تھے۔ ان سرداروں کا تعلق براہِ راست ایرانی حکومت سے بھی تھا اور میوس کی عارضی اطاعت گزاری بھی کرتے تھے کیونکہ تھل کے میدانی علاقے ہمیشہ سرکش جنگجو سرداروں کے قبضے میں رہے تھے۔ اگر کسی مرکزی حکومت کا ان پر دباؤ پڑتا تو یہ عارضی طور پر اطاعت قبول کر لیتے اور جب بھی موقع ملتا پھر سے خودمختیاری کا اعلان کر دیتے تھے۔ پہلی اور دوسری صدی قبل مسیح کے دوران مغربی ہندوستان کی سیاسی صورتحال ایسی غیر یقینی تھی کہ یہ اندازہ لگانا کہ کس وقت اور کہاں کون بادشاہ تھا؟ مشکل ہے۔ ۱۴۰ ق م کے بعد ۱۲۰ / ۱۳۰ ق م کے دوران ایران کی پارتھی حکومت کا مغربی ہند پر کافی حد تک اثر رسوخ تھا۔ ہندی پارتھی حکمرانوں کی تاریخ مرتب کرنے والوں کے پاس صرف اور صرف وہ مواد تھا جو ان سکوں کے نتائج سے اخذ کیا گیا تھا۔ ہمارے پاس ان کا تاریخی مواد اس قدر کم ہے کہ ہم اگر ناقابلِ تردید واقعات کا ایسا سلسلہ قلم بند کریں جو حقائق پر مبنی ہو، ناممکن ہے۔ اس لیے ان نتائج کو جو بڑی حد تک محض خیالی یا قیاسی ہوں، ہم نے ان باتوں کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے مذکورہ مورخین کی آرا کے مطابق تمام واقعات کو خواہ وہ یقینی ہوں یا قیاسی، قلم بند کر دیا ہے۔ ناظرینِ کتاب کو یہ بات یاد رکھنا چاہیے کہ جو مناظر یا واقعات اس کتاب میں دیے گئے ہیں، ان سب میں چند سالوں یا دہائیوں کی گنجائش موجود ہے۔ اب رہا سکہ، مطلب یہ کہ میوس کب تک پنجاب کا حکمران رہا، میوس جو غالباً ۱۲۰ ق م میں پنجاب کے علاقوں کا حکمران تھا، فان سیلٹ ''فان گشمڈ'' صفحہ ۱۴۰ میوس یا تامیئس کے نام کے ساتھ مٹا کیز جو گا گیمیلا یا اربیلا کے مقام پر دارا کے سک سوار اور تیر اندازوں کا سردار تھا۔ ممکن ہے کہ اس کو

بعد میں پنجاب کا حکمران بنا دیا گیا ہو لیکن دوسری طرف اس بات کے اشارے بھی ملتے ہیں کہ ایرانی بادشاہوں کی کمزوری اور مرکزی حکومت کا ہندوستانی دور افتادہ علاقوں پر آہنی پنجہ ڈھیلا پڑ جانے سے میوس، جو ممکن ہے کہ سک قوم سے ہو، نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور پنجاب پر قابض ہو گیا جو تقریباً ۹۰ ق م تک رہا۔ اس کے بعد ازلیس اس کا جانشین بنا۔ ازلیس کے جانشینوں میں ازیلیس اور ازلیل ثانی کے نام آتے ہیں۔

یہ ایک عرصہ تک پنجاب پر حکومت کرتے رہے لیکن آخری صدی قبل مسیح کے دوران پنجاب یا شمالی مغربی ہندوستان میں دو خاندان جن سے متعلق مسئلہ اور زیادہ تاریک ہو گیا کہ تمام مصنفین نے ان دو خاندان جن میں سک اور ہندی پارتھی شامل تھا، کے بارے میں کوئی نشاندہی نہیں کہ یہ خاندان کب اور کہاں کہاں قابض تھے؟ یہاں ایک صدی یعنی سو سالہ دور دھندلا سا لگتا ہے لیکن پہلی صدی عیسوی کے دوران ایک یونانی سیاح اپالونیئس نے ہندوستان کا سفر کیا اور اس نے پارتھی بادشاہ بز ڈینس یا ورڈینس یونانی بادشاہ سے دو مرتبہ ملاقات کی جو بابل میں مقیم تھا۔ اس کی حکومت کا سن ۳۹ / ۴۷ء کے قریب معلوم ہوتا ہے۔ اس سیاح کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ٹیکسلا کا بادشاہ بالکل خود مختیار تھا۔ اس کے متعلق اپالونیئس نے باب ۱ / ۲ فصل ۲۸ / ۱۷ بحوالہ وی اے سمتھ صفحہ ۳ / ۲ باب ۹ لکھا ہے کہ وہ خود مختیار بادشاہ فرویٹس تھا جس کا تعلق سک قوم سے ہوسکتا ہے۔ ایک دوسری شہادت پری پلس، یہ کتاب غلطی سے آرین سے منسوب کی جاتی ہے، اس کا ترجمہ میک کرنڈل نے "انڈین انٹی کویری" ۱۸۷۹ء اور شراف نے ۱۹۱۳ء میں کیا ہے جبکہ ریناڈ نے آخری دفعہ کیا۔ ان تینوں مورخین کے مطابق اس کتاب کا سن اشاعت میک کرنڈل نے ۸۰ / ۸۹ء اور ریناڈ نے ۲۴۶ / ۲۴۷ء اور شراف نے ۶۰ء کہا ہے۔ وی اے سمتھ نے ان تمام کے بیانات کو بڑی تفصیل سے تحریر کیا ہے کہ پری پلس کے مصنف کے مطابق دریائے سندھ اور جہلم کے درمیان علاقے موجودہ تھل پر پارتھی اور دوسرے سردار چھوٹی چھوٹی ریاستوں پر قابض تھے اور آپس کی خانہ جنگی میں مبتلا رہتے تھے۔ سیاح نے اس علاقے کو سیتھیا کا نام دیا ہے۔ اس

علاقے کے شہر کا نام متنگر جہاں دارالسلطنت واقع تھا، اندرونِ ملک آباد تھا۔ یہ سردار اپنے اپنے علاقے اور قوم پر اختیار رکھتے تھے۔

ساتھ ہی ان سرداروں نے اپنے اپنے نام کے سکے بھی جاری کر رکھے تھے۔ یہ کرنسی مقامی طور پر تیار کی جاتی تھی اور صرف ان کے ہی علاقے تک ان سکوں سے لین دین ہوتا تھا۔ ایک وقت میں اور ایک ساتھ مغربی پنجاب کے علاقوں میں ایک سے زیادہ نام کے سکے جاری ہونے کی وجہ سے ہمیں کسی مرکزی بادشاہ کے متعلق جاننے اور ایک مکمل تاریخی سلسلہ قائم کرنے میں مشکل پیش آرہی ہے۔ آخری صدی ق م میں کون سے حالات رہے اور کون کہاں قابض تھا؟ حتمی نہیں لیکن یوچی کشان بادشاہ کڈ فائس اول جس کو باقاعدہ ۱۵ء تک بادشاہ تسلیم کرلیا گیا، اس نے کابل کے تخت سے میوس ثانی کو اتار کر قبضہ کرلیا جبکہ مغربی پنجاب کے علاقوں میں قابض پارتھی سرداروں میں آخری بادشاہ جس کا نام مصنف نے "خیرہ" کہا یا کوئی اور بھی ہوسکتا ہے تو اس کو کشان بادشاہ کنشک نے ۱۰۸ء سے پہلے شکست دی۔ اس واقعہ کے بعد پہلی صدی عیسوی کے آخر اور دوسری صدی کے اول میں پنجاب پر کشان مکمل قابض ہو گئے تھے۔ دریائے سندھ کے مشرق کے علاقے "تھل" میں آخری حکمران جو پارتھی یا سک قوم سے ہو، کے متعلق کوئی واضح ثبوت نہیں ملتا۔ صرف روڑاں کے مقام سے اس آخری بادشاہ کے سکے کافی تعداد میں ملے ہیں جو گمنام بادشاہ کے نام سے مشہور ہے۔ بادشاہ کڈ فائس نے جب مغربی پنجاب پر حملہ کیا تو اس وقت وہ یہاں قابض تھا۔ مورخ کے مطابق ان دونوں نے "سوٹر" کا لقب اختیار کیا اور یہ ان کی غلطی ہے کیونکہ کشان بادشاہوں میں کسی نے بھی سوٹر کا لقب استعمال نہیں کیا۔ سوٹر کا لقب صرف یونانی النسل بادشاہ اختیار کرتے تھے۔ سوٹر میگس ہی تھا جن کو سکوں میں گمنام کہا گیا ہے۔ ممکن ہے کہ کشانوں کی بڑھتی ہوئی طاقت نے ان کو مغلوب کرلیا ہو اور پارتھی بادشاہ نے کشان بادشاہ کی اطاعت قبول کر لی ہو۔ کچھ مورخین نے اس گمنام بادشاہ کا نام سیا سریٹاس یا ڈایونی ٹیس تحریر کیا ہے جبکہ کٹیلاگ آف کائنز ان دی انڈین میوزیم جلالی اول اور نیوسمیٹک کرایکل ۱۸۹۲ء صفحہ ۱۷ بحوالہ

وی اے سمتھ صفحہ ۳۱۳ میں گمنام بادشاہ کا نام سیا سریٹاس تھا جو کشان شہنشاہ کڈ فائس دوئم کی مقبولیت سے مغلوب ہو کر خود ان کی اطاعت قبول کر لی اور کشان بادشاہ کے ماتحت انہوں نے ۲۰ / ۳۰ء تک مغربی پنجاب کے علاقوں خاص کر موجودہ تھل پر قابض رہا لیکن ان کے بعد دوسرا کوئی بھی باختری یا پارتھی سردار برسراقتدار نہیں آ سکا۔

یوچی قبائل

یوچی قبائل چین کے شمالی مغربی صوبہ کن سیٔہ کے رہنے والے تھے۔ یہ ایک علیحدہ نسل کے لوگ تھے اور ان کا منگولی اقوام سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ یوچی لوگوں کا حلیہ کچھ یوں تھا کہ رنگ ان کا گلابی قد لمبا اور چوڑے چہرے پر چپٹی ناک تھی۔ تقریباً ۱۷۰ / ۱۶۵ ق م کے دوران ان لوگوں کو اس وقت مجبوراً نقل مکانی کرنا پڑی جب چینی شہنشاہ چی ان ہوانگ لئی جس نے چین کی حدود اور مملکت کو وسعت دینے کے لیے اور تمام تر چینی علاقوں پر قبضہ کرنے کی مہم سے ہوانگ لئی اور یوچی اقوام کے درمیان جنگ ہوئی، جس میں یوچی قبائل کو شکست ہوئی اور اس وجہ سے ان کو بہت سارے مسائل سے دوچار ہونا پڑا اور اس شکست کی وجہ سے یوچی اقوام کو اپنے علاقوں سے نقل مکانی کرنا پڑی۔ ان کے بعد یوچی اقوام کے علاقوں پر ایک دوسری قوم جو اکثریت میں یوچی اقوام سے زیادہ تھی، جو ترکی نام سے مشہور تھی، نے شہنشاہ چی ان ہوانگ لئی کی قیادت میں قبضہ کر لیا۔ یوچی اقوام نے اپنے علاقوں اور اپنے صوبے کو خیرباد کہہ کر مغرب کی طرف اپنا سفر شروع کیا۔ یوچی قبائل میں ایک سے زائد اقوام شامل تھی اور ان کی کل تعداد تقریباً پچاس ہزار سے ایک لاکھ نفوس پر مشتمل تھی جبکہ ان لوگوں کا ذریعہ معاش مویشی پالنا تھا۔ اس لیے ان کے پاس مویشیوں کے بہت بڑے ریوڑ تھے جس کے لیے ان کو کھلی اور آزاد چراگاہیں تلاش کرنے کی اشد ضرورت تھی۔ یوچی قبائل نے مغرب کی طرف تکلماں راجنی صحرائے گوبی کے شمال میں واقع دریائے ایلی دوسن کے جنوبی معاون تکلے کی وادی جس کو مقامی طور پر کنگیز کہا جاتا تھا، کی میدانی

پٹی میں پہنچے تو یہاں ان کی لڑائی وہاں کی مقامی آباد کار چھوٹی سی قوم جو" دوسُن" کے نام سے مشہور تھی، سے ہوئی۔

دوسُن کی کل تعداد ۱۰ ہزار تیر اندازوں پر مشتمل تھی۔ اپنے ملک کو بچانے کے لیے اپنے سے کئی گناہ بھاری طاقت ور دشمن کے ساتھ جنگ کے لیے تیار ہو گئے کیونکہ یوچی کے پاس تقریباً ایک لاکھ کے قریب تیر انداز جنگجو موجود تھے۔ اس لڑائی میں دوسُن کو شکست ہوئی۔ یوچی نے مقامی سرداروں کو قتل کر دیا اور ان کی جاگیروں اور چراگاہوں پر مکمل قبضہ کر لیا۔ کچھ عرصہ اپنے مفتوحہ علاقے میں رہنے کے بعد یوچی قبائل مزید جنوب مغرب کی طرف سرسبز چراگاہوں اور کھلے علاقوں کی تلاش میں آگے بڑھے اور یہاں سے یوچی قبائل نے دو الگ الگ راستے اختیار کیے۔ ایک مغرب اور دوسرا جنوب کی طرف۔ یوچی کا ایک حصہ جنوب کی طرف آگے بڑھ کر تبت کی سرحد پر آباد ہو گیا اور یہ لوگ آخر میں قلیل یوچی کہلائے۔ ان کے ایک بڑے حصے نے مغرب کی طرف جھیل ایسک، جس کو چینی سیاح ہیوں سانگ نے جھیل تسنک کا نام دیا ہے، سے بھی آگے نکل گئے۔ یہاں پر ایک مرتبہ پھر یوچی قبائل کا سامنا وہاں کی موجود قوم سک سے ہوا جو دوسن کی طرح جنگجو اور مشہور تھی۔ یہ سک قوم دوسن کے مغرب میں دریائے جیجوں اور سیر دریا کے شمال میں آباد تھے۔ اب یہ علاقے موجودہ ازبکستان، ترکمانستان، وسطی ایشیاء کی ریاستوں میں ہیں۔ سک قوم نے بھی یوچی کا مقابلہ کیا اور لڑائی میں کم تعداد ہونے کی وجہ سے سک قوم کو شکست ہوئی اور ان کو اپنے علاقوں سے نقل مکانی کرنا پڑی۔ ایک مرتبہ پھر یوچی اقوام نے ان مفتوحہ علاقوں پر اپنی آباد کاری شروع کی اور یہ فاتح اقوام ان علاقوں میں رچ بس گئے۔ یہاں پر کچھ عرصہ امن سے گزارنے کے بعد پھر یوچی قبائل کو اس وقت جنگ کا سامنا کرنا پڑا جب دوسن قبائل اپنی شکست اور سرداروں کے قتل کا بدلہ لینے کے لیے حملہ آور ہو گئی۔ دوسن قوم کے مقتول سردار کے بیٹے نے چینی شہنشاہ کی مدد سے ان پر حملہ کیا تھا۔

اس جنگ میں جو تقریباً ۱۴۰ ق م میں ہوئی اور یوچی قوم کو شکست ہوئی، وہ تمام مفتوحہ

علاقے جوانہوں نے دوسن اورسک قوم سے چھینے تھے، خالی کرنا پڑے۔ ممکن ہے کہ علاقے کی تمام قومیں یوچی کے خلاف اتحاد میں شامل ہوئی ہوں۔ مجبوراً یوچی اقوام کوایک مرتبہ پھر نقل مکانی کرنا پڑی اور جنوب مغرب کی طرف دریائے سیمون کی وادی میں چلے گئے۔ یہاں بھی یوچی کا واسطہ ایک اور قوم جو پہلے سے ان علاقوں پر آباد تھی، سے پڑا جنہیں چینی ٹاہیا کہتے تھے۔ یہ لوگ امن پسند اور صلح جو تھے۔ اس قوم نے یوچی قبائل سے امن معاہدہ کرلیا اور ایک ساتھ رہنے اور یوچی اقوام کی اطاعت قبول کرنے پر راضی ہوگئی۔ وادی سیمون کی سرسبز وشاداب چراگاہوں پر مکمل کنٹرول کے بعد یوچی قبائل نے اپنا سیاسی حلقہ اثر دریائے سیمون کے پار باختر کے صوبوں تک بڑھالیا۔ یہاں ان کے لیے چراگاہیں بہت وسیع تھیں جہاں انہوں نے خوب قدم جمائے۔

ایک صدی کے قریب عرصہ میں یوچی اقوام نے اپنی خانہ بدوشی کی زندگی کوترک کردیا اور مقامی آبادکار بن گئے۔ تقریباً پہلی صدی ق م کے اختتام پرانہوں نے دریائے سیمون کے جنوب اور باختر کے علاقوں پر مشتمل اپنی پانچ ریاستیں قائم کرلیں۔ بقول وی اے سمتھ باب ۱۰ صفحہ ۱۸ ۳ یوچی اقوام نے تمام گرپوں کے اتحاد سے ۱۰ ق م تک حکومتی اور ریاستی نظام مکمل کرلیا۔ یوچی اقوام کی چینی صوبہ کن سئہ سے نقل مکانی ۱۶۵ ق م سے لے کر دریائے سیمون اور باختر وغیرہ کے علاقوں میں اپنا معاشی، سیاسی نظام مکمل کرنے اور باقاعدہ حکومتی ڈھانچہ کی تکمیل جو ۱۰ ق م میں مکمل ہوئی، تک کی کل مدت ۱۵۰ سال بنتی ہے جس میں یوچی قبائل نے اپنا سیاسی سفر پورا کیا۔ اس ۱۵۰ سالہ سفر میں تقریباً ۵۰ سال انہوں نے سفدانہ اور باختر میں اپنے حکومتی نظام کو مکمل کرنے میں صرف کیے ہوں گے۔ باقی تقریباً ۸۰ سے ۹۰ سال خانہ بدوشی کی زندگی بسر کرتے رہے۔ اس دوران ان قبائل میں اندرونی و بیرونی اختلافات اورلڑائیاں بھی ہوئیں۔ آپس میں سیاسی اختلافات اور جھگڑے رہے کیونکہ جب ان قبائل نے سفدانہ اور باختر کے علاقوں میں اپنا حکومتی سیٹ اپ مکمل کیا تو یہاں ایک بات کوضرور سمجھنا ہوگا کہ انہوں نے ان علاقوں پر ایک اتحادی ریاست قائم کیوں نہیں کی اور کیوں بالکل پانچ علیحدہ علیحدہ ریاستیں قائم کردیں؟ اس سے

معلوم ہوتا ہے کہ ان کے درمیان کوئی نہ کوئی اختلاف ضرور تھا جس کی وجہ سے ہر قبیلے نے اپنی اپنی ریاست قائم کی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے درمیان قبائلی تقسیم موجود تھی اور یوچی اتحاد میں مختلف قومیں اور نظریات کے لوگ موجود تھے۔ وہ حالات جو ایک سے زیادہ قبائل کے درمیان اختلاف اور پھر ان تمام قبائل کا ایک معاہدہ پر متفق ہونا واضح ہوتا ہوا نظر آتا ہے لیکن کچھ عرصہ بعد تقریباً ۱۵ء تک ان کے درمیان وہ تمام اختلافات ختم ہو گئے اور تمام یوچی قبائل ایک معاہدہ کے تحت یوچی قبائل میں شامل کشان قوم جو ممکن ہے کہ ان میں سب سے زیادہ اثر رکھتے ہوں اور تعداد میں بھی زیادہ ہوں گے تو ان میں سردار کے طور پر کڈفائس اول کو اپنا متفقہ بادشاہ تسلیم کر لیا۔ کڈفائس کشان کا سردار تھا جس کو یورپی مورخین ویما کڈفائس اول کے نام سے تحریر کیا ہے۔ یہ وہی کشان بادشاہ تھا جس نے ۲۰ء تک کابل اور ہندوکش کے شمال کے تمام علاقوں پر اپنی گرفت اور حکومت قائم کر لی تھی۔ بعد میں اسی کشان بادشاہ کی اولاد نے ہندوکش کو عبور کر کے مغربی ہند کے اکثر علاقوں پر اپنا قبضہ کر لیا اور چوتھی صدی عیسوی کے اختتام تک حکمران رہے جن کا تفصیلاً ذکر آگے آئے گا۔

کڈفائس اول ۱۵ تا ۴۵ء:

کڈفائس اول یوچی اقوام میں کشان حصے کے جرگہ کا سردار یا سربراہ تھا جو دوسرے تمام یوچی قبائل سرداروں کا تعاون حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ کڈفائس اول یوچی سلطنت جس نے تمام یوچی قبائل نے قبضہ کیا تھا، اس کا ۱۵ء تک حاکم اعلیٰ تسلیم کر لیا گیا۔ امورِ سلطنت اور تخت پر براجمان ہونے کے بعد اب ان کے سامنے اور بہت سارے مسائل در پیش تھے جن میں سرفہرست سلطنت کی وسعت، مزید علاقوں پر قبضہ اور چراگاہوں اور یوچی قبائل کے لیے ذریعہ معاش شامل تھا۔ اسی لیے انہوں نے اپنے ارادوں کو عملی جامعہ پہنانے کے لیے سب سے پہلے باختر کے آگے افغانستان پر شب خون مارا کافی جنگ وجدل کے بعد کشان بادشاہ نے تقریباً ۲۰ء کے قریب کابل کو فتح کر لیا۔ کابل اور مشرق کا پہاڑی سلسلہ کافرستان کی فتح کشان بادشاہ کے

لیے غنیمت تھی جس سے ان کی طاقت میں بے پناہ اضافہ ہوا۔ پورے یونان میں، جو اس زمانے میں دنیا کی سپر پاور تھی، ویما کو (vima) شہنشاہ کا خطاب دیا گیا۔ ان فتوحات سے کشان بادشاہ کو اپنے مرکز باختر میں اپنی فوجی طاقت کو مستحکم کرنے کا ایک سنہرا موقع ملا اور اس نے مشرق کے مزید علاقے جس میں ہندوکش کے تمام پہاڑی سرسبز وادیاں دریائے سندھ تک کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا جبکہ کچھ مورخین کا خیال ہے کہ کڈ فائس اول کی حکومت دریائے سندھ کے پار گندھارا اور تھل کی پٹی دریائے جہلم تک پھیل گئی تھی لیکن اس کے کم ہی شواہد ملے ہیں۔ میرے خیال میں کڈ فائس اول کی حدودِ سلطنت پاک افغان سرحد یا پھر دریائے سندھ تک تھی۔ دریائے سندھ کا مغربی پہاڑی سلسلہ جس کو زمانہ قدیم میں کافرستان کہا جاتا تھا، کڈ فائس اول کی سلطنت میں شامل تھا۔ مزید کچھ عرصہ کے بعد کڈ فائس اول نے اپنا دارالسلطنت باختر کی بجائے کابل میں منتقل کر دیا۔ اس سے پہلے کابل اور ٹیکسلا وادیٔ سندھ اور مغربی پنجاب "تھل" کے علاقوں پر مشتمل ایک ریاست تھی جو یونانی باختری اور پارتھی حکمرانوں کے قبضہ میں تھی۔ جب کابل پر کڈ فائس اول نے حملہ کیا تو اس وقت ایک پارتھی سردار میوس ثانی کابل میں حکمران تھا جبکہ ایک دوسری روایت ہے کہ اس وقت کابل کا حکمران ہرمیس تھا، یہ ایک پارتھی نسل سے بادشاہ تھا جبکہ میوس ثانی دریائے سندھ سے مشرق کے میدانی علاقوں کا بادشاہ تھا۔ کڈ فائس اول نے معاشی، سیاسی، فوجی تقویت حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ انہوں نے شہنشاہ کا لقب اختیار کرنے اور اپنے آپ کو یونانی بادشاہ ہرکولیس کے ساتھ ہمسری کا دعوا کرنے کے خیال میں اپنے نام کا سکہ بھی جاری کیا جو یونانی بادشاہوں کے سکوں سے مشابہت رکھتا تھا۔ کڈ فائس اول نے ۴۵ء تک کابل اور باختر کے علاقوں پر حکومت کی اور تقریباً ۸۰ سال کی عمر میں وفات پائی۔ اس نے کل ۳۵ سال حکمرانی کی اور اس کی وفات کے بعد کڈ فائس دوم نے عنانِ حکومت سنبھالی جو ممکن ہے کہ کڈ فائس اول کا بیٹا ہو۔

کڈ فائس دوئم ۴۵ تا ۷۸ء:

مورخین کی تحریروں اور تاریخی حوالہ جات سے معلوم ہوتا ہے کہ کڈ فائس دوئم کڈ فائس اول

کا بیٹا اور جانشین تھا جس کو چینی پن کو چنگ کہتے ہیں۔ سکوں کی عبارت میں ان کا نام ویما کڈ فائس لکھا ہے۔ اپنے باپ کی وفات کے بعد اس نے تخت سنبھالا اور یہ ایک با ہمت اور پر عزم بادشاہ تھا۔ اس نے اپنی تمام تر کوشش اور طاقت باپ کی دی ہوئی سلطنت کو وسیع کرنے پر صرف کر دی۔ کڈ فائس دوئم نے اپنی ریاست کی سرحدوں کو پار کر کے دریائے سندھ کے مشرق اور جنوب میں مغربی پنجاب کے وسیع میدانوں موجودہ "تھل" کے اکثر علاقوں پر قبضہ کر لیا جبکہ کسی حد تک اس بات کے بھی شواہد ملے ہیں کہ دریائے گنگا کی وادی کے کچھ حصے اور بنارس تک کے علاقوں کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ ساتھ ہی شمال کے پوٹھوہاری سلسلہ کے علاقے گندھارا، کوہستان اور دریائے جہلم کے پار کشمیر تک کے علاقوں کو اپنی عمل داری میں لے لیا۔ گندھارا کے جنوبی میدانی علاقے جن میں میانوالی، بھکر، خوشاب، لیہ، مظفر گڑھ کے اضلاع تک "تھل" کے اکثر علاقے کڈ فائس دوئم کی عمل داری میں تو ضرور تھے لیکن یہ علاقے پارتھی سرداروں کے قبضے میں تھے۔ جو ایک سے زائد چھوٹی چھوٹی ریاستوں پر حاکم اور قابض تھے۔ یہ تمام پارتھی سردار کسی نہ کسی طرح ایک مرکزی حکومت کے زیر اثر کام کرتے تھے۔ ان میں ایک سردار سب سے زیادہ طاقتور تھا۔ ممکن ہے کہ وہ ایران کی پارتھی حکومت کی طرف سے ان علاقوں پر حاکم اعلیٰ کی حیثیت سے حکومت کرتا ہو۔ یہ وہ بادشاہ تھا جو سکوں اور دوسری تاریخی شواہد کی معلومات کے مطابق تاریخ کا گمنام بادشاہ مشہور تھا۔ اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ بادشاہ کڈ فائس دوئم کا ہم عصر تھا۔ اس کا ذکر پہلے بھی آ چکا ہے۔ یہ سوٹر میگس کا لقب استعمال کرتا تھا۔ "کٹیلاگ آف کائنز ان دی انڈین میوزیم" میں ان سکوں پر جو نام تحریر ہے، وہ سیا سریٹاس لکھا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس بادشاہ نے کشان بادشاہ کی اطاعت قبول کر لی ہو اور باج گزار کے طور پر کڈ فائس دوئم کے زمانہ میں حکومت کرتا رہا کیونکہ کشان بادشاہ کے ساتھ ساتھ اس کے نام کا سکہ بھی جاری ہوتا رہا۔ دوسری طرف تمام ہندی پارتھی سردار جو گندھارا کے جنوب میدانی علاقوں پر قابض تھے، مقامی طور پر اپنے اپنے نام کا سکہ بھی جاری کرتے رہے۔ یہ مقامی طور پر تیار ہونے والے سکے مرکزی سکوں کی

نسبت بہت چھوٹے اور وزن میں کم ہوتے تھے۔ یہ شکل وصورت میں کچھ حد تک مرکزی سکوں سے مطابقت رکھتے تھے۔ اس سکے کا لین دین صرف اسی ریاست میں ہی ہوتا تھا جہاں اس کرنسی کو جاری کیا جاتا تھا۔ ان تمام پارتھی سرداروں اور حکمرانوں نے کڈ فائس دوئم کی طاقت کے سامنے مجبوراً اطاعت قبول کر لی جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کشان بادشاہ کو ان علاقوں پر فوج کشی نہیں کرنی پڑی۔ کڈ فائس دوئم کی حکومت کا زمانہ غالباً طویل تھا۔ اس کے متعلق مورخین کی مختلف آرا سامنے آئی ہیں۔ وی اے سمتھ نے ان کی کل مدت حکومت ۳۳ برس یعنی ۴۵ ء سے ۷۸ ء تک جبکہ کننگھم نے ۴۰ برس اور مسٹر آر۔ ڈی۔ بنیر جی اور پروفیسر لیوڈرس ۴۱ برس لیکن کچھ مناظر کو مدغم کر دیا ہے لیکن یہ تمام مورخین کنشک کی تخت نشینی جو ۷۸ ء میں ہوئی، پر متفق نظر آتے ہیں۔ ممکن ہے کہ ۷۸ ء میں کنشک کی تاج پوشی ہوئی ہو اور کڈ فائس دوئم اس سے کچھ عرصہ پہلے وفات پا چکے تھے، تو ان اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی حکمرانی کی کل مدت ۴۰ برس ہوگی جو کچھ حد تک صحیح بھی ہے۔

کنشک ۷۸ ء تا ۱۲۳ ء:

کنشک کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ کشان یا بقول فرشتہ کشن قوم کے بادشاہوں کا جانشین تھا جبکہ موخرالذکر کشان بادشاہ دوئم کا بیٹا تھا۔ بیٹا تھا یا نہیں، یہ ایک حقیقت ضرور ہے کہ کنشک کا تعلق یوچی جرگے کے کشن یا کشان حصے سے تھا۔ خروشی طرزِ تحریر میں اس قوم کا کشن جبکہ ساسانی اور چینی تحریروں میں کشان لکھا ہے لیکن یہاں صرف فرق طرزِ تحریر کا ہے نہ کہ لفظ کشان کا۔ یہ امر یقینی ہے کہ کنشک ہی وہ کشان بادشاہ ہے جو کڈ فائس کا جانشین یا بیٹا تھا۔ ڈاکٹر فلیٹ (جے۔ آر۔ اے۔ ایس) ۱۹۱۳-۱۹۰۶-۱۹۰۵-۱۹۰۳ء کے مضامین برلن کے ڈاکٹر او۔ فرینک اور جمیز کینڈی کی رائے کہ کنشک، واہشک، ہوشک، اور بسودیو، یہ تمام بادشاہ شاہان کڈ فائس سے پہلے گزرے ہیں جبکہ وی اے سمتھ نے ان تمام مذکورہ بالا علماء کے بیانات کو ماننے سے انکار کرتے ہوئے یہ ظاہر کر دیا ہے کہ کنشک ہی کڈ فائس دوئم کا جانشین تھا اور ۷۸ ء میں کڈ فائس دوئم کی موت

کے بعد تخت کا مالک بنا اوران کی مدت حکمرانی کے متعلق بھی بہت ساری آراء سامنے آئی ہیں جس میں کہا گیا ہے کہ کنشک نے ۷۸ء سے ۹۰ء تک کل ۱۰-۱۲ سال حکومت کی جبکہ کچھ بیانات سے ان کی مدتِ حکومت ۷۸ء تا ۱۲۸ء ظاہر کی گئی ہے۔ ڈاکٹر فلیٹ مضمون ۱۹۰۳ء میں ۵۸ء جبکہ بھنڈارکران کا آخری زمانہ ۲۷۸ء مگران کا نظر صریحاً نا قابلِ قبول ہے۔اصل اختلاف کنشک کی تخت نشینی کے سن پر ہے کہ ایک جماعت ۵۸ء جبکہ دوسری ۷۸ء مگر ڈاکٹر مارشل جو بعد میں جان مارشل کے نام سے مشہور ہوا، انہوں نے ٹیکسلا کے آثارِ قدیمہ کی کھدائی سے یاد رہے کہ ڈاکٹر مارشل سی۔آئی۔ای ناظم محکمہ آثارِ قدیمہ ہند تھے۔کھدائی سے ملنے والے نمونوں کی مدد سے واضح کر دیا ہے کہ کنشک دوسری صدی عیسوی کے اول تک ہندوستان کے اکثر علاقوں پر حکمران تھے۔کنشک کڈ فائس بادشاہوں میں کسی کا بیٹا تھا یا نہیں، وی اے سمتھ کے مطابق کنشک کشان قوم کا فرد ضرور تھا اوران کے باپ کا نام وجھشپ تھا لیکن کنشک ایک مضبوط اوراعلیٰ حکمت عملی سے سرشار انسان تھا۔

یہی کشان بادشاہوں میں ایک تھا جو اپنے پیچھے ایسا نام چھوڑ کر گیا جسے ملکی روایت نے فراموش نہ ہونے دیا بلکہ ہندوستان کی حدود سے باہر بھی مشہور ونا مور تھا۔انہوں نے اپنے جداعلیٰ کی طرح فوجی طاقت اور حدود سلطنت کو وسیع کرنے کی کوششیں کیں۔ کیونکہ اس سے پہلے کشان سلطنت کی سرحدیں افغانستان اور ایشیاء کے گردنواح جبکہ مشرق میں گندھارا کے صرف شمالی حصوں تک محدود تھیں۔ کشان سلطنت کا مرکز کابل میں تھا۔کنشک نے اس ارادے سے کہ وہ اپنی فوجی طاقت کو وسطی ہندوستان کے سرسبز میدانوں تک لے جائے اور مزید دریائے سندھ کی سرسبز وادی (موجودہ تھل) جو ملتان تک پھیلی ہوئی تھی، پر قبضہ کر لے۔ اسی بات کو مدنظر رکھتے ہوئے کنشک نے اپنا دارالسلطنت کابل کی بجائے پرسپور موجودہ پشاور منتقل کر دیا۔کنشک کے لیے یہ ضروری تھا کہ وہ پشاور کے مشرق میں کوہسار اور جنوب میں واقع ہندوستان کے سرسبز میدانی علاقوں پر قبضہ کرے جہاں پہلے ہندی پارتھی سردار حکمران تھے۔کنشک نے اپنی حکمت عملی اور

فوجی قوت کے ذریعے ان تمام علاقوں پر قبضہ کرلیا اور مزید کشان فوج جنوب میں ملتان، بہاول پور، اور زیریں سندھ کے علاقوں تک چلی گئی۔ جبکہ ایک تھوڑے عرصہ میں وسطی ہند کے متھرا، پاٹلی پتر اور کشمیر جبکہ دریائے گنگا اور جمنا کے میدانوں تک اپنا تسلط قائم کرلیا۔ کنشک کی طاقت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ کشان فوج ایرانی سرحد تک جا کر ایک پارتھی بادشاہ پر بھی حملہ آور ہوئی ممکن ہے کہ وہ خسرو پرویز یا کوئی دوسرا شہزادہ ہو۔ یہ جنگ ۱۰۸ء میں ہوئی۔ کنشک کی فوجی مہم جو انہوں نے ہندوستان اور اپنی سلطنت سے باہر بھی فوج کشی کی جس میں ان کا سب سے طاقتور اور حیران کن کام کاشغر، یارقند اور ختین پر حملہ تھا۔ یہ وہ علاقے تھے جو چینی ترکستان کے قریب تبت کے شمال میں پامیر کے مشرق میں واقع تھے اور یہ تمام علاقے چینی شہنشاہ کے باج گزار تھے۔ کنشک نے کھلم کھلا اور دلیری کے ساتھ ہمسری کا دعوی کرتے ہوئے چینی شہنشاہ کی بیٹی سے شادی کا پیغام بھیجا۔

جنرل پن چو نے جو چینی فوج کا سربراہ تھا، نے اپنے آقا کی بے عزتی سمجھتے ہوئے ایلچی کو گرفتار کرلیا۔ کنشک کو جب اس بدسلوکی کی اطلاع ہوئی تو اس نے ستر ہزار فوجی اپنے نائب سلطنت "سہی" کی کمان میں تیار کرکے چینیوں پر حملہ کرنے کے لیے روانہ کردیے۔ جونہی یہ فوج تاشکرغان کے پہاڑی راستوں سے جو چودہ ہزار فٹ بلند پہاڑ تھے، جو موجودہ کوہستان کے سری کول میں واقع ہے، سے گزر کر یارقند کے میدانوں میں اتری، کشان فوج جو پہلے دشوار راستوں کی مشکلات اور سخت ذہنی پریشانی کی وجہ سے کمزور ہوچکی تھی، وہ بے یقینی کی حالت میں مبتلا بہ آسانی چینی فوج کے آہنی پنجے میں آ گئی جس کی وجہ سے لڑائی جو ایک مختصر وقت تک ہوئی، کشان فوج کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اس طرح کشان فوج کو چینی شہنشاہ کے سامنے سرنگوں ہونا پڑا۔ مجبوراً کشان جنرل نے ایک بڑی رقم بطور تعاون ادا کرکے یرغمال فوج کو رہا کروایا۔ ان دونوں صورتوں میں کنشک کی حکمت عملی کارفرما تھی کہ اپنے ملک سے اتنی دور حملہ آور ہونا اور پھر اپنی گرفتار فوج کو بہت جلدی رہا کرونا۔ کچھ عرصہ بعد کنشک خود اپنی فوج کی کمان کرتے ہوئے جو

تعداد میں ایک لاکھ سے بھی زائد تھی، دوبارہ ان علاقوں پر حملہ آور ہوا۔اس مرتبہ چینی فوج کی قیادت پن چو کی جگہ کوئی اور جنرل کر رہا تھا۔کنشک اس مرتبہ کامیاب رہا اور اپنی تمام گرفتار شدہ فوج کی رہائی اور تعاون کا بدلہ لے لیا۔

کنشک ایک عظیم بادشاہ ہونے کے ساتھ ساتھ بہادر اور جنگجو انسان بھی تھا۔تمام کشان بادشاہوں میں کنشک ہی ایک بادشاہ تھا جس نے چینی اور یونانی ہرکولیس جیسے شہنشاہوں سے ہمسری کا دعوی ثابت کر دکھایا۔کنشک کے دور میں کشان سلطنت کی سرحدیں چین سے لے کر ایران اور وسطی ایشیاء اور جنوب مشرق میں ملتان، بہاول پور وسطی سندھ سے ہوتی ہوئی سمندر اور مشرقی دریائے گنگا اور جمنا کے میدانوں تک پھیلی ہوئی تھی۔کنشک کا شمار دنیا کے ان چند عظیم شہنشاہوں میں ہوتا ہے جو روم، یونان، ایران اور چین کے علاقوں پر حکمران تھے۔کنشک نے اپنے نام کا سکہ بھی جاری کیا۔سکوں میں کنشک شہنشاہ کے طور پر ظاہر کیا گیا ہے جن کی تفصیل آگے سکوں کے باب میں آئے گی۔اس بادشاہ نے تقریباً چالیس برس حکومت کی۔کنشک کی وفات ۱۲۳ء کے قریب ہی ہوئی تھی۔اس کے جانشین ہوشک اور واشک کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ہوشک اور واشک دونوں کنشک کے بیٹے تھے اور باپ کی زندگی میں دونوں ہندوستان کے وسطی اور مغربی علاقوں پر بطور نائب حکمران تھے۔واشک متھرا کے آس پاس کے علاقوں پر جبکہ ہوشک مغربی پنجاب موجودہ تھل اور روڑاں کے علاقوں پر باپ کے ساتھ شریکِ اقتدار تھا جو بعد میں باپ کی موت بعد برسر اقتدار آئے۔

واشک/ ہوشک:

تاریخی حوالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ واشک اور ہوشک دونوں کنشک کے بیٹے تھے اور باپ کے ساتھ اندرونِ ملک حکومتی کام سرانجام دیتے تھے۔اس بات کا ثبوت یہ ہے کہ متھرا کے مقام پر پائے جانے والے سکوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ دونوں ایک ساتھ حکمران تھے۔اس وقت خود کنشک بھی ایک مرکزی قائد کی طرح موجود تھا۔روڑاں کے مقام پر بھی ان دونوں کے سکے

پائے گئے ہیں جبکہ خود کنشک کے سکے بھی ملے ہیں۔ ان شہادتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں بھائی کنشک کی زندگی میں ان کے ساتھ شریک اقتدار تھے یا بطور نائب حکومتی کام سرانجام دیتے تھے کیونکہ جب کنشک نے ۱۰۲ء میں مغربی چین کے صوبوں کاشغر یارقند پر حملہ کیا اور وہ جنگ و جدل میں مصروف تھے تو اس وقت ملک ان دونوں بھائیوں کی عمل داری میں تھا۔ ان دونوں میں بڑا کون تھا؟ یا زیادہ اختیار کس کے پاس تھا؟ تو اس حوالے سے کوئی واضح ثبوت نہیں۔ ممکن ہے کہ ہوشک بڑا ہو، لیکن یہ بات واضح ہے کہ ہوشک کو زیادہ اختیار حاصل تھا۔ وہ حکومتی کاموں میں اہمیت رکھتا تھا۔ یہاں تاریخ خاموش ہے کہ کشان خاندان کی سیاسی صورتحال کنشک کی موت کے بعد کیا شکل اختیار کر گئی تھی۔ اس خاندان میں کتنے لوگ تھے کہ خاندان کو کئی حصوں میں تقسیم کر دیا۔ وہ حالات کیا تھے جن کے باعث کشان سلطنت کنشک کے بعد اپنا وجود قائم نہ رکھ سکی؟ وہ وجہ خاندانی اختلاف یا کمزوری ہی سمجھی جائے گی۔ بہر حال جو بھی حالات تھے، کشان شہزادوں میں خانہ جنگی، اختلاف یا امن پسندی جیسی تمام باتوں کے بیچ یہ کمزوری واضح تھی کہ کنشک کی موت ۱۲۳ء اور ہوشک کے جانشین بننے کے بعد کشان سلطنت میں رنگ و روپ اور طاقت باقی نہ رہی۔ ملک کے کئی حصے علیحدہ ہو گئے۔ جو ملک باقی بچا، اس کی باگ ڈور ہوشک نے سنبھالی۔

ہوشک ۱۲۳ء:

ہوشک اپنے باپ کی موت کے بعد ۱۲۳ء میں کشان سلطنت کا مالک بنا جس میں کابل سے کشمیر تک اور ٹیکسلا اور جنوب مشرق میں متھرا مغربی پنجابی ملتان تک کے علاقے شامل تھے۔ ہوشک کے سکے اکثر ہندوستان میں پائے جاتے ہیں جبکہ ان کے کچھ سکے روڑاں کے مقام سائیڈ سائیڈ ”اے“ سے ملے ہیں جس سے ان کے ہندو مذہب کی عکاسی ہوتی ہے نہ کہ بدھ مت کی کیونکہ ان کے سکوں پر آردکشو دیوی کی مورتی بنی ہے جو ہندو مذہب سے تعلق کو ظاہر کرتی ہے۔ ہوشک کے متعلق مشہور تھا کہ وہ بدھ مت مذہب کا پیروکار تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہوشک پہلے بدھ مت مذہب رکھتا تھا لیکن بعد میں اس نے بدھ مت کو چھوڑ کر دوسرے مذہب کی طرف

رجوع کیا۔ ہوشک نے ایک سے زائد قسم کے سکے رائج کرائے تھے۔ وہ ہندی، یونانی اور ایرانی دیوتاؤں سے عقیدت رکھتا تھا۔ اس لیے اس نے اپنے سکوں پر بہت ساری مورتیاں نقش کروائی تھیں جس طرح ہرکلیس نے سرالیس (سرایو) کی پرتش کی جبکہ سکندر نے اپنے بیٹے وسا کھ کے ساتھ آگ کے دیوتا فیرو کی تصویریں بنوائیں۔ ہوشک کے سکوں پر بدھ مت کی مورت یا نام نہیں پائے گئے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بادشاہ بدھ مت مذہب میں بہت حد تک راسخ الاعتقاد نہ تھا۔ ہوشک کے جو سکے روڑاں کے مقام سے ملے ہیں، ان پر بھی ہندو مت کا اثر پایا جاتا ہے۔ ہوشک کے اندر مذہب کی طرح اپنی سلطنت کو وسیع کرنے کا بھی جنون تھا۔ جس میں اس نے بڑی حد تک کوشش کی لیکن وہ اس کام میں کامیاب نہ ہو سکا جبکہ کچھ عرصہ کے بعد خود اس کی اپنی سلطنت اس کی گرفت سے نکلنے لگی۔ ممکن ہے کہ اس نے اپنی حکومت اور ملک کو بچانے کے لیے دوسری طاقتوں سے بھی رابطے کیے ہوں جن میں یونانی، ایرانی اور چینی شامل ہیں۔ ان سے سفارتی تعلقات کو قائم کرنے کی کوشش کی گئی ہوگی کیونکہ ہوشک کے ایرانی حکومت کے ساتھ تعلق کے کچھ اشارے بھی ملتے ہیں۔

ہوشک نے کتنا عرصہ حکومت کی؟ اور ملک پر اس کا کنٹرول کس طرح تھا؟ اس سے متعلق کوئی تاریخی ثبوت واضح نہیں۔ صرف ایک وہ مورخ جنہوں نے ہوشک کے سکوں پر تحقیق کی ہے، ان میں اسٹین راج ترنگنی ترجمہ باب ا صفحہ ۱۶۸، بیل لائف آف ہیون سانگ صفحہ ۶۸، حوالہ وی اے سمتھ صفحہ ۳۵۳، باب ۱۰ جبکہ وی اے سمتھ کیٹلاگ آف کانزان انڈین میوزیم جلد اول لوح ۱۲ گارڈنر، برٹش میوزیم کیٹلاگ آف گریک اینڈ انڈو سیتھین کنگس ان تمام شہادتوں کو یکجا کر کے جو وضاحت وی اے سمتھ نے اپنی کتاب قدیم تاریخ ہند باب ۱۰ صفحہ ۳۳۴-۳۳۳ میں دی ہے۔ اس کے مطابق ہوشک ۱۲۳ء سے ۱۴۰ء تک حکمران رہا۔ اس دستاویز سے بادشاہ کی نہایت عمدہ شخصیت کو ظاہر کیا گیا ہے۔ ہوشک کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ مستقل مزاج تھا۔ اس کی آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی اور ناک لمبی تھی۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس

کے زمانے تک کشان سلطنت میں کسی قسم کا کوئی فتنہ یا کمی واقع نہیں ہوئی لیکن پہلے جیسی شان و شوکت بھی اب ڈھیلی پڑ چکی تھی۔ اس کے جانشین کے متعلق بھی ایک بہت بڑا ابہام پایا جاتا ہے جس کا تاریخ اب تک کوئی فیصلہ نہیں کر سکی۔ جانشین کے متعلق ہم آگے تفصیل سے ذکر کریں گے۔

واسودیو کشان

(۱۴۰ء سے ۱۷۳ء)

واسودیو جس کو سکوں میں بسودیو کے نام سے بھی مشہور کیا گیا ہے، ہوشک کی موت ۱۴۰ء کے بعد کشان سلطنت کا مالک بنا۔ واسودیو ہوشک کا جانشین تو ہو سکتا ہے مگر بیٹا نہیں۔ ممکن ہے کہ واسودیو یوچی یا کشان قبائل میں کسی بااثر خاندان کا فرد ہو جو پہلے کنشک اور ہوشک کے دورِ حکومت میں کسی اہم عہدے پر فائز ہو یا فوج میں بطور جنرل۔ لیکن یہ تو حقیقت ہے کہ ہوشک کے بعد واسودیو کے علاوہ کوئی دوسرا شخص کنشک کے جانشینوں میں موجود ہی نہیں تھا جو کشان حکومت سنبھالتا۔ یہاں ایک تاریخی خلاء پیدا ہوتا ہے کہ کیا واسودیو کشان خاندان میں سے تھا کیونکہ اس کے خالص ہندی نام سے جو وشنو کا مترادف ہے، مورخین کو ایک اور وسوسے میں ڈال دیتا ہے کہ آیا یہ بادشاہ کہیں ہندی مقامی تو نہیں۔ مگر اکثریت کی رائے ہے کہ واسودیو کشان ہی تھا۔ جس طرح مغل بادشاہ اکبر کے دور میں ہندو مذہب کو بہت اہمیت دی جاتی تھی، اسی طرح واسودیو نے بھی بدھ مت کی بجائے ہندومت کو ترجیح دی اور تمام ہندی دیوی آردکشو، آرتھوشو، لکشمی اور وشوا کی پوجا کرتا تھا۔ یہ واسودیو کے سکوں سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔ واسودیو کو ورثے میں ایک وسیع سلطنت ملی جس کا مرکز پشاور تھا لیکن اس نے اپنی حکومت کے دور میں دارالسلطنت متھرا میں منتقل کر دیا جو ہندوستان کے عین وسط میں تھا۔ اس طرح وہ پورے ہندوستان پر کنٹرول کر سکتا تھا۔ واسودیو نے اس حکمتِ عملی کے تحت اپنا دارالخلافہ اندرون ملک منتقل کیا۔ ممکن ہے کہ یہ بادشاہ کتنا ہندوستانیوں کے قریب تھا، اس نے ہندو اکثریت والے علاقوں کا انتخاب کیا اور جلد گردونواح

کے حالات کی نزاکت کو مدنظر رکھتے ہوئے واسودیو نے ہندو قبائل اور مقامی سرداروں کا اعتماد حاصل کرلیا۔صرف یہی نہیں بلکہ اشوک کی طرح جس نے بدھ مت کو سرکاری مذہب قرار دیا، اس نے بھی ہندومت مذہب کو ملک میں سرکاری مذہب کے طور پر پیش کیا۔

واسودیو کے سکے اس بات کی شہادت دیتے ہیں جن میں ایک طرف (شیوا) دیوتا کی تصویر جو اس کے بیل کے ساتھ ساتھ ترسول اور ہندی بتوں کی دیگر علامات بھی پائی جاتی ہے جبکہ دوسری طرف آردکشو اور آرتھوکشو اور لکشمی دیوتی کی شبیہہ پائی گئی ہیں۔واسودیو کے سکے ہندوستان کے اکثر علاقوں میں پائے جاتے ہیں لیکن روڑاں کے مقام سائیڈ"بی" سے اس قدر کثیر تعداد میں ملے ہیں جیسے معلوم ہوتا ہے کہ اس بادشاہ کا دارالسلطنت بھی اسی مقام پر تھا۔سکوں کے متعلق تفصیل اگلے باب میں آئے گی۔

متھرا میں قیام اور ہندومت کی قربت کی وجہ سے واسودیو نے کئی شادیاں مقامی ہندو گھرانوں میں کی تھیں جن کے متعلق مورخین کی صرف رائے پائی جاتی ہے۔حالات کے مطابق میرے خیال میں بھی ایسا ہونا ممکن ہے کیونکہ واسودیو ایک وسیع سلطنت کا مالک تھا جس کی سر حدیں کابل سے لے کر کشمیر اور گنگا کے میدانوں سے لے کر سندھ آب کے وسیع سرسبز و شاداب وادی اور پورے"تھل" سے جنوب کی طرف ملتان تک پھیلی ہوئی تھیں۔خود بادشاہ اپنے دارالسلطنت متھرا میں ہی قیام پذیر تھا جبکہ ملک کے طول وعرض میں نظامِ حکومت کس طرح چلتا تھا، یہ یقینی امر ہے کہ پورے ملک میں واسودیو کو ایک مرکزی بادشاہ کی حیثیت حاصل تھی اور اس کو حاکم اعلیٰ کے طور پر تسلیم کیا جاتا تھا۔پورے ملک میں اس کے نام کا سکہ رائج تھا جو اس بات کی واضح نشانی ہے کہ حاکمیت اعلیٰ کا کوئی دوسرا دعویدار نہیں تھا۔ہوسکتا ہے کہ ملک میں کوئی صوبے داری نظام حکومت رائج ہو اور ہر صوبے میں گورنر یا کوئی صوبے دار مقرر کیا جاتا ہو جو مرکزی حکومت کے تحت کام کرتا ہو۔جس طرح معلوم ہوتا ہے کہ ملک کے مشرقی حصوں میں یعنی وسطی ہندوستان کے اکثر علاقوں پر اندھر خاندان کے ساتھ شراکتِ اقتدار کوئی معاہدہ ضرور تھا۔اسی

طرح مغربی پنجاب کے علاقے، دریائے سندھ کے علاقوں "تھل" اور جنوب مشرق میں سک اور پارتھی یا باختری سرداروں کے ذریعے حکومتی کام چلائے جاتے تھے۔ جیسا کہ تھل کے علاقے روڑاں جو یقیناً ایک صوبہ تھا اور اس صوبے کا سربراہ ایک باختری سردار تھا جو واسودیو کی مرکزی حکومت کے تحت کام کرتا تھا۔ ہم پچھلے باب میں تحریر کر چکے ہیں کہ ملک میں مرکزی کرنسی کے ساتھ ساتھ مقامی صوبے دار یا گورنر بھی اپنے اپنے علاقوں میں اپنے نام کا سکہ جاری کر سکتے تھے جو وزن اور ساخت میں مرکزی سکے سے بہت چھوٹا ہوتا تھا۔ اس سکے کے ایک طرف مرکزی حکومت اور دوسری طرف صوبے دار کے نشانات نقش کروائے جاتے تھے۔ اس کے واضح ثبوت ہمیں روڑاں کے کھنڈرات سے ملے ہیں۔ یہاں واسودیو کے سکوں کے علاوہ ایک چھوٹا سا سکہ جو واسودیو کے سکہ سے ملتا جلتا ہے، کثیر تعداد میں پایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ان کشان بادشاہوں کے متعلق کوئی واضح ثبوت نہیں ملتے جن کی مدد سے واسودیو یا دوسرے کشان بادشاہوں کے حالات تفصیل سے ہم تحریر کر سکیں۔ المختصر کہ متھرا کے مقام سے جو کتبے ملے ہیں، ان کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ ۷۴ء سے لے کر ۹۸ء تک واسودیو برسر اقتدار رہا۔

اس سے متعلق وی۔ اے سمتھ نے مسٹر آر۔ ڈی بینر جی اور فان سیلٹ نسینج فولگر کیٹیلاگ آف کائنز ان انڈین میوزیم جلد اول لوح ۱۲ کے حوالے اور بیانات کو اپنی کتاب قدیم تاریخ ہند باب ۱۱، صفحہ ۳۵۳ میں تحریر کرتے ہیں کہ کشانوں کے مطابق واسودیو ۱۰۰ء تک ہندوستان میں حکمران رہا جبکہ یہ ۱۷۸ء کے برابر بنتا ہے۔ اس طرح تو واسودیو کی کل مدت حکمرانی ۳۵/۴۰ سال کے لگ بھگ بنتی ہے۔ اسی طرح کشان جو وقتی طور پر سن استعمال کرتے تھے، اس کے مطابق واسودیو کا خاتمہ ۱۰۰ء میں ہوا۔ اس کی موت جو ۱۷۸ء کے قریب ہوئی۔ ساتھ ہی اس بات کے اشارے بھی ملتے ہیں کہ کشان سلطنت کا انحطاط بھی شروع ہو گیا کیونکہ واسودیو کے آخری زمانے میں کشان سلطنت کے اکثر علاقوں میں بغاوت اور افراتفری شروع ہو گئی تھی۔ مشرق سے گپت خاندان نے سر اٹھایا جبکہ جنوب کے ستر پوں میں سک سرداروں نے بغاوت کر

دی اور اندرونِ ملک کئی جنگجو سرداروں نے کشان حکومت سے انحراف کر دیا تھا۔ واسو دیو کی موت کے بعد کشان سلطنت ایشیاء کی دوسری حکومتوں کی طرح زوال و انحطاط سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ اس کی وفات کے کچھ عرصہ بعد شمال کے اکثر علاقے چھوٹے چھوٹے رجواڑوں میں تقسیم ہو گئے اور خود مختیار ہو گئے۔ بہت ساری عارضی ریاستیں وجود میں آ چکی تھیں۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ خود واسو دیو کے دورِ اقتدار میں ہی شمالی ہند کے علاقوں میں حکومت اعلیٰ کے وجود کو ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ ملک کا دارالحکومت پشاور سے متھرا منتقل کرنا تھا۔ ان کمزوریوں کے ساتھ واسو دیو کی موت نے کشان سلطنت کا ہی نقشہ بدل دیا۔ مغرب سے ایک مرتبہ پھر ایرانی حکومت نے دریائے سندھ کے پار اپنا اثر رسوخ بڑھانا شروع کر دیا۔ مشرق میں متھرا پاٹلی پتر میں گپت خاندان نے سر اٹھایا۔

اندرونِ ملک خاص کر مغربی پنجاب کے علاقوں میں بہت سارے خاندانوں نے گپت سے مل کر بغاوت کر دی جن میں آبھیر، گردبھل، سک، یون یا ہلیک شامل تھے۔ ہو سکتا ہے کہ ان میں کچھ اجنبی خاندان باختری اور پارتھی بھی ہوں گے۔ انہوں نے چھوٹے چھوٹے علاقوں پر اپنا تسلط قائم کر لیا لیکن تمام گپت خاندان باج گزار تھے۔ بہر حال تیسری صدی عیسوی کی تاریخ کے لیے کوئی بھی مکمل مواد موجود نہیں جس کی شہادت پر ہم کسی نتیجہ پر پہنچ سکیں۔ قدیم ہندی تحریر پرانوں کے پریشان کن بیانات سے اس پر فتن زمانے کے حالات کے متعلق جو شہادت موجود ہے، اس بات کا امکان بظاہر کم ہے کہ ہم اس وقت کی حالات کی تشریح یا اس کی تاریخی شکل و صورت پیش کر سکیں۔ پنجاب کے ان علاقوں میں جو دریائے سندھ اور جہلم کے درمیان واقع تھے، جو غیر ملکی سردار حکمران تھے، ان حکمرانوں میں اکثر باختری اور یونانی اور پارتھی شامل تھے اور موجودہ تھل کی اس سرسبز میدانی پٹی پر ہنی کا قبضہ تھا۔ یہ تمام سردار کشانوں کی حاکمیت اعلیٰ کو تسلیم کرتے اور ان کے باج گزار تھے۔ جنہوں نے تھوڑی بہت تحریف کے ساتھ واسو دیو کے سکے بھی جاری کرتے تھے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح ان کا تعلق کشان سے تھا۔ اس قسم کے تمام

سکوں کی عبارت تبدیل کر کے یونانی طرز تحریر سے لکھی گئی ہے ان کے ایک طرف تو شہنشاہ کا نام محفوظ ہے مگر دوسری طرف کچھ الفاظ تحریر کیے گئے ہیں جیسے بھ،ک،وی اسی طرح کے الفاظ روڑاں کے کھنڈرات میں بھی مٹی کے ڈھلو پر پائے گئے ہیں۔ مثلاً دی،دا،وا۔اس بات سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ سردار جو ہندوستان کے اکثر علاقوں پر حکمران تھے، پنجاب کابل کے کشان فرمانرواؤں کو اپنا حاکم اعلیٰ تسلیم کرتے رہے کیونکہ اس بات کے اشارے ملتے ہیں کہ ایک عرصہ تک خاندان کشان کے افراد نے پنجاب، کابل پر اپنا سکہ جمائے رکھا تھا اور پانچویں صدی عیسوی کے اول میں سفید ہنوں نے بالآخر ان کا خاتمہ کر دیا۔

عالمگیر وباء ۱۶۷ء:

یہ وباء جو ۱۶۷ء میں بال سے شروع ہوئی، اس نے دنیا کی آدھی سے زیادہ آبادی کو ہلاک کر کے رکھ دیا۔ ممکن ہے کہ ہندوستان بھی اس سے محفوظ نہ رہا ہو اور کشان سلطنت بھی اس ہلاکت خیز وباء سے دو چار ہوئی ہو۔ یہ وبا بابل کے علاقے سے شروع ہوئی اور اس نے کئی سالوں تک رومی اور پارتھی سلطنتوں کو برباد کیے رکھا۔ وی،اے سمتھ نے یوٹروپئس کے حوالے سے لکھا ہے کہ یہ وباء ۱۶۷ء قیصر روم مارکس آریلیئس کے زمانے میں پڑی تھی۔ اس نے روما کے شہر اٹلی اور صوبہ جات میں لوگوں کی ایک بڑی تعداد کو ہلاک کر کے رکھ دیا تھا۔ روم کی تمام کی تمام فوج اس وبا کی نذر ہو گئی تھی۔ ایک رومی مصنف جس کا نام نیو بھر لکھا ہے، کا بیان ہے کہ قدیم دنیا جو اس وبا کے اثرات کی وجہ سے تباہ ہوئی، دوبارہ کبھی سنبھل نہ سکی۔ اس کا مزید بیان ہے کہ کیسے ممکن ہے کہ ہندوستان اس وبا کے اثرات سے محفوظ رہا ہو جو اس کی پڑوسی ریاستوں کو دبوچ رہی تھی۔ ویسے تو اس قسم کی بہت ساری ہلاکت خیز وبائیں انسانی تاریخ میں پیش آ چکی ہیں لیکن سب سے زیادہ انسانی تباہی اس وباء سے ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ صرف روم میں دو سے تین لاکھ افراد ہلاک ہوئے جبکہ باقی دنیا کے اعداد و شمار معلوم نہیں۔

بعض مورخین نے لکھا ہے کہ ایشیا کے تمام دریا انسانی لاشوں سے بھر گئے۔ شہروں کے شہر

تباہ و برباد ہوگئے۔ کئی ایسی بستیاں جو پہلے انسانی نشوونما سے آباد ہوئیں، اس ہلاکت خیز وبا نے اجاڑ ڈالیں۔ دنیا میں ترقی کی راہ پر گامزن بہت سارے قبائلی علاقے صفحہ ہستی سے مٹ گئے۔

ہسٹری آف دی رومنز انڈر دی امپائر صفحہ ۳۵۸ / ۳۳ باب ۶۸ کے حوالہ سے لکھا گیا ہے کہ یہ وبا ۱۷۰ء تک تباہی پھیلاتی رہی۔

آخری کشان بادشاہ

(۱۷۸ء سے ۳۶۰ء تک)

واسودیو ہی وہ کشان بادشاہ تھا جس کے دور تک کشان سلطنت اپنا وجود برقرار رکھ سکی۔ واسو دیو کی موت کے بعد اس عظیم بادشاہیت جس کی بنیاد کڈ فالسا اور کنشک نے رکھی تھی اس کا زوال شروع ہوگیا۔ ہم پہلے یہ بیان کر چکے ہیں کہ واسودیو کے آخری سالوں اور موت کے فوراً بعد ملک میں جو افراتفری پھیلی اور خودمختیاری کے دعویدار اقوام نے سر اٹھایا تو ملک ایک سے زائد ریاستوں میں تقسیم ہوگیا۔ ہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ شاہانِ کشان میں سے واسودیو آخری بادشاہ تھا جس نے ہندوستان کے ایک وسیع علاقے پر حکمرانی کی۔ ان کی موت کے بعد تاریخ پر ایک ایسا پردہ پڑا کہ پورے مغربی ہندوستان اور کشانوں سے متعلق کوئی تاریخی مواد میسر ہی نہیں جس سے ہم اس کا اندازہ کر سکیں کہ کشان خاندان کے آخری بادشاہ کون کون تھے اور کس مقام پر حکومت کرتے تھے۔ واسودیو کی موت اگر یقین کے ساتھ ۱۷۸ء ہے تو یہاں سے لے کر ایران کے ساسانی بادشاہ سے تعلق یا گورے ہن کے حملے ۳۶۰ء سے ۳۷۰ء تک بالکل تاریخ خاموش نظر آتی ہے۔ اس دوران مشرق میں گپت خاندان کا احوال آتا ہے جس سے ظاہر یہ ہوتا ہے کہ مشرقی ہندوستان میں واسودیو کی موت کے بعد گپت خاندان نے اپنے قدم مضبوط کر لیے تھے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ تیسری اور چوتھی صدی عیسوی کے دوران کشانوں کا اپنے ملک پر کتنا کنٹرول تھا؟ ان میں واسودیو کا جانشین کون سا آدمی ہوا؟ اس کے متعلق کوئی یقینی امر اور قابلِ اعتماد شہادت نہیں ملتی سوائے ان

سکوں کے جو پنجاب کے مختلف علاقوں جیسے روڑاں کے اردگرد میں پائے گئے ہیں۔ ان سکوں کی عبارت سے جو کئی غیر ملکی مورخین کی آرا پر مبنی تحریر ہم تک پہنچی ہیں، جبکہ کچھ وہ سکے جو ہمیں روڑاں اور اس کے گردونواح کے علاقوں سے ملے ہیں، ان میں کنشک، ہوشک، واسودیو کے علاوہ باقی تمام سکوں کا تعلق مورخین نے کشان خاندان سے جوڑا ہے۔

ان میں تھوڑی بہت تحقیق کے واسودیو کے سکوں کی مشابہت پائی جاتی ہے جس کی وجہ سے تاریخ دان کشان خاندان کے اقتدار کو تسلیم کرتے ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دوسوسال کا عرصہ جس کے دوران کسی بھی نامور بادشاہ کا ذکر نہیں آتا، تو آخر کار یہ اتنا عرصہ کیسے گزر گیا اور کسی مرکزی بادشاہ کے بغیر کیسے اتنی بڑی عظیم سلطنت نے اپنا وجود برقرار رکھا اور تمام قبائلی کس کی اطاعت گزاری میں رہے؟ مشرق میں مگدھ سے گپت خاندان چوتھی صدی عیسوی کے اول میں اس قابل ہو گیا کہ وہ ہندوستان کے ایک وسیع علاقے کو اپنے تصرف میں لا سکے جیسا اس نے کر دکھایا۔ ممکن ہے کہ جس طرح ہندی پارتھی سردار مغربی پنجاب "تھل" کے اکثر علاقے پر نیم خود مختیاری کا دعویٰ کرنے لگے، اسی طرح خود کشان خاندان بھی آخری زمانے کے مغل شہزادوں کی طرح خاندانی کش مکش میں مبتلا ہو کر بکھر گئے ہوں اور اپنے اپنے تعلق داری والے علاقے پر قابض ہو کر ریاستی خود مختیاری کا اعلان کرنے لگے ہوں۔ بالکل اسی طرح ہوا۔ کشان خاندان کے کچھ لوگوں نے کابل پر قبضہ کر لیا۔ خاندان کا ایک حصہ پشاور اور ٹیکسلا پر قابض ہو گیا لیکن گندھارا کے جنوب کے میدانی خطہ موجودہ "تھل" کی صورت حال کچھ اور تھی کیونکہ دریائے سندھ کے مغربی علاقے ایران کی ساسانی حکومت کے قبضے میں تھے جہاں سیستان کے سک ایران کے ماتحت قابض تھے۔ جبکہ دریائے سندھ کے پار کا نقشہ کچھ اس طرح سے تھا کہ اس علاقے پر کشان خاندان کے افراد حکمران تو تھے لیکن طاقت کا اصل سر چشمہ ان ہندی سیتھی و پارتھی سرداروں کے ہاتھ میں تھا۔ وہ ان علاقوں پر اپنا اثر ورسوخ رکھتے تھے۔ اسی طرح "تھل" کا موجودہ علاقہ دریائے سندھ اور جہلم کے درمیان واقع ہے۔ شمال میں نیم پہاڑی سلسلہ موجودہ ضلع میانوالی تک

اور جنوب میں دریائے سندھ اور جہلم کے سنگم تک یہ ہندی پارتھی سرداروں کے قبضے میں تھا۔

مورخین نے اس علاقے کا نام سیتھیا بتایا ہے۔ یاد رہے کہ سیتھیا ہی موجودہ تھل کا نام تھا۔ اس علاقے کے وسط میں روڑاں اور اس کے گردونواح کے علاقوں پر مشتمل ایک ریاست تھی جہاں ایک سے زائد لوگ دعویدار ہونے کے ثبوت ملتے ہیں۔ یہ ثبوت صرف سکوں کی صورت میں ہیں۔ روڑاں کی سائیڈ "بی" میں جو سکے پائے گئے ہیں، ان میں کچھ خود واسو دیو کے ہیں جبکہ ہوشک اور آخری کشان بادشاہ کے علاوہ کچھ ایسے سکے بھی دریافت ہوئے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک طرف تو آخری کشان بادشاہ دوئم سوئم کے نام محفوظ ہیں لیکن دوسری سائیڈ کچھ تبدیل نظر آتی ہے۔ ان میں ہندی یا نلگاری بروہمی اور خروشتی وغیرہ زبان کے کچھ ایسے الفاظ تحریر کیے گئے ہیں جس طرح انگلش میں tha۔wa۔ba حرکت کے الفاظ۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ان ایشیائی سرداروں کے نام ہیں جو کافی عرصہ سے پنجاب کے اس میدانی خطے میں قابض تھے اور یہ قبائلی کسی نہ کسی طرح مرکزی حکومت کے تحت ان علاقوں پر حکومت کر رہے تھے۔ ان میں یونانی باختری اور پارتھی سردار مشہور ہندی سیتھی شامل تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اتنا طویل عرصہ تک علاقے کا نظم و نسق چلتا رہا جبکہ کوئی نہ کوئی کشان خاندان کا فرد ضرور بطور مرکزی یا حاکم اعلیٰ کے طور پر ان میں موجود رہتا تھا۔ لوگ اس کشان فرد کی اطاعت کرتے تھے۔ ان حالات کے ساتھ ہی ایک مرتبہ پھر مغربی پنجاب کے اس علاقے پر ایران کی ساسانی حکومت کا اثر نظر آتا ہے۔ وجہ تو معلوم نہیں ہو سکی کہ ایران کا ہندوستانی علاقوں پر عمل دخل کیسے ہوا لیکن یہ بات واضح ہے کہ یہاں ہندوستانی علاقوں بشمول روڑاں میں دریافت ہونے والے سکے جو اس بات کی نشان دہی کرتے ہیں، جن کی تفصیل وی اے سمتھ کٹیلاگ آف کائنز ان انڈین میوزیم جلد اول صفحہ ۸۸-۸۹ (اشاعت ۱۹۰۶ء) ان کشان دور کے آخری بادشاہ جس کو سکوں میں Great Kushan مشہور کیا گیا۔ وی اے سمتھ کا بیان ہے کہ اسی کشان بادشاہ کے سکوں کی ایک طرف آگ کی قربان گاہ کی تصویر پائی گئی ہے جو صرف ایرانی بادشاہوں کے سکوں پر پائی جاتی تھی۔ خود اس کشان

بادشاہ جس کا نام شاید گرمبیس تھا، کو سکوں پر ایرانی لباس میں ملبوس دیکھا گیا ہے۔

ہیروڈوٹس کے مطابق چوتھی صدی عیسوی کے اول میں ایک کشان بادشاہ نے اپنی بیٹی ایران کے ساسانی بادشاہ ہرمز دوئم سے بیاہی تھی اور اس رشتہ کے سبب ایران کی بڑھتی ہوئی طاقت جس میں سیستان کے سک مغلوب ہونے پر مجبور ہوئے اور اطاعت قبول کر لی۔ اسی طرح ممکن ہے کہ کشان خاندان کے بچے کھچے افراد نے اپنی ساکھ کو سہارا دینے کے لیے ایران کے حکمرانوں سے رابطے کیے ہوں کیونکہ اس وقت کشان خاندان زندگی کی آخری سانسیں لے رہا تھا۔ ایک اور شہادت جو کہ ۳۶۰ء میں جب شاہپور دوم نے آمدہ کے مقام پر رومی فوج کے ساتھ جنگ لڑی یہ مقام دریائے دجلہ پر واقع ہے جو آجکل دیار بک جہاں عراق کا ملک آباد ہے۔ ایرانی فوج میں ہندی فوجی اور ہاتھی بھی شامل تھے جن کی کمان ایک بڈھا بادشاہ گرمبیئس کر رہا تھا۔ اس بادشاہ کو فوج میں سب سے زیادہ عزت کی جگہ دی گئی تھی۔ کننگھم نے اپنی کتاب نیوسمیٹک کرانیکل صفحہ ۱۶۹-۱۷۷ پر انیئس مارسی لیٹس کا بیان نقل کرتے ہیں کہ چیولنٹی قوم دراصل ہندوستانی کشان تھے۔ ان تمام حالات کے پیش نظر تیسری صدی عیسوی یا چوتھی صدی کے اول تک کشان سلطنت کے حالات ایسے گرد آلود رہے کہ کسی بھی ایسے حالات کی پشین گوئی مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ صرف وہ سکے جو جگہ جگہ تبدیل شدہ حالت میں پائے گئے ہیں، ان کی رو سے مغربی، یورپی مورخین نے چند ایک آرا پیش کی ہیں جن میں حقیقت میں بہت بڑا تضاد پایا جاتا ہے لیکن اس کے علاوہ ہمارے پاس کوئی بھی دوسرا راستہ موجود ہی نہیں سوائے ان مورخین کی آراء کو تسلیم کرنے کے۔ ہم مزید آگے ان حالات پر بحث کریں گے کہ وادیٔ سندھ کے ان وسطی وزیریں علاقوں میں تیسری اور چوتھی صدی عیسوی میں سیاسی منظرنامہ کیا تھا۔

گورے ہن

یہ ایک خانہ بدوش قبائل تھے جو ہن کے نام سے جانے جاتے تھے۔ یوچی کی طرح انہوں

نے بھی اپنے وطن و علاقے کو خیر باد کہہ کر ذریعہ معاش اور چراگاہوں کی تلاش میں تقریباً ۳۷۰/ ۳۷۵ء کے قریب جنوب مغرب کی طرف سفر کا آغاز کیا۔ ہن قبائل ایشیائی جنگلوں کی وحشی اقوام تھی جو ابتدا میں ہی خانہ جنگی کا شکار ہوگئی جس کی وجہ سے انہیں دوحصوں میں تقسیم ہونا پڑا۔ ان میں ایک تو دریائے والگا کی وادی کی طرف بڑھا جو آخرکار ۳۷۵ء میں وہاں کی ایک آبادکار قوم گاتھ کو دریائے ڈینیوب کی طرف دھکیل دیا۔ جب اس قوم کے بادشاہ قیصر ویلنز نے ہنوں کا مقابلہ کیا تو ان دونوں اقوام کے درمیان ایک عرصہ جنگ وجدل کا بازار گرم رہا جس میں آخرکار ۳۷۸ء ویلنز ہلاک ہو گئے اور ان تمام علاقوں پر ہن قوم نے قبضہ کر لیا۔ کچھ عرصہ بعد اٹلا جس نے سلطنت روم کی بنیاد رکھی وہ انہیں ہن قبائل میں سے تھا۔ ہن اقوام کا دوسرا حصہ وادی سیمون کی طرف روانہ ہوا اور یہ لوگ اول الذکر ہن حصے کے لوگوں سے مختلف تھا اور بعد میں یہ نسل کے لحاظ سے گورے ہن کے نام سے مشہور ہوئے۔ دریائے سیمون کی وادی میں رہائش کے دوران رفتہ رفتہ انہوں نے طاقت کو بڑھانا شروع کر دیا حتیٰ کہ ۴۸۴ء میں ایران کے شاہ فیروز اس ہن اقوام کے حصے سے لڑتا ہوا مارا گیا۔ جبکہ دوسری طرف چوتھی صدی عیسوی کے اختتام تک گورے ہنوں نے کابل میں کشان سلطنت پر حملہ کر کے انہیں بے دخل کر دیا اور دریائے سندھ کو پار کر کے ہندوستان میں داخل ہوئے۔

ہنوں کا پہلا حملہ بظاہر کمزور حالت میں تھا یا پھر ان کی فوج کے ایک تھوڑے حصے نے ہندوستانی علاقوں پر چڑھائی کی جس کا سکندر گپت نے ۴۵۵ء میں سد باب کیا اور حملہ آور فوج کو شکست ہوئی۔ یہ ہن اندرونِ ملک اپنے قدم نہ جما سکے۔ وی اے سمتھ جس نے ہارنل کا بیان نقل کیا ہے تو اس میں مورخین سکندر گپت کے دورِ حکومت میں کسی بھی ہن فوج کے حملے کو تسلیم نہیں کرتے۔ ان کا مزید بیان ہے کہ اگر ۴۵۵ء اور ۴۶۸ء کے درمیان جس حملے کو سکندر گپت نے روکا تھا، اول تو وہ ہنوں کا حملہ تھا ہی نہیں، اگر مان بھی لیا جائے تو یہ ہن فوج کے کسی کمزور حصے نے کیا تھا جس کی وجہ سے وہ اس لڑائی میں شکست کھا گئے۔ ڈاکٹر ہارنل کا بیان ہے کہ کس طرح لڑ کھڑاتی

کشان سلطنت پر مغرب سے ایک وحشی قوم نے حملہ کیا اور جس نے کابل مغربی ہند کو ہلا کے رکھ دیا۔ گندھارا اور ٹیکسلا جبکہ مزید جنوب اور وسطی پنجاب کے علاقوں پر قابض ہو گئے۔ یہ وحشی قوم ہن تھی جو مشرق کی طرف اندرون ہندوستانی علاقوں پر حملہ آور ہوئے جہاں ان کو سکندر گپت نے روک لیا اور واپسی پر مجبور کر دیا۔ مورخین کے بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہن حملہ آوروں نے مغربی پنجاب کے تمام علاقے ٹیکسلا سے لے کر ملتان تک دریائے سندھ کے ساتھ ساتھ موجودہ تھل کو پہلے حملے میں فتح کر لیا تھا۔ یہ ممکن ہے کہ حملہ آور کابل کو فتح کرنے کے بعد پشاور اور ٹیکسلا پر حملہ کیا اور ان علاقوں پر قبضہ کرنے کے بعد مزید جنوب کی طرف میدانی علاقوں پر حملے شروع کیے اور ظاہر ہے کہ ان علاقوں کو بھی زیر کرنے کے بعد ہی وہ مشرق کی طرف بڑھے اور وسطی ہندوستان میں ان غیر ملکیوں کا راستہ سکندر گپت نے روکا اور کس طاقت سے ان وحشیوں کا مقابلہ کیا یہ تمام حل طلب باتیں ہیں جن کے متعلق تحقیق کرنے کی ضرورت ہے لیکن مورخین کی آراء ہیں کہ ہنوں کی یہ کمزور فوج تھی جو ۴۷۰ء کے دہائی ہندوستان پر حملہ آور ہوئی۔ یہ غلط ہے کیونکہ ہن فوج کابل سے لے کر پشاور اور ٹیکسلا، مغربی ہند پھر متھرا اور مگدھ تک مسلسل جنگ اور لڑائیوں میں مصروف رہی۔ ظاہر ہے کہ ہر جگہ ان کا مقامی آبادکاروں نے مقابلہ کیا ہوگا، زخمی اور ہلاکتیں بھی ہوئی ہوں گی۔ ہن فوج اپنے وطن سے دور غیر ملک میں جنگ کر رہی تھی، اس لیے اس کو بہت سارے مسائل درپیش رہے ہوں گے۔

کشان سلطنت پہلے ہی افراتفری کا شکار ہو چکی تھی۔ ہن فوج کامیاب ہوگئی اور اس نے مقامی آبادیوں پر ظلم کے پہاڑ توڑ دیے۔ وحشت اور بربریت کا یہ حال تھا کہ شہروں کے شہر، قصبات اور دیہات، حتیٰ کہ سرسبز و شاداب کھیتوں کو بھی مع انسان جلا کر خاک کر دیا۔ ان کے متعلق ہم تفصیلی گفتگو آگے چل کر کریں گے۔ لیکن یہ وحشی جب اندرونِ ہند پہنچے تو ان حملہ آوروں کا مقابلہ ایک طاقتور فوج جس کی قیادت سکندر گپت کر رہا تھا، سے ہوا جو اس وقت تک وسطی ہندوستان میں اچھی خاصی طاقت حاصل کر چکا تھا۔ وہ پشی متر قوم کی شکست کے بعد ۴۵۵ء تخت

پر بیٹھا تھا۔ یہ وحشی قوم ملک کے آباد شہروں اور سرسبز میدانوں کو تباہ کرتی ہوئی اندرونِ ہند پہنچی تو ان کا مقابلہ سکندر گپت جیسے کار آزمودہ مناسب ہمت اور جرأت والے بادشاہ سے ہوا جس نے ان وحشیوں کو شکست دی۔ بقول کننگھم آرکیالوجیکل رپورٹ جلد اول کے مطابق یہ جنگ بنارس کے مشرق میں موجودہ ضلع غازی پور کے قریب بھتری کے مقام پر ہوئی۔ اسی مقام پر سکندر گپت نے فتح کا مینار تعمیر کروایا جس کے کتبے پر اس جنگ کے متعلق واقعات درج ہیں۔ کتبے میں لکھا ہے کہ سکندر گپت کرشنا کی طرح جو اپنے دشمنوں کو قتل کر کے ماں کی خدمت میں حاضر ہوا تھا، فتح کی خبر اپنے ماں تک پہنچائی جو ابھی تک زندہ تھی اور اپنے باپ کی روح کو ثواب پہنچانے کے لیے اس فتح کے مینار کے سرے پر وشنو دیوتا کا بت بنوایا تھا جس پر وحشی حملہ آوروں کے پنجے سے دیوتاؤں کے فضل وکرم سے ملک کو رہائی ملی۔

گپت خاندان

قدیم ہندوستان کی مذہبی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ گپت خاندان نے چوتھی صدی عیسوی کے وسط سے ہی مشرقی ہند کے علاقوں پر اپنا اثر رسوخ بڑھانا شروع کر دیا تھا۔ یہ وہ خاندان تھا جس کا بانی چندر گپت موریہ تھا جس نے سکندر یونانی کے بعد ہندوستان کے اکثر علاقوں پر قبضہ کر لیا اور ۳۲۱ ق م تک اسے پورے ملک کا بادشاہ تسلیم کر لیا گیا۔ اشوک کے بعد موریہ سلطنت کا زوال شروع ہوا۔ بالآخر ۱۸۵ ق م میں ایک مرتبہ پھر سے یونانی باختری حکمرانوں نے مغربی ہند پر قبضہ کر لیا۔ اس طرح گپت خاندان پر مکمل نہیں تو کچھ عرصہ کے لیے بادشاہت کا دروازہ بند ہو گیا۔ ان پانچ صدیوں کے دوران اس خاندان کے متعلق کوئی تفصیل نہیں ملتی۔

چوتھی صدی عیسوی کے آخری دہائی میں مشرقی ہند کے علاقے مگدھ، مالوا، پاٹلی پتر میں کشان اور اندھیر خاندان کی کمزوری کی وجہ سے ایک بار پھر روشنی کی کرن دکھائی دی، تاریکی کا پردہ چاک ہوا اور ہندوستان قدیمہ کی تاریخ میں اتحاد و دلچسپی کا رنگ بھر آیا۔ گپت خاندان کی ابتدا

کچھ اس طرح سے ہوئی کہ پہلے چندر گپت موریہ کے زمانے میں یہ خاندان "موریہ" کے نام سے مشہور تھا جبکہ اب یہی خاندان "گپت" کے نام سے ظاہر ہوا۔ اس کا بانی بھی چندر گپت موریہ کا ہمنام چندر گپت ہی تھا جو ۳۰۸ء میں ہندوستان کی ایک قدیم قوم لکھوی سے رشتہء ازدواج کی وجہ سے سامنے آیا۔ چندر گپت کی شادی ایک لکھوی شہزادی کمار دیوی سے ہوئی اور دونوں خاندان کے اتحاد و ملاپ کی وجہ سے ایک طاقتور گروپ ہندوستان میں ابھرا۔ اس کا سربراہ چندر گپت تھا۔ اس رشتہ ازدواج کی وجہ سے چندر گپت کو جو عظمت و شان ملی، اس سے وہ ایک عظیم شاہی خاندان کی بنیاد رکھنے میں کامیاب ہو گیا۔ لکھوی قبیلہ ہندوستان کی قدیم شاہی خاندانوں میں شمار ہوتا تھا۔ یہ قبیلہ ویشالی پر قابض تھا اور پاٹلی پتر کے بادشاہوں کا حریف تھا۔ پٹی پتر کے پرفتن زمانے اور کمزوری کی وجہ سے ان کو موقع مل گیا کہ وہ اپنا پورانہ حساب پورا کر لیں۔ یہی وجہ تھی کہ لکھوی خاندان نے چندر گپت کو شہزادی کا رشتہ دیا بلکہ ساتھ ایک بہت بڑی فوجی طاقت بھی دی جس کی مدد سے چندر گپت برسراقتدار آیا۔

چندر گپت:

چندر گپت کے باپ کا نام گھٹوکچ تھا اور دادا کا نام گپت۔ آرکیالوجیکل سروے اینؤل ۱۹۰۳ / ۱۹۰۴ء صفحہ ۱۰۷ لوح ۱۴-۴۱ کے مطابق گھٹوکچ ویشالی کے مقام کا ایک مقامی سردار تھا یا خود مختیار حاکم کے طور پر ایک چھوٹی سی ریاست پر قابض تھا۔ اس کے نام کی ایک مہر بھی برآمد ہوئی جہاں گپت کا نام بطور لفظ تھا۔ یہ گپت خاندان وہی ہے جس کا بانی چندر گپت موریہ تھا۔ اس کو چندرا گپتا بھی لکھا جاتا ہے۔ یہ دوسرے خاندان کے متعلق کوئی قابلِ قبول شہادت موجود نہیں۔

چندر گپت کی طاقت کا سرچشمہ اور اس خاندان کا عروج کا سبب وہ شہزادی کمار دیوی تھی جس کا تعلق ہندوستان کے ایک طاقتور قبیلے لکھوی سے تھا۔ اس شادی کی وجہ سے چندر گپت کو عظمت اور شان و شوکت ملی اور وہ شاہی خاندان کی بنیاد رکھنے میں کامیاب ہو گیا۔ تقریباً ۳۲۰ء میں چندر گپت لکھوی قبائل کی مدد سے پاٹلی پتر کے آس پاس کے علاقوں میں قبضہ کرنے میں بھی

کامیاب ہو گیا۔اس کے تھوڑے عرصہ بعد اس نے پاٹلی پتر کے تخت پر بھی قبضہ کر لیا اور خود سے راجہ مہاراجگان کا خطاب بھی اختیار کر لیا۔ اسی طرح چوتھی صدی عیسوی کے آخر تک مشرقی ہندوستان کے علاقوں سے اندھر خاندان کے حکمرانوں کا اثر و رسوخ ختم ہو گیا۔اب اندرونِ ہند چندر گپت مرکزی بادشاہ کی سی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔اس کے لیے ابھی بہت سارے خطرات باقی تھے۔شمال مغرب میں کشان بادشاہ واسو دیو کی موت سے ایک خلا پیدا ہو چکا تھا جبکہ مغرب سے ان وحشی حملہ آوروں کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا جن کو گورے ہن کہا گیا ہے۔اس نے محنت اور سیاسی حکمت عملی سے ایک مرتبہ پھر شاہی مقام حاصل کر لیا جو ہندوستان میں طاقتور ترین بادشاہوں کو دیا جاتا تھا۔اس نے اپنی بیوی اور لکھوی قبیلے کے مشترک ناموں سے سکے بھی جاری کروائے۔ چندر گپت نے اپنی سلطنت کو گنگا اور جمنا کے مقامِ اتصال تک وسعت دی جہاں آجکل الٰہ آباد کا شہر واقع ہے۔ چندر گپت نے باقاعدہ تخت نشینی کی رسم بھی ادا کی جو ہندوستان کی قدیم روایت کے مطابق اعلیٰ ترین بادشاہ ہونے کا اعلان تھا۔اس نے تاج پوشی سے سنہ کا بھی آغاز کیا (سمت گپت) جو صدیوں تک ملک پر چلتا رہا۔اس کا پہلا سال ۳۲۰ء یا ۳۲۱ء سے شروع ہوتا تھا۔مثلاً ۸۲ س گ بمطابق ۴۰۱ء۔ چندر گپت اپنے مختصر زمانے میں تر ہٹ جنوبی بہار اودھ اور دیگر علاقوں تک اپنی سلطنت قائم کر چکا تھا۔اس نے اپنی زندگی میں ہی اپنے بیٹے سمدر گپت جو لکھوی شہزادی کے بطن سے تھا، کو اپنا ولی عہد مقرر کیا۔

سمدر گپت کی تخت نشینی کے دس پندرہ برس کے اندر ہی چندر گپت کی موت واقع ہو گئی۔

سمدر گپت ۱۵ س گ (۳۳۵ء):

سمدر گپت جو لکھوی شہزادی سے تھا، باپ کی زندگی میں ہی سربراہِ مملکت مقرر ہوا۔اس نوجوان بادشاہ نے باپ کی اس عنایت کا بھرپور حق ادا کر دیا۔لیاقت و ہنرمندی کا اس قدر مظاہرہ کیا کہ جس امر کا وہ مستحق تھا۔ان خوبیوں کی وجہ سے وہ ہندی بادشاہوں کی صفِ اول میں اپنی جگہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔سمدر گپت نے اپنی تخت نشینی کے وقت سے ہی تمام ہمسایہ

ریاستوں کو اپنے قبضے میں کرنے کے لیے کوشش شروع کر دی تھی۔ اس نے ایک طویل جنگ شروع کی جو اس کے دورِ حکومت کے آخر تک جاری رہی۔ سمدر گپت کی خواہش تھی کہ وہ اپنے دادا اشوک کی طرح خود کو ایک عظیم ہندی بادشاہ بنائے۔ سمدر گپت نے سب سے پہلے قریب ترین علاقوں کو اپنے قبضے میں کرنے کے لیے توجہ مبذول کرائی اور ساتھ ہی شمالی علاقے اور کوہستانی قلعوں کی تسخیر کے بعد پنجاب کے تمام میدانی علاقے اپنے تصرف میں کیے۔ جبکہ کوہ ہمالیہ سے جنوب کی ریاستوں کے علاوہ راجپوتانہ اور مالوہ کے آزاد وحشی اقوام کو بھی اپنی سلطنت میں شامل کیا۔ آسام اور دریائے گنگا کے میدان برہم پتر کا مثلثی علاقہ جس میں آج کل کلکتہ، مردپ یا آسام واقع ہے، سمدر گپت کی سلطنت کی سرحدیں شمال مغرب میں کوہستانی سلسلہ کے ساتھ ساتھ دریائے سندھ تک پھیلی ہوئی تھی جس میں پنجاب کا کل علاقہ، مغربی پنجاب کا علاقہ سیتھیا، آج کل کا "تھل" ان کی حکومت میں شامل تھا کیونکہ سمدر گپت کے سکے روڑاں کے علاقوں سے بھی ملے ہیں جو اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ قدیم تھل کا علاقہ اس کی سلطنت میں شامل تھا۔

سمدر گپت نے تقریباً ۵۰ برس تک حکومت کی۔ دس سال باپ کی زندگی میں، باقی چالیس سال باپ کی موت کے بعد۔ سمدر گپت کی موت مورخین کے مطابق تقریباً ۳۷۵ء میں ہوئی لیکن یہ تاریخ بھی صحیح معلوم نہیں ہوتی۔ یہ بات یقینی ہے کہ سمدر گپت ایک لمبی عمر تک زندہ رہا۔ اس نے موت سے قبل اپنا ولی عہد مقرر کیا تھا جو اس کی ملکہ دت دیوی کے بطن سے تھا۔ اس ولی عہد نے اپنے دادا چندر گپت کا نام اختیار کیا۔

چندر گپت دوئم ۳۷۵ء (۵۵ س گ):

چندر گپت دوئم سمدر گپت کا بیٹا تھا اور گپت خاندان کا تیسرا بادشاہ تھا جس نے اپنے دادا کا نام اختیار کیا۔ چندر گپت دوئم اپنے والد کی موت کے بعد برسرِ اقتدار رہوا۔ اس کے علاوہ اس نے بکرماجیت کا بھی خطاب اختیار کیا۔ یہ بادشاہ شمالی ہند کے تمام مشہور و معروف بادشاہوں میں شمار ہوتا ہے۔ یہ بادشاہ جو خاصی پکی عمر کا معلوم ہوتا ہے، اپنے باپ کی طرح اپنی سلطنت کو وسیع

کرنے کا شوق رکھتا تھا اور اسی وجہ سے اس نے اپنی طاقت اور توجہ جنوب مغرب کی طرف مبذول کی۔ یہ علاقے غیر ملکی سرداروں کے قبضے میں تھے۔ ان کو اپنی سلطنت میں شامل کیا۔ ان میں ایک ریاست جو قدیم نام مغربی سترپ سے مشہور ہے، پر ایک بیرونی قوم سک قابض تھی۔ سک قوم کے سردار یا بادشاہ کو بھی اس نے قتل کیا جو کسی اور مرد کی بیوی سے غیر رسمی تعلق کیلئے اس کے گھر موجود تھا۔ دریائے سندھ تک تمام مغربی پنجاب اور شمال میں کوہ ہمالیہ تک کے علاقے اس کی سلطنت میں شامل تھے۔

چندر گپت دوئم نے اپنے باپ کی طرح مغربی حملہ آوروں کا راستہ روکے رکھا لیکن خطرہ اس کی زندگی میں بدستور منڈلاتا رہا کیونکہ ایک طرف ہن اور دوسری طرف ایرانی حکومت واقع تھی۔ چندر گپت دوئم نے ان غیر ملکیوں کو دریائے سندھ سے آگے نہیں جانے دیا اور ہر حملہ پسپا کر دیا۔ چندر گپت دوئم نے تمام ہندوستان کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا اور تمام شاہی القابات بھی اختیار کیے۔ اس کی موت سے متعلق کوئی واضح شہادت معلوم نہیں ہوتی لیکن چندر گپت دوئم کی وفات ۴۰۱ء کے بعد واقع ہوئی تھی۔ اس کی ایک شہادت فاہیان کی سیاحتِ ہند ۴۰۷ء تا ۴۱۱ء سے ملتی ہے۔ ہندوستان میں چندر گپت دوئم بکرما جیت کی حکومت تھی جبکہ کمار گپت کی تخت نشینی ۴۱۳ء میں ہوئی جو چندر گپت کا بیٹا تھا۔ ان اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ چندر گپت دوئم کی موت ۴۱۲ء یا ۴۱۳ء میں واقع ہوئی تھی۔ کمار گپت چندر گپت دوئم کی بیوی دھروا دیوی کے بطن سے تھا اور ۴۱۳ء کے قریب ہی عین جوانی کے عالم میں تخت پر بیٹھا لیکن اپنے باپ اور دادا کی سلطنت کنٹرول کرنے میں ناکام رہا کیونکہ اس کی طویل مدت حکمرانی جو ۴۰ سے ۵۰ سال پر مشتمل تھی اور اس بادشاہ کے زمانہ حکومت کے واقعات تفصیلاً معلوم نہیں ہوتے سوائے اس کے کہ پانچویں صدی عیسوی کے وسط میں مغرب سے غیر ملکی حملہ آور، جو ہن کے نام سے مشہور تھے، ایک بار پھر ملک پر ٹوٹ پڑے اور دیکھتے ہی دیکھتے تمام شمال مغربی ہند پر طوفانِ حشر کی طرح پھیل گئے۔ خود کمار گپت کی ان حملہ آوروں سے لڑائی کے متعلق کچھ معلوم نہیں ہوتا۔ کمار گپت اول کی موت ۴۵۰ء یا

۴۵۵ء کے درمیان ہوئی کیونکہ ۴۵۵ء میں ہنوں کا مقابلہ گپت خاندان کے ایک بادشاہ، جس کا نام یقیناً سکندر گپت تھا، نے کیا۔ اس لڑائی میں سکندر گپت نے ہُن حملہ آوروں کو شکست دی جس کا تفصیلاً ذکر آگے آئے گا۔

سکندر گپت (۴۵۵ء):

کمار گپت اول کی موت کے بعد اس کا بیٹا سکندر گپت تخت پر بیٹھا۔ اس وقت ملک کی سیاسی فضا خطرناک صورت اختیار کر چکی تھی اور سلطنت میں زوال و انحطاط کی ابتدا ہو چکی تھی۔ ملک کی ایک دولت مند قوم پشتی متر کے پاس کافی تعداد میں جنگجو موجود تھے۔ یہ قوم ہندوستان کے بڑے خاندانوں میں شمار ہوتی تھی اور اکثر اوقات خود مختیاری کی زندگی بسر کرتی رہتی تھی۔ اس پشتی متر قوم کی لڑائی گپت بادشاہ سے ہوئی جس کا باقاعدہ آغاز ۴۵۰ء میں ہوا تھا۔ اس لڑائی نے گپت حکومت کو انتہائی کمزور کر دیا جبکہ دوسری طرف وہ ہن حملوں کی وجہ سے خطرناک حالات میں پھنس چکا تھا۔ پشتی متر کی جنگ میں شاہی افواج کو شکست ہوئی۔ اس صدمے کی وجہ سے شاہی خاندان کی بقاء اور استحکام غیر مستحکم ہو گیا تھا اور ملک میں سیاسی اور معاشی اعتبار سے ایک خلاء پیدا ہو گیا۔

شاہی افواج پشتی متر کی جنگ اور شکست کی وجہ سے پہلے ہی کمزور ہو چکی تھیں جبکہ دوسری جنگ ان کے سر پر تھی۔ اس کے علاوہ ہن حملہ آور ملکی بقاء کے لیے مسلسل خطرہ تھے۔ ان تمام حالات کے پیشِ نظر سکندر گپت کی ہمت، قابلیت اور سیاسی حکمت عملی نے ہنوں کے بڑھتے ہوئے طوفان کو روکا اور ان کو شکست دے کر سکندر گپت نے اپنے خاندان کی شاہی حیثیت کو بحال کر دیا۔ اس راجہ کی عقل مندی اور فہم و فراست کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ہن حملہ آوروں سے مقابلہ کرنے کے لیے فوجی تربیت کے سلسلے میں اُسے ایک رات کھلے آسمان کے نیچے ننگی زمین پر سو کر گزارنی پڑی۔

ہنوں کا دوسرا حملہ اور ترمان بادشاہ:

پہلے حملے میں ہن قبائل سکندر گپت سے شکست کھا کر واپس لوٹنے پر مجبور ہو گئے کیونکہ اس

وقت ان میں مرکزی یا اعلیٰ قیادت موجود نہیں تھی۔ صرف ایک "جیوی" قوم تھی۔ ایک جرگہ تھا جس میں ایک سے زائد جنگی سردار موجود تھے، ان پر مشتمل تھا اور ہندوستان پر حملہ آوروں کی قیادت کر رہا تھا جن کے پاس کوئی خاص یا بڑی فوجی طاقت بھی نہ تھی۔ دوسری مرتبہ تقریباً پانچویں صدی عیسوی کے آخر میں ہن ہندوستان پر حملہ آور ہوئے تو اس وقت ہن قوم کی قیادت ترمان نامی ایک شخص کرر ہا تھا جو نہایت جنگجو، ظالم اور سفاک تھا۔ اس بادشاہ کا نام "ترمان" یا "تورمان" بھی ہوسکتا ہے۔ اس نے اپنی فوج کی تربیت اس طرح کی کہ انہیں خونخوار بنا دیا۔ ظلم و بربریت کا ایسا سبق سکھایا کہ جب ہن افواج دوبارہ دریائے سندھ کو پار کر کے ہندوستان میں داخل ہوئی تو انہوں نے ظلم اور سفاکی کی وہ داستان رقم کی جس کی ہندوستانی تاریخ میں مثال نہیں ملتی۔ ترمان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ بادشاہ ۵۰۰ء سے قبل شمالی اور وسطی ہندوستان کا حکمران بن چکا تھا۔ اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہن فوج کا دوسرا حملہ تقریباً ۴۸۰ / ۴۹۰ء کے دوران ہوا ہوگا۔ ترمان اور اس کی فوج نے جو ظلم و ستم ہندوستانی علاقوں پر کیے، وہ دل دہلا دینے والے واقعات ہیں۔ انہوں نے شہروں کے شہر تباہ کر ڈالے۔ سرسبز و شاداب کھیت جلا کر خاک کر دیے۔

ترمان کی فوج نے شہر اور دیہات و قصبات کثیر تعداد میں اس طرح جلائے کہ وہ خاک کا ڈھیر بن گئے۔ یہاں تک کہ کھیت اور مویشی بھی ان کے ظلم سے نہ بچ سکے۔ حتیٰ کہ اس کے متعلق مشہور کہاوت بھی ہے کہ "جلانے والا بادشاہ"۔ اس بادشاہ کے ہاتھوں ظلم کا نشانہ بننے والے شہروں میں ایک شہر روڑاں کے مقام پر بھی تھا جو پانچویں صدی کے آخر میں ہن فوج کے ہاتھوں تباہ و برباد ہوا۔ اس کے اب صرف نشانات باقی ہیں جن کی تفصیل آگے آئے گی۔

ترمان ایک بڑی فوج کے ساتھ کشان سلطنت پر حملہ آور ہوا جو کابل سے لے کر گنگا کے میدانوں تک پھیلی ہوئی تھی۔ واسودیو کی موت کے بعد کشان سلطنت افراتفری کا شکار ہو چکی تھی جبکہ باقی ماندہ کسر ہن فوج نے پوری کر دی۔ یہ ہن حملہ آور کابل اور پشاور کے راستوں سے گندھارا اور شمالی ہندوستان پر حملہ آور ہوئے۔ دریائے سندھ کا مغربی علاقہ تو پہلے ہی ان کے قبضے

میں آ چکا تھا۔ ٹیکسلا اور جنوب کی تمام میدانی پٹی موجودہ "تھل" سے بھی آگے دریائے سندھ اور چناب کے مقامِ اتصال تک کے علاقوں کو انہوں نے نیست و نابود کر دیا۔ پہلے پہل تو ترمان نے پشاور کو اپنا مرکز بنایا لیکن جیسے جیسے اس کی فتوحات کا سلسلہ اندرونِ ہند میں بڑھتا چلا گیا، اس نے مالوہ کو اپنا دارالسلطنت قرار دے دیا۔ ہن بادشاہ فتح در فتح چلتا ہوا پاٹلی پتر اور متھرا، جہاں اس وقت گپت خاندان کی سلطنت قائم تھی، پر حملہ آور ہوا۔ یہاں ترمان نے گپت بادشاہ کو شکست دی۔ اس کا نام بھان گپت تھا۔ اس گپت بادشاہ نے مجبوراً ہنوں کے ظلم سے بچنے کے لیے ترمان کی حاکمیت اعلیٰ کو قبول کر کے ان کا باج گزار بننا قبول کر لیا۔ کچھ دوسرے ہندی راجاؤں نے بھی ہن بادشاہ کی اطاعت قبول کر لی جن میں ونُھی کا راجہ بھی تھا۔ وہ بھی ان کا اطاعت گزار بن گیا۔ ترمان ۵۰۰ء تک ہندوستان کا طاقت ور ترین بادشاہ بن گیا اور اس نے مشہور ہندی خطاب "راجہ مہاراجگان" بھی اختیار کر لیا۔ اس بادشاہ کے سکے کم از کم ہمیں تو کہیں سے بھی نہیں ملے لیکن وی اے سمتھ نے ان کے دورِ حکومت کے تین کتبوں کا حوالہ دیا ہے جس میں انہوں نے لکھا ہے کہ بحوالہ ڈاکٹر فلیٹ کی کتاب گپتا انسکر پیشنر ایک کتبہ صوبہ جات متوسط کے ضلع ساگر کے مقام ایران پر جبکہ دوسرا کوہستانِ نمک کے مقام "کراکے" جس کی تاریخ ضائع ہوگئی تھی، سے ملا۔ اِپی گریفیا انڈیکا جلد اول صفحہ ۲۳۸ کے مطابق تیسرا کتبہ وسطی ہند میں گوالیار کے مقام پر ملا جس پر ترمان اور اس کے بیٹے ہرکل کی تخت نشینی کے پندرھویں سال کی تاریخ موجود تھی۔

مہرکل (۵۱۰ء):

ہن بادشاہ ترمان یا تورمان کی وفات کے بعد اس کا بیٹا مہرکل برسرِ اقتدار آیا۔ ہرکل باپ کی زندگی سے ہی سلطنت کے کاموں میں شریک تھا۔ یہ بادشاہ ہندوستان کے ان علاقوں کا حکمران بنا جن کو پہلے ان کا باپ مستحکم کر چکا تھا۔ یہ بھی بہت ظالم اور سفاک بادشاہ تھا۔ اس کے مزاج میں ہنوں کی بے رحمی اور سفا کی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔ اکثر مورخین کے پیشِ نظر اس بادشاہ کی ظالمانہ کارروائیوں کے علاوہ کوئی مفصل تفصیل نہیں ملتی۔ اس کے مظالم سے انسان تو کیا، حیوان بھی

نہ بچ سکے۔ ایک روایت میں ہے کہ مہرکل جنگلی ہاتھیوں کو بڑے بڑے گڑھوں اور غاروں میں دھکیل دیتا تھا۔ اس طرح ان کے چیخنے اور چلانے سے لطف اندوز ہوتا تھا۔ مہرکل کے متعلق جس نے سب سے زیادہ تحریر لکھی، وہ یورپی مورخ گین ہے جس نے ہنوں کی اکثریت، قوت اور نقل و حرکت کے بارے میں لکھتے ہوئے ان کی سفاکانہ اور بے رحمی کے ان واقعات کا ذکر کیا ہے کہ کس طرح مقامی ہندوستانی پریشان حال لوگ ہن بادشاہ کی ظلمانہ کاروائیوں کا ذکر کرنے سے ڈرتے اور مبالغہ آمیز باتوں کے ساتھ ان کو بیان کرتے تھے۔ یہ وجہ صرف مہرکل کے انتہائی ظلم و بربریت کا نتیجہ تھی کیونکہ ان کے کھیت، گاؤں اور گھر اُن کی آنکھوں کے سامنے جلا کر خاکستر کر دیے جاتے تھے اور ان کے مقتولوں کی لاشوں کو کشتیوں میں بھر کر دریا میں ڈال دیا جاتا تھا۔ اس ظالم ہن بادشاہ کے متعلق ایک عیسائی راہب جس نے ۵۴۷ء میں ہندوستان کی سیاحت کی، نے ایک عجیب وغریب کتاب "کاسمس انڈ کو پلیسیز نا" لکھی جس میں وہ گورے ہن بادشاہ کا ذکر بھی کرتا ہے کہ اس بادشاہ کے ظلم وستم کی حد تو یہ ہے کہ جب یہ بادشاہ اپنے باج گزاروں کے پاس ملک میں وصولی کیلئے جاتا تھا تو اپنے ساتھ ایک بڑی فوج جس میں دو ہزار جنگی ہاتھی اور بہت سی فوج لے کر جاتا تھا۔ جس ریاست کا حاکم خراج دینے میں تاخیر کا مظاہرہ کرتا، بادشاہ اس ریاست کو نیست و نابود کر دیتا تھا۔ قوم گاتھ کی طرح ان وحشی ہنوں کی ظلم وستم اور دہشت گردی کی وجہ سے ہندوستانیوں کو بہت سارے مصائب برداشت کرنا پڑے۔ ان وحشی ہنوں کے ظلم وستم اور قابلِ نفرت عادات وخصائل کی وجہ ایک یہ بھی تھی کہ ان کے نزدیک کوئی چیز بھی پاک یا متبرک نہیں تھی، اس لیے وہ ہر قسم کی وحشیانہ حرکتیں کرتے تھے۔ عیسائی راہب اس ہن بادشاہ کو "گلاس" کا نام دیتا ہے اور اسے ظالم ترین بادشاہوں کی فہرست میں شامل کرتا ہے۔

مہرکل نے اپنے باپ کے دارالسلطنت مالوہ کی بجائے "ساکل" موجودہ سیالکوٹ کو اپنا مرکز بنایا اور ظلم وستم کو اس قدر وسیع کر لیا کہ ہندوستانیوں نے تنگ آ کر بالآخر ایک ایسے اتحاد کی ضرورت کو محسوس کیا جو اس ظلم کا قلع قمع کر سکے۔ اس لیے مگدھ کے راجہ بالادت نرسمد گپت وسطی ہند کے

ایک دوسرے راجہ یسودرھن کی کارکردگی میں دس مقامی راجاؤں کا اتحاد قائم کیا گیا جس میں تمام راجاؤں کی مشترک فوج ترتیب دی گئی جس کی تعداد تقریباً پچاس ہزار سے ایک لاکھ کے درمیان تک ہوسکتی ہے۔ یہ فوج تمام جنگی سامان سے لیس تھی۔

ہنوں کے ساتھ اس فوج کی جنگ تقریباً ۵۲۸ء کے قریب ہوئی۔ اتحادی افواج نے جنوب مشرق کی طرف سے ہرکل پر حملہ کیا۔ یہ واضح نہیں کہ یہ جنگ کس مقام پر ہوئی لیکن مورخین کا خیال ہے کہ موجودہ پاک و ہند سرحد کے قریب سیالکوٹ کے مشرق میں ہوئی تھی۔ مہرکل کی فوج کو شکست ہوئی اور بادشاہ کو گرفتار کرلیا گیا۔ ہن بادشاہ نے نرسمد گپت کے ساتھ جان کی امان کے معاہدے کے تحت گرفتاری پیش کردی اور وہ اس ہندی راجہ کی سفارش پر رہا بھی کر دیا گیا۔

رہائی کے بعد مہرکل جب سلطنت ساکل (سیالکوٹ) پہنچا تو اس کا چھوٹا بھائی یا کوئی دوسرا ہن سردار جس کو خود مہرکل بطور نگران کھڑا کر کے گیا تھا، حکومت پر قابض ہو چکا تھا اور اس نے خود مختیاری کا اعلان بھی کر دیا۔ ہرکل کو صرف شہر میں داخل ہونے سے ہی نہیں روکا، بلکہ اس کے قتل کا حکم بھی جاری کر دیا۔ ان حالات میں مہرکل نے بھاگ کر کشمیر میں پناہ حاصل کر لی اور وہاں کے بادشاہ نے اس کی بہت خاطر تواضع کی اور ایک مختصر سا علاقہ بھی ہن بادشاہ کو بطور جاگیر عطا کر دیا۔ یہ ظالم کچھ عرصہ تو اپنی حالت پر قناعت کر کے بیٹھا رہا اور خاموشی سے حالات کا انتظار کرتا رہا مگر جونہی اسے موقع ملا، اس نے اپنے محسن کی سلطنت پر شب خون مار دیا۔ کشمیر اس کی سلطنت کے ساتھ جڑا ہوا ملک تھا اور مہرکل وہاں خاموشی سے ایک فوج جمع کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ کشمیر کی ریاست پر قبضہ کرنے کے بعد اس نے مغرب کا رخ کیا اور گندھارا کے علاقے پر حملہ کر دیا۔ یہاں کے حاکم کو جو غالباً ہن قوم سے ہی تھا، اچانک اور دغا بازی سے قتل کر دیا۔ شاہی خاندان جو کہ ممکن ہے کشان ہوں، کے تمام افراد کو قتل کر دیا۔ قتل و غارت کی ایسی کوئی پہلے مثال نہیں تھی۔ ہزاروں آدمیوں کو قتل کر کے دریائے سندھ میں ڈال دیا گیا اور کئی ہزار آدمی جن کو گرفتار کیا گیا تھا، دریائے سندھ کے کنارے ذبح کر دیا گیا۔ انسانی خون کی کثرت سے دریا کا پانی سرخ ہوگیا۔

کافی دنوں تک انسانوں اور حیوانوں نے دریا کا پانی بھی استعمال نہ کیا۔ اس وحشی حملہ آور نے جو تباہی و بربادی کے دیوتا شیو کا پجاری تھا، نے بدھ مت مذہب کے ماننے والوں کو جو اس علاقے میں اکثریت سے آباد تھے، دشمنی کا اظہار کرتے ہوئے بے دردی سے ان کی خانقاہوں اور سٹوپوں کو لوٹ کر تباہ کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس وقت ان بدھ خانقاہوں میں بہت زیادہ خزانہ بھی موجود تھا جو مہر کل نے لوٹ لیا۔

یہ ظالم ان لوٹے ہوئے خزانوں سے اپنے وحشیانہ ارادوں کی تکمیل نہ کر سکا اور ایک سال کے اندر ہی مر گیا۔ اس کی موت کے وقت زمین میں زلزلے آئے، گرج اور بجلی کی تیز اور آنکھیں پھاڑ دینے والی چمک کے ساتھ ژالہ باری ہوئی، تیز طوفان آئے اور ہندوستانی علاقے تیرہ و تاریک ہو گئے۔ انسانیت کا دشمن ہلاک ہو گیا۔

بدھ مذہب اور ہون سانگ کی تحریروں کے مطابق بدھ مت مذہب کے مقدس ولیوں نے انسانیت پر رحم کھا کر دعا کی کہ بے شمار جانوں کے مارنے والے اور بدھ مذہب و شریعت کو مغلوب کرنے کی وجہ سے یہ ظالم دوزخ کے اسفل ترین درجے میں ڈال دیا جائے جہاں بے شمار زمانوں تک انقلابِ ہلاکت خیز میں پڑا رہے۔ مہر کل کی موت کے وقت اور مقام کے بارے میں کوئی شہادت نہیں ملتی جس سے اس کی موت کی تاریخ و مقام کا تعین کیا جائے۔ چینی سیاح ہون سنگ جس نے ۶۴۰ء میں ہندوستان کی سیاحت کی، وہ مہر کل کی موت سے ۱۰۰ سال بعد ہندوستان آیا۔ ہون سنگ کی تحریروں کا ترجمہ ڈاکٹر فلیٹ اور ویٹرس نے کیا ہے۔ ویٹرس جلد اول صفحہ ۲۲۸ بیل الکارڈس جلد اول صفحہ ۱۶۵-۱۷۲، بیل انڈین انٹی کویری جلد ۱۵ صفحہ ۳۵۴ کے مطابق سب نے اس بات پر اتفاق کیا ہے کہ مہر کل کی موت چینی سیاح کی آمد سے ۱۰۰ سال قبل ہوئی۔ ہون سنگ نے مہر کل کی موت سے متعلق بہت سارے بیان دیے ہیں۔ ایک بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مہر کل کی موت چنیوٹ کے شمال میں کوہِ نمک کے علاقے میں واقع ہوئی کیونکہ مہر کل کشمیر سے نکل کر اپنی ریاست پر قبضہ کرنا چاہتا تھا جس کے لیے اس نے اس علاقے پر حملے شروع کیے

تھے۔اس دوران وہ اپنی ریاست کے قریبی مقام چنیوٹ کے قریب مقیم تھا کہ اس پر موت واقع ہوگئی تھی۔

حصہ دوم:

روڑاں کی تاریخ اور آثارِ قدیمہ

روڑاں کا محل وقوع

روڑاں ضلع لیہ تحصیل چوبارہ یونین کونسل نواں کوٹ کا ایک قدیم قصبہ ہے جو صحرائے تھل کے عین وسط میں ضلع بھکر کی تحصیل منکیرہ کی سرحد پر واقع ہے۔ لیہ کی تحصیل چوبارہ اور بھکر کی تحصیل منکیرہ یہ دونوں شہر تھل کے درمیانی علاقے میں اس طرح آباد ہوئے کہ ان دونوں شہروں کو شمال سے جنوب یا جنوب سے شمال ایک لائن میں تعمیر کیا گیا اور ان کی اس وقت کوئی وجہ ضرور ہوگی جب یہ شہر آباد کیے گئے۔ اگر ہم ان کا محل وقوع کچھ اس طرح دیکھیں کہ شمال میں میانوالی اور جنوب میں ملتان تو بھی یہ دونوں شہر ایک قطار میں آتے ہیں۔ جبکہ روڑاں کا قصبہ بھی ان ہی کی لائن میں منکیرہ اور چوبارہ کے درمیان واقع ہے۔ اگر ہم ان تینوں مقامات کا تقابل دریائے سندھ اور جہلم سے کریں تو دونوں اطراف سے وقفہ برابر ہے۔ اگر ہیڈ تریموں سے دریائے سندھ کے مشرقی کنارے قدیم شہر کروڑ کی جانب لائن کھینچیں تو روڑاں کا مقام درمیان میں، اگر میانوالی سے ملتان کی طرف لائن کھینچیں تو پھر بھی روڑاں درمیان میں آتا ہے۔ یہ کوئی وجہ ضرور تھی کیونکہ جب زمانہ قدیم میں روڑاں کے مقام پر شہر آباد کیا گیا تو اس کو چاروں اطراف سے منصوبہ بندی کے تحت تعمیر کیا گیا۔ روڑاں کے محل وقوع سے متعلق مزید تفصیل اس کے نقشہ میں دیں گے۔ اس وقت روڑاں کا قصبہ پسماندہ ترین علاقوں میں شمار ہوتا ہے جو تھل میں سب سے کم ترقی یافتہ ہے۔ اگر اس کو ایک مربع کلومیٹر میں دیکھا جائے تو روڑاں کا قصبہ ۱۰ چھوٹی چھوٹی بستیوں پر مشتمل ہے جس

کی آبادی تقریباً ایک ہزار نفوس پر مشتمل ہے۔ یہاں پر بہت ساری قومیں آباد ہیں۔اس علاقے کا نام روڑاں پاک و ہند کی تقسیم سے بھی پہلے سے چلا آ رہا ہے۔

روڑاں کی وجہ تسمیہ

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس علاقے کا نام روڑاں کیوں، کب اور کس نے دیا تھا اس کے متعلق دو روایتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس علاقے میں کثرت سے روڑے پائے جاتے تھے جن کی وجہ سے اس علاقے کا نام روڑاں پڑ گیا لیکن یہ کوئی معقول روایت نہیں۔ جبکہ دوسری روایت یہ ہے کہ قبل از پاکستان یہاں ایک ہندو قوم ''اروڑہ'' بہت زیادہ تعداد میں آباد تھی۔ یہ شہادت قابلِ قبول بھی ہے۔ ۱۸۷۸ء میں جب ہندوستان برصغیر تھا اور برٹش گورنمنٹ کے قبضے میں تھا تو پورے برصغیر میں زرعی اصلاحات کی گئیں۔ ۱۸۷۸ء اور اس کے بعد کی تاریخ میں ہمیں یہاں اروڑہ خاندان کی جاگیریں اور علاقے پر ان کا سیاسی اثر رسوخ نظر آتا ہے۔ جبکہ تاریخِ پنجاب کے حوالے سے کہ جب رنجیت سنگھ کی فوج نے منکیرہ اور لیہ کے علاقوں پر قبضہ کیا تھا تو اس وقت مسلمانوں کی بجائے انہیں ہندو اروڑہ قوم کے لوگوں کو قلعہ منکیرہ اور لیہ بطور باج گزار حکمران مقرر کیا۔ انگریز فوج کے قبضے کے بعد لیہ کو ۱۹۲۹ء میں تحصیل کا درجہ دیا گیا تو اس وقت ضلع کو ۹ ذیل میں تقسیم کر دیا گیا۔ ان میں ایک ذیل نواں کوٹ بھی تھی۔

اس ذیل نواں کوٹ کا پہلا ذیلدار اروڑہ مل نامی ایک ہندو کو مقرر کیا گیا۔ اروڑہ مل کافی عرصہ تک ذیلداری کرتا رہا۔ نواں کوٹ کے ایک مسلمان سردار قیصر خان مگسی جو موجودہ قیصر خان مگسی ایم۔ پی۔ اے کا دادا تھا، کے ساتھ الیکشن میں اروڑہ مل ہار گیا اور شکست کے دکھ میں مر گیا۔ ان حوالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس علاقے کا نام پہلے اروڑہ پڑا لیکن بعد میں تبدیلی زبان اور عام لوگوں کے مختلف بول چال کی وجہ سے اروڑہ کی بجائے روڑاں مشہور ہو گیا جو آج تک مشہور ہے۔

روڑاں عہد قدیم میں

قدیم ہندوستان کی پہچان وادیٔ سندھ کی تہذیب ہے جس کا ارتقاء آج سے تقریباً ۸ ہزار سال پہلے ہوا۔ وہ وادی جس کو ہم اس قدیم تہذیب کی جائے پیدائش گردانتے ہیں، خطہ یا سرزمین جہاں سے تہذیب وادیٔ سندھ کی ابتداء ہوئی، یہ دریائے سندھ کا مشرق کا علاقہ ہے جو میانوالی اور خوشاب کے اضلاع سے لیکر جنوب کا میدانی خطہ جس کو آج کل تھل یا ریگستان بھی کہا جاتا ہے، سے شروع ہو کر جنوب میں سمندر تک پھیلا ہوا ہے۔ یہ وہ علاقے تھے جہاں سے تہذیب وادیٔ سندھ نے اپنا ارتقائی سفر شروع کیا۔ ہم آج سے ۴ / ۵ ہزار سال پیچھے جائیں تو ان کالے رنگ اور چھوٹے قد والے دراوڑی نسل کے لوگ جو اصل میں اسی سرزمین کے سپوت تھے، اور یہ لوگ انسانی زندگی کی ابتدائی مراحل میں تھے اور ابھی تک انہوں نے مکمل تہذیب و ثقافت کے وہ راز حاصل ہی نہیں کیے تھے جن سے ان کی زندگی ایک تہذیب یافتہ انسان کا مقابلہ کر سکتی۔ یہ قدیم انسان اور تہذیب و ثقافت جو بعد میں اس سرزمین کی پہچان بنی، کہاں سے اور کیسے آئی؟ اس کے متعلق بہت ساری روایات پائی جاتی ہیں۔ میں زیادہ تفصیل میں نہیں جاتا اور اختصار سے عرض گزار ہوں کہ بقول مورخین آج سے ۸ / ۱۰ ہزار سال پہلے تک ہندوستان کا تمام میدانی خطہ شمالی پہاڑی سلسلے سے آنے والے پانی کے بہاؤ کی لپیٹ میں تھا جس کے متعلق ہم بیان کر چکے ہیں۔لیکن ایک وقت ایسا بھی آیا کہ اس پانی کے بہاؤ میں کمی واقع ہوئی اور اس وجہ سے پانی نے دریاؤں کی شکل اختیار کر لی۔اب ہندوستان کا میدانی علاقہ ایک جزیرہ نما شکل اختیار کر گیا۔ان جزیروں پر پانی کی جگہ گھاس اور درختوں نے لے لی۔

اب کوہستان کے نیچے کا جنوبی میدانی خطہ سرسبز و شاداب جنگلات میں تبدیل ہو گیا۔ یہ وہ وقت تھا کہ جب انسان اور حیوان پہاڑوں کی تنگ دست زندگی سے نجات پانے کی کوشش کر رہے تھے۔موقع پاتے ہی انسانوں نے پہاڑی غاروں کو چھوڑ کر ان سرسبز و شاداب میدانی علاقوں کا رخ کیا اور دریائے سندھ کے مشرقی کناروں کے ساتھ ساتھ آباد ہوئے۔سب انسانوں نے مل

جل کر رہنے اور کاشتکاری کا طریقہ اختیار کیا اور ساتھ ہی فن وثقافت سے نا آشنا قدیم انسان نے ایک خاندانی سماج کی شروعات کیں اور اس طرح چھوٹی چھوٹی بستیوں کا قیام کیا جو ایک ہزار سال بعد تہذیب یافتہ انسانی شہروں میں تبدیل ہو گئیں۔ جیسا کہ ہڑپہ اور موہنجوداڑو اور بہت سارے مقامات ایسے بھی ہیں جن کے نشانات تو ملتے ہیں لیکن ان کھنڈرات اور آثار کے متعلق تحقیق اور ریسرچ کسی پایہء انجام تک نہیں پہنچی۔ جیسا کہ روڑاں کا مقام۔ حالانکہ تھل کے اکثر علاقوں میں جگہ جگہ ایسے قدیم آبادیوں کے نشان پائے جاتے ہیں لیکن بدقسمتی سے یہ علاقے قدیم ہندوستان کی تاریخ کا حصہ نہ بن سکے اور بے بسی کے عالم میں ریت کے ٹیلوں میں مدفون پڑے ہیں۔ ان میں سے ایک روڑاں کے کھنڈرات اور آثارِ قدیمہ بھی ہیں جن کی تاریخی اہمیت کو مجھ جیسے نا اہل شخص نے اجاگر کیا۔ یہ کچھ دوستوں کی مہربانی ہے وگرنہ بندۂ ناچیز کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ روڑاں کے آثارِ قدیمہ دو حصوں میں منقسم ہیں جن کو آسانی سے سمجھنے کے لیے میں نے سائیڈ "اے" اور سائیڈ "بی" کا نام دیا ہے۔ سائیڈ "اے" مشرق کی طرف اور سائیڈ "بی" مغرب کی طرف جن کی تفصیل اگلے باب میں آئے گی۔ سائیڈ "اے" قدیم ہے یہاں سے جو آثار ملے ہیں جن میں سب سے اہم چیز سکے ہیں۔

یودھیا جیوی سے لے کر باختری حکمران تک جبکہ یہاں تو سکندر یونانی کے حملے کا بھی پتا چلتا ہے کہ جس وقت مقدونوی افواج نے حملہ کیا اس وقت تھل کے علاقے پر یودھیا جیوی کی حکومت تھی اور یہ علاقہ وہیکا ریاست کے نام سے مشہور تھا۔ جبکہ سائیڈ "بی" سے صرف کشان بادشاہوں کے سکے ملے ہیں جنہوں نے چوتھی صدی عیسوی کے آخر تک کی اور بعد میں اس شہر کو گورے ہن بادشاہ نے نیست و نابود کر دیا۔ کشانوں کے علاوہ گپت خاندان کے سمدر گپت اور کمار گپت کے سکے بھی پائے گئے ہیں۔ روڑاں جیسے پورے تھل میں ہزاروں مقامات پائے جاتے ہیں جہاں تہذیب وادیٔ سندھ اور اس کے بعد آنے والی اقوام کی آبادیاں تھیں۔ جگہ جگہ ریت کے ٹیلوں میں ان کے نشانات ملتے ہیں لیکن یہ بات ایک حقیقت ہے کہ پورے تھل کے علاقے میں میانوالی سے لے

کر ملتان تک قدیم تاریخ جو قبل از مسیح سے بھی پہلے اگر کوئی ریاست کا مرکزی مقام تھا تو وہ صرف روڑاں کے مقام پر واقع تھا۔ تقریباً ایک کلو میٹر سے دو کلو میٹر پر محیط وسیع علاقے میں کھنڈرات پائے جاتے ہیں۔ تھل سے متعلق تاریخی مقام نہ ہونے کی وجہ سے ایک پریشانی ہوتی ہے کہ یہاں جو شہر آباد تھا اس کا نام کیا تھا؟ کیونکہ یہاں جو اقوام رہ چکی ہیں، ان کے متعلق تو علم ہو گیا ہے لیکن جگہ کا نام ابھی تک معلوم نہیں ہو سکا۔ کچھ قدیم تحریروں سے اشارے ملتے ہیں لیکن ان کی صحت سے متعلق ابہام ضرور پایا جاتا ہے۔ ہمیں یہاں سکوں کے علاوہ کوئی دوسرا تحریری مواد نہیں ملا جس سے ہم معلومات حاصل کر سکتے۔

ایک بہت قدیم تحریر جو بعد میں پری پلس نامی کتاب سے مشہور ہوئی، کے مصنف کے متعلق بھی مورخین میں اختلاف پایا جاتا ہے جو ۸۰ء میں لکھی گئی تھی۔ اس کتاب کے مصنف کا بیان ہے کہ دریائے سندھ کے پار مشرقی علاقہ موجودہ تھل سیتھیا ریاست کے نام سے مشہور ہے اور یہاں پارتھی سرداروں کا قبضہ ہے۔ دارالسلطنت اندرون ملک جس کا نام بقول پری پلس آف دی ایریتھر لین سی "متگر" تھا۔ اس ریاست کی بندرگاہ کا نام "بربریکان" تھا جو بڑے دریائی دہانے پر واقع تھا۔ ہم نے اس بات کو ذہن میں لاتے ہوئے بڑی کوشش اور تحقیق کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے کہ بندرگاہ بربریکان موجودہ کروڑ لعل عیسن شہر کے مقام پر واقع تھا جبکہ دارالسلطنت متگر روڑاں کے مقام پر تھا جس کیلئے ہم وضاحت بھی دیں گے۔

برساتی نالے پر آباد قدیم شہر کے آثار

قصبہ روڑاں کے مقام پر پائے جانے والے قدیم شہر اور آبادی کے آثار کو جب ہم قریب سے دیکھتے ہیں تو فوراً دماغ میں یہ بات کھٹکنے لگتی ہے کہ اس قدیم شہر کی تعمیر اور آبادکاری کے وقت اس طرح منصوبہ بندی کی گئی کہ جیسا معلوم ہوتا ہے کسی دریا کے کنارے پر ایک شہر آباد کیا گیا۔ ویسے بھی یہ ایک حقیقت ہے کہ اس مقام پر سے ملنے والے آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شہر دو

حصوں میں اس لیے تعمیر کیا گیا کیونکہ ان کے درمیان تقریباً ۵۰۰ میٹر کا فاصلہ ہے۔ ایک مغرب کی طرف اور دوسرا مشرق میں۔ ان دونوں شہروں کے درمیان ضرور کوئی چیز حدِ فاصل ہوگی اور جیسے ہم باقی ہندوستان کو دیکھ چکے ہیں کہ تمام قدیم شہر دریاؤں اور ندی نالوں کے قریب آباد کیے گئے تھے، کوئی بھی شہر، بستی یا قصبہ ایسا نہ تھا جو پانی کی عدم موجودگی میں آباد ہوا ہو کیونکہ قدیم زمانے میں لوگوں کے پاس پانی کے وسائل صرف دریا یا ندی نالے ہی تھے۔

پانی کے حصول کا دوسرا کوئی نظام موجود نہیں تھا۔ اس لیے جب ہم نے روڑاں کے مقام پر قدیم آبادی کے آثار دیکھے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں آبادیوں کے درمیان ضرور کوئی چھوٹا بڑا دریا یا برساتی نالہ موجود تھا جس کے کناروں پر آبادیاں قائم کی گئی تھیں۔ ہم نقشے کی مدد سے بھی ظاہر کریں گے کہ ان قدیم آبادیوں کے درمیان کیسے دریا یا برساتی نالہ موجود تھا جس سے مقامی قبائل اپنے اور مال مویشیوں کیلئے پانی حاصل کرتے تھے۔ شمال سے جنوب مستطیل شکل میں تقریباً ایک سے ڈیڑھ کلومیٹر تک پھیلے ہوئے آبادی کے نشانات دکھائی دیتے ہیں تو ضرور کوئی وجہ ہوگی۔ ورنہ یہ آبادی مربع شکل میں یا ویسے بھی چاروں اطراف پھیلی ہوئی ہوسکتی تھی۔

المختصر ہوا یہ کہ ان آبادیوں کو ایک ایسے منصوبہ کے تحت آباد کیا گیا کہ ایک سیدھی لائن میں جنوب سے شمال کی طرف۔ ایک اور اہم وجہ یہ ہے کہ ان دونوں شہروں یا قصبوں کا مرکز جنوبی سرے پر تھا جبکہ باقی آبادی اس سے شمال کی طرف دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ سائیڈ "اے" اور سائیڈ "بی" دونوں مقامات کا اگر مشاہدہ کریں تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان قدیم آبادیوں کا مرکز جنوبی سرے ہوا کرتے تھے اور باقی آبادی شمال مغرب کی طرف تھی۔ اگر ان قدیم آبادیوں کی جگہ کا قریب سے جائزہ لیا جائے تو بالکل صاف نظر آتا ہے کہ ان کے درمیان واقعی کوئی بڑا برساتی نالہ گزرتا تھا جو شمال میں نیم پہاڑی سلسلہ ضلع خوشاب سے آتا تھا اور آگے جنوب کی طرف بہتا ہوا دریائے جہلم میں مظفر گڑھ سے کچھ پہلے رنگ پور کے قریب سے شامل ہوجاتا تھا۔ روڑاں کے مقام پر موجود یہ پٹی جو شرقاً غرباً ۲۰۰۰ میٹر چوڑی ہے لیکن شمالاً جنوباً بہت دور تک پھیلی ہوئی ہے

جس میں ۵۰۰ میٹر کی درمیانی زمین کی سطح بالکل نیچی اور چکنی ہے جبکہ پانی کی سطح بھی بالکل اونچی ۸ سے ۱۰ فٹ ہے باقی ۷۵۰ میٹر کے قریب علاقہ مغرب اور مشرق میں بھی بالکل پلین ہے جہاں قدیم آبادیوں کے آثار پائے جاتے ہیں۔ ان کے مغرب اور مشرق میں وسیع ٹیلوں کا سلسلہ دور تک شمالاً جنوباً پھیلا ہوا ہے۔ یہ ایک ایسا حلقہ ہے جو ان تمام شواہد کے ساتھ ظاہراً موجود ہے اور ہمارے نظریے اور اس خیال کو جو ہم نے پیش کیا ہے، ایک شاہد کے طور پر واضح کرتا ہے۔ جس وقت یہ آبادیاں اور قصبات قائم تھے، اس وقت اس جگہ سے ایک برساتی نالہ یا دریا گزرتا تھا۔ ہمارے پاس کوئی ایسی تاریخی شہادت موجود نہیں ہے کہ جو پہلی یا دوسری صدی عیسوی یا قبل از مسیح یہ ظاہر کرے کہ دریائے سندھ کا مشرقی میدانی خطہ جہاں وادیٔ سندھ کی قدیم تہذیب نے جنم لیا اس کی جغرافیائی حیثیت کیا تھی۔

اگر کوئی تحریری مواد موجود تھا تو موجودہ زمانے کے مورخ اس کو پڑھنے اور سمجھنے سے قاصر رہے۔ جو سمجھ آ بھی گیا تو اس کو بھی بعد میں متنازعہ بنا دیا گیا جیسا کہ پری پلس کے مصنف اور یونانی سیاح اپالونیٹس کو۔ خیال ظاہر کیا جاتا ہے کہ انہوں نے ۴۲ / ۴۳ء میں ہندوستان کی سیاحت کی تھی۔ مغربی پنجاب پر ایک پارتھی بادشاہ فروٹیس حکمران تھا۔ اس کے متعلق کوئی دوسری بات سامنے نہیں آئی۔ صرف پری پلس کے مصنف کا بیان ہے جو دریائے سندھ کی زیریں حصے کو سیتھیا کا نام دیتے ہوئے لکھتا ہے کہ یہ تمام علاقہ پارتھی سرداروں کے قبضے میں تھا جو متواتر خاندانی لڑائیوں میں مصروف رہتے تھے۔ ڈاکٹر میک کرنڈل نے ان کے بیان کا ترجمہ کیا ہے کہ جس کو وی اے سمتھ نے اپنی کتاب میں بھی تحریر کیا ہے مصنف کی بیان ہے کہ اس زمانے میں دریائے سندھ کے سات دہانے، راستے، جگہیں یا گزرگاہیں تھیں، ان میں ایک سب سے بڑا تھا جو جہاز رانی کے قابل تھا۔ مصنف کے مطابق اس دریا کے کنارے پر ایک شہر بھی آباد تھا جس کا نام مورخ نے بربریکان لکھا ہے اور یہی شہر تجارتی بندرگاہ کے طور پر بھی کام دیتا تھا۔ دارالسلطنت اندرونِ ملک واقع تھا جس کا نام مورخ نے متگر تحریر کیا ہے۔ اس کے ۵ / ۴ صدیوں بعد جب چینی سیاح

نے علاقہ تھل کو مغرب سے مشرق کی طرف عبور کیا تو اس نے اسے "ریت کا دریا" قرار دیا۔

بہر حال ہمارا جو خیال اور نظریہ یہ ہے کہ روڑاں کے مقام پر قدیم زمانے میں قصبات اور شہر آباد تھے اور ان کے درمیان ضرور کوئی دریا یا برساتی نالہ گزرتا تھا جس کے واضح آثار اور نشانات پائے جاتے ہیں۔ چکنی مٹی، پانی کی بلند سطح، سیاہ ریت جس کو آج کل "کورو" بھی کہتے ہیں، یہ ریت تعمیراتی کاموں میں استعمال ہوتی ہے، بہت سی جگہوں پر اس کی تہیں پائی جاتی ہیں جہاں سے لوگ اسے نکال کر مکان تعمیر کرتے ہیں۔

روڑاں کی سائیڈ "اے":

ہم نے روڑاں کے آثار اور کھنڈرات کو دو تین علیحدہ حصوں میں تقسیم کر دیا ہے تا کہ سمجھنے میں آسانی ہو۔ یہ کھنڈرات کافی رقبہ پر دور دور تک پھیلے ہوئے ہیں اور ان کے ادوار کے متعلق کچھ ابہام موجود ہے۔ یہاں کے آثارِ قدیمہ کے نمونوں سے حاصل ہونے والی تاریخوں سے پتہ چلتا ہے کہ آخری دور تیسری صدی عیسوی کے آخر یا چوتھی صدی عیسوی کے ابتدا تک آتا ہے۔ جو سکے سائیڈ "بی" سے ملے ہیں، ان کے ذریعے حاصل کردہ معلومات کے مطابق سائیڈ "اے" کا آخری دور ہوشک کا زمانہ تھا جبکہ اس سے قبل کنشک، باختری اور پارتھی بادشاہوں کے سکے بھی ملے ہیں جن میں اپالوڈوٹس، سوٹرمگس اور منندر شامل ہیں۔ اس سے مزید نیچے کی تہہ کو دیکھیں تو قبل از مسیح تیسری اور چوتھی صدی جب یہ علاقے یودھیا جیوی قبائل اور ان کے اتحادی اقوام کے قبضے میں تھے، یہاں ان اتحادی اقوام کے سکے بھی پائے گئے ہیں جو یودھیا جیوی قبائل کے مشترک نام سے جاری کیے جاتے تھے۔ چوتھی صدی قبل مسیح میں یہ علاقہ انہی جنگجو اقوام کے زیرِ تسلط تھا۔ ایک بڑی ریاست جس کو مورخین نے وہیکا یا وہیک کا نام دیا ہے، کا مرکزی مقام روڑاں کی سائیڈ "اے" پر تھا۔ یودھیا قبائل ہندوستان کے قدیم قبائل میں شمار ہوتے ہیں اور یہ لوگ جنگجو خصلت کے مالک تھے۔ یہ ہمیشہ آزاد اور خود مختیار زندگی بسر کرنے کے عادی رہے اور کبھی کسی مرکزی یا حاکم اعلیٰ کے ماتحت نہیں رہے۔ اس لیے جب چوتھی صدی قبل مسیح میں مغربی ہند ایک سے زائد

ریاستوں اور حکمرانوں میں بٹا ہوا تھا تو جنوبی گندھارا کا میدانی علاقہ "تھل" اکثر خانہ بدوش جنگجو اقوام کے قبضے میں تھا۔ ان سب میں طاقتور اور مشہور قوم یودھیا تھی جو کچھ دوسری خودمختیار قوموں کو اپنے ساتھ ملانے میں کامیاب ہوگئی یہ ایک بڑے علاقے پر قابض تھی۔ اور یہ علاقہ ریاست وہیک کے نام سے مشہور تھا۔ اس سے بھی قدیم تہذیب کے بھی آثار پائے گئے ہیں جن میں سیلٹی برتنوں کے ٹکڑے یعنی سیاہ پالش والے برتن جبکہ پتھر کا چورا اور سرخ مٹی کو ملا کر بنائے گئے۔ برتنوں کے ٹکڑے بھی سائیڈ "اے" پر پائے گئے ہیں۔ ان دونوں برتنوں کے ٹکڑوں کا یونانی تہذیب سے تعلق ہے۔ اس یونانی تہذیب وثقافت کو فرعون مصر سائرس اعظم جو چھٹی صدی قبل مسیح میں ہندوستان آیا، نے متعارف کروایا۔ جبکہ ممکن ہے کہ یہ تہذیب ایرانیوں نے یہاں تک لائی ہو جو چھٹی صدی قبل مسیح کے اختتام تک مغربی ہند کے علاقوں پر قابض رہے۔ ان تمام تاریخی حوالوں اور آثارِ قدیمہ کے نمونوں سے حاصل کردہ معلومات کی روشنی میں ہم اس نتیجہ پر پہنچ جاتے جو ایک حقیقت ہے کہ سائیڈ "اے" کا تعلق وادیٔ سندھ کی تہذیب کے ارتقائی دور سے ہوتا نظر آتا ہے۔ یعنی اگر ہم قدیم روڑاں کا تاریخی رشتہ اس طرح قائم کریں جیسے کشان ۶۵ ء سے ۳۸۰ ء اس سے پہلے ۱۶۵ ق م تک باختری اور پارتھی اس سے بھی پہلے ۳۲۰ ق م گپت موریہ۔ موریہ سے قبل ۴۰۰ ق م تک مختلف قبائل اور یودھیے، ان سے پہلے مالوے، کشوواے، کورو، وغیرہ۔ ایرانی، مصری، یونانی ۶۰۰ ق م تک کورو اور پانڈو وغیرہ مختلف ہندو راجے اور ۸۰۰ تا ۱۰۰۰ ق م آریہ اور ۱۵۰۰ سے ۲۰۰۰ ق م تک دراوڑوی قوم اور تہذیب وادیٔ سندھ کے ارتقائی زمانہ تک۔

اروڑاں کی سائیڈ "بی":

سائیڈ بی، اروڑاں کی سائیڈ "اے" کے نیست ونابود ہونے کے بعد آباد ہوئی۔ "اے" کے ویران ہونے کی وجوہات تو ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ یہ مقام "اے" کے مغرب میں اس نالہ کے مغربی کنارے پر واقع ہے۔ اس مقام پر جو آبادی قائم ہوئی اس کا تعلق واسودیو کشان اور آخری کشان بادشاہ کے دور پانچوی صدی عیسوی کے آخر تک ہے۔ "بی" کے مقام پر آباد شہر کو ہن وحشی

قبائل حملہ آوروں نے تباہ و برباد کیا۔ میرے خیال کے مطابق یہ شہر ہنوں کے پہلے حملے میں جلا کر خاکستر کر دیا گیا کیونکہ ہن حملہ آوروں نے ہندوستان پر پہلا حملہ پانچویں صدی عیسوی کے وسط میں کیا تھا۔ ویسے تو اس حملے کو سکندر گپت نے ناکام بنا دیا اور ہن افواج کو شکست کے بعد واپس لوٹنا پڑا لیکن ڈاکٹر ہارنل کے مطابق واسودیو کی موت کے بعد افراتفری کے شکار کشان سلطنت کو اس وحشی قوم نے ہلا کے رکھ دیا۔ یہ قوم کابل سے مغربی ہند میں داخل ہوئی اور دریائے سندھ اور جہلم کے درمیانی علاقے موجودہ تھل جو اس وقت ریاست سیتھیا کے نام سے مشہور تھی، کو تباہی سے دو چار کرتی ہوئی جب وسطی ہند میں داخل ہوئی تو ان حملہ آوروں کا راستہ خاندان گپت کے ایک راجہ نے روکا۔ ہم اگر "بی" کے مقام سے ملنے والے آثار قدیمہ کے نمونوں کو دیکھتے ہیں جن کا تعلق تیسری چوتھی اور پانچوی صدی عیسوی سے ہے۔ اس مقام سے جو سکے ملے ہیں ان کا تعلق زیادہ تر واسودیو اور آخری کشان بادشاہ سے ہے جبکہ کچھ سکے مقامی سرداروں جن کو سیتھی سردار کہا جاتا تھا، سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہم نے یہ دیکھا ہے کہ "اے" کی طرح سائیڈ "بی" بھی شمال اور جنوب مستطیل شکال میں دو کلومیٹر کے علاقہ پر پھیلی ہوئی ہے۔ آبادی کے نشانات موجود ہیں۔ اس شہر کی ترتیب بھی کچھ اس طرح سے ہے کہ شہر کے وسط میں زیادہ گنجان آبادی تھی جو اس بات کی نشان دہی کرتی ہے کہ یہاں خاص اور حکمران طبقہ کے لوگ آباد تھے۔ شمال اور جنوب میں عام لوگ آباد تھے۔

اس کے گرد و نوح میں چھوٹی چھوٹی بستیاں آباد تھیں جہاں کاشتکار مزدور اور کاریگر طبقہ کے لوگ آباد تھے۔ "بی" کے مغرب میں دو کلومیٹر کے فاصلے پر ایک بستی کے نشان پائے گئے ہیں جس سے معلوم ہوتا کہ یہاں مویشی پال لوگ آباد تھے۔ آثارِ قدیمہ سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ان تمام لوگوں آپس میں خاصہ تعلق تھا ایک ہی مذہب اور حکم کے ماننے والے تھے۔ اس علاقہ جس کو ریاست سیتھیا کہا جاتا تھا کیونکہ اس علاقے میں سیتھی قبائل بہت زیادہ تعداد میں آباد تھے۔ سیتھی قبائل کا تعلق ایران کے ایک صوبے سے تھا اس لیے اس علاقہ پر بھی ایرانی حکومت کا بہت

زیادہ عمل دخل پایا جاتا تھا۔

سائیڈ "آر":

"آر" وہ مقام اور جگہ ہے جہاں سے خیال کے مطابق تیسری اور چوتھی صدی عیسوی تک کوئی دریا سندھ کا معاون دریا یا کوئی برساتی نالہ گزرتا تھا کیونکہ موسم برسات میں جب بارشیں زیادہ ہوتی ہیں تو تب شمال میں نیم کوہستانی سلسلہ سے آنے والا پانی ان راستوں سے گزرتا تھا۔ تقریباً موجودہ تھل میں تین چار مقامات پر سے ایسے نالوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔

ہم پہلے بھی عرض کر چکے ہیں کہ پورے تھل کا خطہ جو کبھی تہذیب وادیٔ سندھ کا ارتقائی مقام تھا، جہاں قدیم تہذیب وثقافت اور انسانی آبادیوں کے نشانات پائے جاتے ہیں، کی تحقیق کرنا اشد ضروری ہے۔ اگر یہ کام کسی ماہر آثارِ قدیمہ کی ٹیم کی نگرانی میں کرایا جائے تو ہماری سوچ سے بھی بڑھ کر قدیم تاریخ کے راز افشاں ہوں گے۔ بدقسمتی سے برٹش گورنمنٹ کے بعد اس کام کی طرف کسی نے توجہ نہیں دی۔ بہرحال پرشکوہ نوٹ کے بعد میں اپنے مضمون کی طرف آتا ہوں کہ موسمِ برسات میں پانی کے جو راستے اس علاقہ تھل سے گزرتے تھے، ان میں ایک راستہ موجودہ روڑاں کے مقام سے گزرتا تھا۔ یہ بات دونوں صورتوں میں تسلیم کی جاسکتی ہے کہ اس مقام سے گزرنے والا چھوٹا دریا ہے یا یہ دریائے سندھ کا معاون تھا یا کوئی شمال میں واقع خوشاب کے شمالی پہاڑی سلسلہ سے برسات کا پانی ہوتا۔ اس سے متعلق دو تین آرا ہوسکتی ہیں جس میں سب سے مضبوط دلیل یہ ہے کہ دریائے سندھ کا ہی معاون دریا ہوسکتا ہے۔ اس کے متعلق ایک مورخ کا بیان جس کا ذکر میں پہلے بھی کر چکا ہوں وہ کہ پری پلس کے مصنف یونانی سیاح اپالونیئس جو ۲۳ ؁ء میں ہندوستان آیا۔ اس وقت مغربی ہند پر ایک پرتھی بادشاہ فروٹیس حکمران تھا۔

پری پلس کے بیان کے مطابق جس کا ڈاکٹر میک کرنڈل نے بھی ترجمہ کیا ہے، اور اس بیان کو وی۔ اے سمتھ نے اپنی کتاب قدیم تاریخِ ہند کے باب نمبر ۹ اور صفحہ نمبر ۲۸۸ پر تحریر کیا ہے۔ اس زمانے میں دریائے سندھ کے سات دہانے تھے۔ ان میں ایک سب سے بڑا تھا جو جہاز رانی

کے قابل تھا۔

اسی دریا پر تجارتی بندرگاہ تھی۔ یہ چھوٹا سا دریا کہاں اور کس جگہ پر اختتام پذیر ہوتا تھا؟ کیا یہ پھر سے دریائے سندھ سے مل جاتا تھا؟ یا دریائے جہلم سے ملتا تھا یا پھر سرزمین تھل میں بڑی بڑی جھیلوں کی صورت میں تقسیم ہو کر رک جاتا تھا؟ اس بات کو سمجھنا بہت ہی مشکل کام ہے کیونکہ ہمارے پاس قدیم تاریخِ ہند کا کوئی وجود ہی نہیں جس کی مدد سے ہم ایسے مشکل ترین مسائل کو حل کر سکیں۔ بعید النظر میں غیر ملکی مورخین کی آرا جو انہوں نے ۱۸ ویں اور ۱۹ ویں صدی عیسوی میں تحقیق اور ریسرچ کے دوران دیں، وہ بھی تو ایک نظریہ اور اندازہ ہے، انسانی سوچ کی عکاسی ہے۔

اسی طرح جیسے ہم نے روڑاں کے زمینی حالات اور آثارِ قدیم کی مدد سے اپنے آپ کو قائل کر لیا ہے کہ یہاں سے کوئی ضرور چھوٹا سا دریا گزرتا تھا جس کی وجہ سے یہاں پر شہر اور قصبات کی آبادکاری ممکن ہوئی جس طرح ایک شہر جو سائیڈ "اے" کے نام سے بھی آباد ہوا اور پھر "بی" کے مقام پر بھی ایک شہر آباد ہوا۔ یہ بالکل دریا کے رخ پر آباد کیے گئے تھے۔ اسی کے کنارے شمالاً جنوباً تھے۔ اگر ہم ان شہروں کے کھنڈرات کو دیکھتے ہیں تو کوئی شک کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ ویسے بھی اگر ہم موجودہ وقت میں ان مقامات کو توجہ سے دیکھیں تو جیسے "اے" اور "بی" پر آبادیوں کے نشانات پائے جاتے ہیں اسی طرح سائیڈ "آر" کی جگہ بھی بالکل واضح نشانات اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ یہاں سے ضرور کسی نہ کسی طرح پانی کی موجودگی کا پتہ چلتا ہے۔ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں کہ سائیڈ "آر" کے مقام پر اس وقت بھی باقی علاقے کی نسبت پانی سطح بلند ہے، باقی پورہ تھل کا علاقہ ریت کے ٹیلوں کی دلدل میں پھنسا ہوا ہے جبکہ کہ سائیڈ "آر" کے مقام پر سرخ اور سیاہ چکنی مٹی پائی جاتی ہے۔ دوسرا یہ کہ وہ ریت جو تعمیرات میں استعمال کی جاتی ہے وہ بھی اس جگہ سے ملتی ہے جس کو عام زبان میں کورو کہتے ہیں۔ خود راقم الحروف نے ایک مقام پر کھدائی کرائی تو تقریباً آٹھ دس فٹ تک سیاہ ریت کی ایسے تہ پر تہ تھی جیسے آج کل کے دریاؤں میں ہوتی ہے۔

روڑاں اور قدیم تاریخِ ہند

تھل کے اس قدیم مقام پر پائے جانے والے آثارِ قدیمہ کے نمونے اور شواہد ملے ہیں۔ ان میں قدیم یودھیا قبائل سے لے کر آخری کشان بادشاہ تک کے سکے ہیں جن سے اخذ کردہ نتائج کی بنیاد پر ہم نے روڑاں کے مقام پر پائے جانے والے کھنڈرات اور آثار کو سمجھنے میں کامیاب ہوئے ہیں اور اس مقام کے ادوار تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے ہیں جبکہ یودھیا قبائل سے پہلے کے بھی آثارِ پائے جاتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مقام پر آبادی کا سلسلہ عرصہ قدیم سے بدستور چلا آ رہا ہے۔ جس کے تانے بانے وادیٔ سندھ کی قدیم تہذیب سے ملتے ہیں۔ کیونکہ اُس وقت تک سکہ کا رواج نہیں تھا۔ سکہ چھٹی صدی ق م میں اُس وقت ہندوستان میں رائج ہوا جب مصری بادشاہ سائرس اعظم (فرعون مصر) ہندوستان پر حملہ آور ہوا تھا۔ یہ فن انہوں نے ہندوستانیوں کو دیا۔ دریا سندھ کی یہ وادی جو آج کل "تھل" کے نام سے مشہور ہے، مختلف خانہ بدوشوں کے قبضے میں رہی۔

پانچویں صدی قبل مسیح میں مغربی ہند یا صوبہ پر سلطنت ایران کا قبضہ معلوم ہوتا ہے جبکہ چھٹی صدی ق م تک مصری بادشاہ جس کے کئی نام سامنے آ چکے ہیں، جن میں سائرس اعظم، کورش اعظم اور راجہ سوفیٹس۔ جبکہ پانچویں صدی ق م میں ایرانی النسل قبائل وادیٔ سندھ کے زیریں علاقوں میں آباد تھے۔ چوتھی صدی ق م میں مقامی قبائل جن میں ایک سے زیادہ قومیں شامل تھی، جن میں سربراہ یودھیا قوم تھی، ان تمام اقوام پر مشتمل ایک مجلس شوریٰ تھی (جیوی سمگھا) تھی۔ ہم پہلے باب میں ان اقوام کا ذکر چکے ہیں۔ یودھیا دوسری جنگجو خانہ بدوش اقوام کو ساتھ ملا کر وادیٔ سندھ کی اس میدانی پٹی جو اُس وقت وہیکا ریاست کے نام سے مشہور تھی، قابض تھے اور سکندرِ اعظم کے حملے تک حکمران تھے لیکن مقدونی فوج کے نے حملے ان کو کمزور کر دیا۔

۳۲۶ ق م میں سکندر کی فوج جب دریا چناب اور جہلم کے سنگم پر پہنچی تو سکندر نے اپنی فوج کے جاسوسی کے افسران کو حکم دیا کہ وہ گردونواح کی اقوام کے متعلق معلومات حاصل کریں کیونکہ

سکندر کے سامنے اطلاعات کے مطابق بہت ساری اقوام جن مالوے (ملوی) آکسی، ڈرکائی، سبوئی، اگلیسوئی ایک خطرہ تھی، سکندر جسے دور کرنا چاہتا تھا۔سکندر کی فوج تریموں ہیڈ کے ۲۳ میل شمال میں کچھ دونوں کیلئے ٹھہری تو سکندر کو دو قوموں کے بارے میں بتایا گیا۔ان میں سبوی جو دریائے جہلم اور چناب کی زیریں علاقوں میں آباد تھی، جبکہ دوسری قوم اگلیسو ی قوم، یہ دریائے چناب کے مغربی خشک میدانی علاقے "تھل" میں بطور حکمران قابض تھے۔ ہندی بادشاہ چندر گپت موریہ نے برسرِ اقتدار آتے ہی ان کو بیدخل کردیا اور ان کے پاس ۴۰۰۰ پیادے اور ۳۰۰۰ گھڑسوار فوج موجود تھی۔ان کے علاقے پر سکندر نے حملہ کیا۔جس کی تفصیل ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ ہندوستان کی قدیمی تحریروں میں اس اگلیسوئی قوم کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ یہ نام صرف سکندر کے ساتھ سفر کرنے والے مورخین نے دیا ہے اور بعد میں اس نام کو مغربی مورخ ڈیوڈرس نے مشہور کیا ہے۔

اصل میں یہ یودھیا قبائل کے اتحادی اقوام تھی جس نے سکندر کی فوج کا مقابلہ کیا۔اس میں شک کی گنجائش نہیں کہ روڑاں کے مقام پر یونانی بادشاہ سکندر کی افواج نے حملہ کیا یا نہیں کیا؟ اس واقعہ سے متعلق دو اہم تاریخی حوالے موجود ہیں۔ایک یہ کہ سکندر نے تریموں کے مقام پر پڑاؤ کیا تو وہاں دو قوموں نے ان پر حملہ کردیا۔ بقول مورخ ایک سبوئی اور دوسری اگلیسوئی۔سبوئی قوم دریا کی زیریں وادی جس کو "تل" اور "بیٹ" جیسا کہ دریا سے وابستہ زمین جو تریموں کے جنوب اور شمال کا علاقہ جیسے آجکل کے جھنگ اور شورکوٹ یہ علاقے دریا کے زیریں حصہ میں آتے ہیں۔ان علاقوں پر قوم سبوئی آباد تھی جن کو مطیع کرلیا گیا جبکہ دوسری قوم اگلیسوئی جو دریا کے مغربی خشک اور میدانی علاقے (موجودہ تھل) پر آباد تھیں۔ان کا دارالسلطنت اندرون ملک دریائے چناب سے تقریباً چالیس میل مغرب میں واقعے تھا جہاں سکندر کی فوج نے حملہ کیا۔

ہم نے اس بات کا اندازہ لگانے کی کوشش کی ہے کہ کیا واقعی یونانی فوج نے وادئ سندھ کے اس علاقہ پر حملہ کیا یا نہیں؟۔اس بات کو ثابت کرنے کیلئے ہم نے تاریخی حوالہ جات کو آپ

کے سامنے رکھا ہے کہ کریٹراس جو سکندر کا اہم ترین جنرل تھا اور ایک بڑی فوج کی کمان کر رہا تھا کو دریا کے مغربی کنارے کی نگرانی پر مامور کیا گیا تھا۔ اب یہ بات ذہن میں رہے کہ خشک علاقہ اور ۳۰ میل ۴۵ کلومیٹر دریا چناب سے دور دوسرا یہ کہ اس علاقہ پر یونانی فوج کے اُس حصہ نے حملہ کیا جو دریا کے مغربی کنارے کی نگرانی پر تھی جس کی کمان کریٹراس کر رہا تھا۔ بُدھا پرکاش نے اپنی کتاب مہاراجا پورس میں تحریر کیا ہے کہ سکندر کی فوج پر مقامی قبائل نے حملہ کر دیا۔ جبکہ وی اے سمتھ نے اس واقعہ کو بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ وہ اپنی کتاب قدیم تاریخِ ہند میں (ایرین، انا باسس آف الیگزینڈر۔ باب ۶ فصل ۵، کریٹئس باب ۹ فصل ۴۔ ڈیوڈرس باب ۱۷ فصل ۹۶) ان مورخین کے بیانات کو پیش کرتا ہے۔ اس کا بیان ہے کہ کریٹراس کے کیمپ پر مقامی قبائل نے حملہ کیا۔ وہ نیم خانہ بدوش جاٹوں کا ایک اتحاد تھا جو اس علاقہ میں آباد تھے۔

سکندر کے بعد کا تھل

سکندر کی فوجوں کا ہندوستان سے واپس چلے جانے اور پھر جون ۳۲۳ ق م میں بابل کے مقام پر سکندر کی موت کے بعد تقریباً ہندوستان میں یونانیوں کا اثر زائل ہو گیا۔ شمال مغربی ہند کے وہ علاقے جن کو مقدونوی افواج نے روند ڈالا تھا، جنگ و جدل نے جو زخم دیے اور جس طرح آباد شہروں کو ویران کر دیا گیا، سرسبز و شاداب کھیتوں کو اجاڑ دیا گیا، ظلم و ستم کے بے رحمانہ استعمال اور کشت و خون کے کھیل کی وجہ سے ہندوستان میں جو تغیر و تبدل واقع ہوا، اس نے مستقل طور پر ہندوستانیوں کو سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔

یہی وہ سوچ تھی کہ سکندر کی واپسی اور موت کے صرف تین سال بعد مقامی قبائل نے مقدونوی صوبے داروں اور فوجیوں کو تباہ و برباد کر دیا۔ مقامی قبائل نے پھر سے اپنے آپ کو وسیع پیمانے پر منظم کرنا شروع کر دیا۔ تمام رکاوٹیں توڑ کر پہلے کی طرح اب علیحدگی کی زندگی بسر کرنے لگے۔ مختلف قبائل نے مغربی ہند کا سیاسی نظام اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش کی لیکن اس وقت ملک

عدم استحکام کا شکار ہورہا تھا۔اسی دوران ٹیکسلا سے ایک اُمید کی کرن دکھائی دی جس کا نام چندر گپت موریہ تھا۔اس کی ذہانت اور حکمت عملی نے ہندوستان کو ایک مرکزی سلطنت کے دھارے میں بند کر دیا۔مغربی ہند اور ریاست وہیکا کے قبائل نے ان کی اطاعت قبول کر لی۔اب شمالی مغربی ہندوستان جو پہلے کئی ایک ریاستوں میں بٹا ہوا تھا،ایک بادشاہت کے تحت متحد ہو گیا تھا۔ ریاست وہیکا موجودہ "تھل" جہاں سے چندر گپت نے اپنی سیاسی زندگی کی شروعات کی مقامی قبائل نے ان کا ساتھ دے کر کامیابی سے ہم کنار کیا۔دریائے سندھ اور جہلم کے درمیانی علاقوں میں سکندر نے اپنے جنرل فلپوس کو بطور نگران چھوڑا۔اس کے کچھ عرصہ بعد جب سکندر اور اس کی فوج ابھی کرمانیہ پہنچی تھی تو مقامی قبائل نے فلپوس کو قتل کر کے اس علاقے پر اپنی خودمختاری قائم کر لی۔یعنی ایک مرتبہ پھر یودھیا اتحاد نے اپنی ریاست وہیکا پر کنٹرول کرلیا۔اب چندر گپت موریہ جس نے اپنی فوج میں ایک بڑی تعداد جنگجوؤں کی بھرتی کرنے میں کامیاب ہو گیا جس کی وجہ سے چندر گپت نے پورے شمال مغربی ہندوستان پر ٹیکسلا تک قابض ہو گیا۔اس دوران روڑاں سائیڈ "اے" کا کچھ حصہ جو سکندر کے حملے کی وجہ سے تباہ ہو گیا تھا، دوبارہ آباد ہونا شروع ہو گیا۔ بے شمار مقدونویوں کی جگہ اب مقامی آبادی بھر گئی۔اجڑے ہوئے کھیت مقامی کاشتکاروں کی محنت سے ہرے بھرے ہو گئے۔یہاں پر آباد قوموں میں کچھ حد تک تبدیلی ضرور واقع ہوئی۔ چندر گپت موریہ کی مرکزی حکومت سے لے کر اشوک اعظم کے دور ۱۶۰ ق م تک اس علاقے تھل کی تاریخ خاموش نظر آتی ہے۔

بظاہر اس کی وجہ موریہ خاندان کی مرکزی حکومت تھی جس کی وجہ سے مقامی ریاستی نظام بالکل ختم ہو گیا تھا۔وادئ سندھ کے تمام قبائل نے چندر گپت کی اطاعت قبول کر لی لیکن یودھیا قبائل کے بارے میں جو اطلاعات ہمیں موصول ہوئیں کہ انہوں نے چندر گپت کی اطاعت قبول نہیں کی اور چندر گپت کی بڑھتی ہوئی طاقت سے خوفزدہ ہو کر وادئ سندھ سے نقل مکانی کر کے جنوب مشرق کی طرف چلے گئے۔ممکن ہے انہیں چندر گپت موریہ کے ساتھ ان کے حالات خراب

ہونے کی وجہ سے انہیں نقل مکانی کرنا پڑی۔ایک مرکزی حکومت کی وجہ سے وادیٔ سندھ کے اس میدانی علاقے "تھل" کی علیحدہ ریاستی حیثیت ختم ہوئی اور تقریباً ایک سو سال تک اس علاقہ تھل سے متعلق تاریخ خاموش نظر آتی ہے۔ پھر جب ۱۹۰ ق م میں یونانی بادشاہ یوتھی ڈیمس کا بیٹا اور انٹی اوکس اعظم یونانی کا داماد دیمیتر یئس، جس کو ہندویوں کا بادشاہ بھی کہا جاتا تھا جو اس وقت باختر حکمران تھا، نے شمالی ہند کے ایک بڑے حصہ پر قبضہ کرلیا۔اس کے قبضے میں کابل سے لے کر پنجاب اور وادیٔ سندھ کے علاقے "تھل" شامل تھے۔لیکن تھوڑے عرصہ بعد ۱۷۵ ق م میں دیمیتر یئس کی ہندی جنگی مہم کی وجہ سے باختر پر اس کا اثر کم ہوگیا تو ایک دوسرے یونانی سردار یوکریٹا ئیڈز نے سر اٹھایا اور بغاوت کرکے باختر کا مالک بن بیٹھا۔باختر پر مکمل قبضہ کرکے اس نے مشرقی صوبوں کا رخ کیا اور کابل سے ہوتا ہوا پشاور، ٹیکسلا اور مغربی پنجاب تک پہنچا تو وادیٔ سندھ کے اس میدانی علاقے "تھل" میں ان کا دشمن دیمیتر یئس موجود تھا یوکرے نے اس کو شکست دے کر اس علاقے پر قبضہ کرلیا۔

یوکرے ٹائیڈز کے بعد اپالوڈوٹس، جو کہا جاتا ہے کہ اس کا بیٹا تھا، اس علاقہ پر حکمران رہا جبکہ کچھ حد تک منندر جو یوکرے کی طرف سے پشاور کا حاکم تھا، بھی مغربی پنجاب پر قابض رہا۔ ساتھ ہی اپالوڈوٹس کا جانشین سوٹر مگس بھی ان علاقوں پر حکمران تھا۔

باختری بادشاہوں کی ان علاقوں پر سے گرفت کمزور ہوتے ہی ان کی جگہ اب پارتھی بادشاہوں کا سلسلہ شروع ہوگیا اور کئی پارتھی بادشاہوں نے اس علاقہ تھل اور مغربی پنجاب پر خود مختار یا ماتحت حکومت قائم کی۔ یہ بعد میں ہندی پارتھی بادشاہوں کے نام سے مشہور ہوئے۔اس علاقہ تھل سے متعلق پری پلس آف دی ایریتھریئن سی کے مصنف اپالووئنس جو تقریباً پہلی صدی عیسوی میں ہندوستان آیا، نے اس علاقہ کو سیتھیا کا نام دیا ہے اور اس کا بیان ہے کہ اس علاقہ پر پارتھی سردار قابض ہیں۔ممکن ہے کہ چھوٹی چھوٹی ریاستیں کچھ عرصہ تک ان علاقوں میں قائم رہی ہوں گی۔ یہاں تک کہ پہلی صدی عیسوی کے آخر میں ایک دوسری قوم یوچی کشان نے کابل اور

شمالی مغربی ہندوستان پر آہستہ آہستہ قبضہ کرلیا۔اس علاقے سیتھیا "تھل" پر واسودیو کشان کے دور تک پرتھی، جنگجو سردار قابض تھے لیکن آپس کی خانہ جنگی کی وجہ سے اپنی خودمختاری کی حیثیت کھو چکے تھے اور کشان بادشاہوں کے ماتحت کام کرتے تھے۔

تھل میں کشان دور

تقریباً ۷۰ ءعیسوی کی دہائی میں کنشک ہی وہ کشان بادشاہ تھا جس نے پشاور اور ٹیکسلا سے آگے جنوب کے ان تمام علاقوں پر قبضہ کرلیا جن میں دریائے سندھ کے مشرق کا وہ علاقہ تھل جو ریاست سیتھیا کے نام سے مشہور تھا، بھی شامل تھا۔ مزید آگے سات دریاؤں کے سنگم تک کا علاقہ شامل تھا جو کشان حکومت کے ماتحت آ گیا۔ علاقہ سیتھیا "تھل" ہندی پارتھی اور ہندی سیتھی سرداروں اور جنگجو جتھوں کے قبضہ میں تھا لیکن کشانوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کے سامنے ان کو بھی سرِ تسلیم خم کرنا پڑا۔ جہاں کنشک کے دور میں روڑاں کے مقام "اے" پر سے ہوشک کے کثیر تعداد میں سکے ملے ہیں کیونکہ کنشک کا درالسلطنت "پرشپور" موجودہ پشاور تھا۔ اندرونِ ملک بطور نائب ہوشک اور واشک مقرر تھے۔ یہ کنشک کے بیٹے تھے جو کنشک کی زندگی اور موت کے بعد کشان سلطنت کے مالک بنے رہے۔ یہ واسودیو کے دور تک حکمران رہے۔ ہم پہلے ان سے متعلق بیان کر چکے ہیں کہ تیسری اور چوتھی صدی عیسوی تک ان کشان بادشاہوں کے آثار ملتے ہیں لیکن چوتھی صدی عیسوی کے آخر میں واسودیو کشان جو کشان سلطنت کا مالک بنا، اس کے دور میں روڑاں "بی" جو مغربی ہے آباد ہوئی، جہاں صرف واسودیو کے سکے ملے ہیں یا پھر آخری کشان بادشاہ گرمبئس کے جو چوتھی صدی عیسوی کے آخر یا پانچویں صدی عیسوی کے اوئل میں حاکم تھا۔ اسی بادشاہ کے دور میں گورے ہنوں نے شمالی مغربی ہندوستان پر حملہ کیا اور ظلم کی انتہا کردی۔ پورے شہر کو جلا کر خاکستر کر دیا۔ شہر کے باشندوں کو قتل اور کچھ کو غلام بنا لیا۔ عورتوں بچوں سب کو قتل کر دیا۔ ان ظالم ہنوں نے اس حد طرح پورے شہر کو تباہ کر دیا، ہن حملہ آوروں نے ظلم کی وہ

داستان رقم کی کہ دوبارہ روڑاں کے اس مقام پر کئی سو سالوں تک آبادی ممکن نہ ہو سکی۔ اس بڑے شہر کی جگہ تھل میں چھوٹے چھوٹے قصبات نے لے لی۔ پانچویں صدی عیسوی کے آخر تک روڑاں کے مقام پر موجود آبادی اور شہر ویرانے میں تبدیل ہو گیا تھا۔ آخری کشان بادشاہ کے بعد تھل کی تاریخ بالکل خاموش ہے۔ جب ۷ صدی عیسوی سے مسلم حکمران امیر غزنوی، سبکتگین اور محمد بن قاسم کے حملوں کا سلسلہ شروع ہوا تو تھل سے متعلق کچھ حد تک تاریخی مواد موجود ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح تھل کئی ایک چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹا ہوا ہے۔

قدیم روڑاں کی جغرفیائی اہمیت

اگر ہم تھل کا محل وقوع اور جغرافیے کا اندازہ لگائیں یا نقشہ ذہن میں رکھ کر اردگرد کے علاقوں کی سمت دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس مقام پر جو شہر آباد تھا، اس کو باقاعدہ منصوبے کے تحت تعمیر کیا گیا کیونکہ چاروں طرف سے درمیان میں واقع تھا۔ مظفر گڑھ سے میانوالی تک موجودہ تھل کے بالکل وسط میں۔ اگر اس کی قدیم تاریخ پر نظر دوڑائیں تو مشرق میں تریموں ہیڈ قدیم نام غازی گھاٹ موجودہ غازی آباد دریائے جہلم اور مغرب میں دریائے سندھ اور قدیم شہر کروڑ جو پہلے کسی اور نام سے منسوب تھا سید ھالین میں اور عین درمیان میں ہے۔

تھل کے علاقوں میں اکثر شہر بہت بعد میں آباد ہوئے۔ جس طرح منکیرہ کو چھٹی اور ساتویں صدی عیسوی میں ایک راجہ نے آباد کیا تھا جبکہ لیہ کو بھی ایک "للہا" نام کے ہندو برہمن نے ساتویں صدی عیسوی میں آباد کیا تھا۔ کچھ مورخین کے مطابق منکیرہ اور بھکر ایک راجہ نے آباد کیے تھے اور روڑاں کے سیدھا مغرب میں واقع کروڑ شہر جس کی تاریخ بہت قدیم ہے، روڑاں سے تیس میل کے فاصلے پر واقعہ ہے۔

ہم نے چاروں طرف سے اس قدیم مقام کا جائزہ لیا ہے تو ہمارے اندازے کے مطابق روڑاں کے مقام پر آباد شہر چاروں طرف سے تھل اور وادیٔ سندھ کی اس میدانی پٹی میں بالکل

درمیان میں آتا ہے۔ ہم نے پورے اس علاقے کو قریب سے دیکھا تو اس تھل کے علاقے میں جتنی قدیم بستیوں کے آثار ملے ہیں، ان سب کا موازنہ کریں تو معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اس مقام پر آباد شہر پوری وادیٔ سندھ کو کنٹرول کرتا تھا اور ایک طرح سے ان تمام بستیوں کا رابطہ اور سیاسی اور سماجی لین دین اس شہر سے تھا۔ ہم نے اس مقام کا جو نقشہ پیش کیا ہے، اس سے آپ کو سب کچھ واضح ہو جائے گا کہ وادیٔ سندھ کے اس خطے میں قدیم روڑاں کو کیا تاریخی اہمیت حاصل تھی اور اس صحرائے تھل کی پٹی میں قدیم تاریخ کے کون سے راز دفن ہوئے پڑے ہیں۔

قدیم شہر "متگر"

یہ لفظ متگر اب تو ایک خواب بن چکا ہے لیکن ممکن ہے کہ کسی زمانے میں یہ نام ایک بارونق شہر اور کسی ریاست کا صدر مقام رہا ہو۔ نجانے اس نام کے شہر کی اُس وقت کیا سیاسی و اقتصادی حیثیت ہوگی؟ اس کی آبادی کتنے رقبہ پر پھیلی ہوئی تھی؟ آبادکاروں کا تعلق کون سے قبائل اور اقوام سے تھا؟ یہ شہر کس مقام پر آباد کیا گیا؟ اور اس کو صفحہء ہستی سے کیسے مٹایا گیا؟ یہ تمام سوالات ہمارے ذہن میں اٹک رہے ہیں اور بار بار سوچنے پر مجبور کر رہے ہیں۔

کیا آج سے پہلے کسی مورخ اور سیاح نے اس شہر متگر کا ذکر کیا ہے؟ کہیں واقعی یہ شہر قدیم روڑاں کے مقام پر تو آباد نہیں تھا؟ اس لیے ہم نے اس بات کو سمجھنے کوشش کی ہے اور اس شہر کا احاطہ کرنے کیلئے تھل کے اکثر علاقوں کا وزٹ کیا۔ پورے تھل کو توجہ سے دیکھا کہ یہ شہر کہاں اور کس مقام پر واقع تھا اسی لیے ہم جس نتیجے پر پہنچے اور جن نظریات اور دلائل کی روشنی میں متگر نام کے شہر کو روڑاں کے مقام پر ظاہر کیا وہ تمام تفصیلات تحریر کر رہا ہوں۔ آپ ملاحظہ فرمائیں۔

آگے بڑھنے سے پہلے ہم اس مورخ کا جس نے اس شہر کے متعلق تحریر کیا ہے، کے بیان کو ذرا تفصیل سے دیکھتے ہیں۔ مورخ اپالونیئس جس نے ۴۳ء میں ہندوستان کی سیاحت کی اور پارتھی بادشاہ برڈینس یا ورڈینس سے دو مرتبہ ملا، نے ایک کتاب پری پلس آف دی ایریتھرین سی

جوتقریباً ۸۰ عیسوی میں لکھی تھی، کاتعلق یونان سے تھا۔ ہندوستان میں کہاں سے داخل ہوا اور وہ ہندوستان میں کس مقام اور راستہ سے آیا؟ یہ تو حقیقت ہے کہ سیاح نے یونان سے مشرق کی طرف اپنا سفر شروع کیا اور ایران، باختر اور افغانستان سے ہوتا ہوا پشاور کے راستے ٹیکسلاء پہنچا۔ اکثر مغربی حملہ آوروں نے بھی اسی راستہ کو استعمال کیا۔ ٹیکسلا سے مزید جنوب کی طرف اپنا سفر شروع کیا۔ ٹیکسلا سے جنوب کے میدانی علاقوں وادئ سندھ "تھل" کے سفر کیلیئے سیاح کے سامنے دو راستے تھے۔ ایک دریائی راستہ جس کو سیاح بحری جہاز یا کشتی کے ذریعے طے کر سکتا تھا جبکہ دوسرا راستہ خشکی کا تھا جو پیدل یا گھوڑا سواری سے عبور کیا جا سکتا تھا۔ سیاح نے کون سا راستہ اختیار کیا؟ میرے خیال کے مطابق سیاح نے دریائی راستہ اختیار کیا ہوگا۔ اب مورخ اُس مقام پر پہنچا جس کا اس نے ذکر کیا ہے کہ دریائے سندھ کے کنارے ایک تجارتی بندرگاہ شہر جس کا نام مورخ نے بربریکان یا بریکان لکھا، کچھ عرصہ سیاح اس شہر میں رہا ہوگا۔ اس کے بعد اس نے مشرق کے میدانی علاقوں کا سفر کیا ہوگا۔ ممکن ہے کہ مورخ کو کسی مقامی گائیڈ کی ضرورت پیش آئی ہوگئی جو اس علاقے سے متعلق اس کی رہنمائی کر سکتا ہو۔ کچھ عرصہ اس شہر میں قیام کے بعد سیاح ضرور مقامی ریاست کے اندورنی علاقوں کی سیاحت کیلیئے بھی سفر کیا ہو گا جس کو ساح نے ریاست سیتھیا کا نام دیا ہے۔ ریاست کے اہم مقامات اور مقامی جنگجو سرداروں اور حکمران طبقہ سے بھی ملا ہوگا جس کا اس نے تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ مورخ نے وادئ سندھ اور موجودہ "تھل" کو ریاست سیتھیا کا نام دیا ہے۔ مزید مورخ بیان کرتا ہے کہ ریاست کا صدر مقام متگر نام کا ایک شہر ہے جو اندرونِ ملک آباد ہے۔ ہم نے مورخ کے بیانات کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔

نمبر ا: مورخ نے جس علاقے کو ریاست سیتھیا کا نام دیا ہے، کا بیان ہے کہ اس علاقہ کا ستر پجس کو صوبیدار بھی کہا جاتا تھا، ٹیکسلا کے بادشاہ کے ماتحت ہے۔

نمبر ۲: یہ علاقہ جو دریائے سندھ کا تکونی حصہ جو دریائے سندھ اور جہلم کا درمیانی خطہ "تھل" ریاست سیتھیا کے نام سے مشہور ہے۔

نمبر ۳: مورخ بیان کرتا ہے کہ اس علاقے میں ہندی پارتھی اور ہندی یونانی اقوام کے قبائل اور جنگجو گروپ آباد اور قابض ہیں جن کو ایک مقامی ستر پ یا سردار کنٹرول کرتا ہے لیکن یہ جنگجو قبائل اکثر آپس کی خانہ جنگی میں مصروف رہتے ہیں۔

نمبر ۴: مورخ نے اس علاقے میں دریائے سندھ کے ساتھ دہانوں، شاخوں کا ذکر کیا ہے جن میں ایک دریا بڑا ہے جو جہاز رانی کے قابل ہے۔ اسی دریا کے کنارے تجارتی بندرگاہ "بربریکاں" نام کا شہر آباد ہے اور اندرونِ ملک ریاستی دارالسلطنت منگر نام کا شہر آباد ہے۔

اب ہم مورخ کے بیان کو سمجھنے کی کوشش کریں اور اس کے بیان کو تفصیل سے دیکھیں۔ عقلی یا نقلی دلائل سے اپنے نظریے کو ثابت کرنے کیلئے ہم نے جو نظریات پیش کیے ہیں وہ بالکل ٹھیک نظر آتے ہیں۔ اس سے پہلے ہم کچھ اور یورپی مورخین کے بیانات کو لیتے ہیں جو میرے لیے قابلِ فخر اور قابلِ احترام ہیں لیکن ان کی بات کو سمجھنے میں اس لیے مشکل پیش آتی ہے کہ ان لوگوں نے ہزاروں سال بعد یہاں سے دور یورپ میں بیٹھ کر مضمون یا آرٹیکل پڑھ کر ایک نظریہ قائم کر دیا جس کی صحت کی کوئی ضمانت نہیں دی جا سکتی۔ ان یورپی مورخین کے قائم کردہ نظریات قدیم تاریخِ ہند کی حقیقت کو تبدیل نہیں کر سکتے۔ دیکھیں جس طرح وی اے سمتھ نے اپنی کتاب قدیم تاریخِ ہند باب ۱۰ صفحہ ۳۱۲ پر ایک یورپی مورخ ریورٹیکا بیان نقل کیا ہے کہ دریائے سندھ سے مراد صوبہ سندھ کا دریائے مہران ہے جبکہ اسی مورخ کا بیان ہے کہ پہلی صدی عیسوی کے اختتام تک مغربی پنجاب اور دوسرے بیان میں دریائے سندھ کے تکونی قطعے اور دریائے سندھ کی زیریں وادی پر ہندی پارتھی اور ہندی یونانی باختری قومیں آباد اور قابض ہیں جن کا تعلق باختری اور پارتھی حکمران حملہ آوروں سے ہے، جنہوں نے موریہ سلطنت کے خاتمے کے بعد مغربی پنجاب پر ایک مرتبہ پھر سے حملے شروع کر دے تھے۔ جبکہ ساتھ ہی ان تمام مورخین کا بیان ہے کہ دوسری صدی ق م کے وسط تک یونانی باختری بادشاہوں نے مغربی پنجاب دریائے سندھ اور جہلم کے

میدانی خطے اور شمالی ہندوستان کے کوہستانی علاقے ان کی سلطنت میں شامل ہیں۔ مزید ان مورخین کا بیان ہے کہ ریاست سیتھیا کی حد دریائے سندھ اور جہلم کے تکونی حصہ جہاں دریائے سندھ اور جہلم چناب کے سنگم تک سے شمال کا علاقہ، اب تو دریاؤں کا ملاپ مظفر گڑھ سے بھی جنوب میں واقع ہے لیکن ۲-۱ صدی ق م تک ان دریاؤں کا ملاپ مظفر گڑھ کے شمال میں خانپور بگا شیر کے پاس ہوگا، اس کے شمال کا تمام علاقہ تھل کے نام سے مشہور ہے جو ریاست سیتھیا میں شامل ہوگا کیونکہ ۱۹۰ قبل مسیح میں یونانی باختری بادشاہ دیمیستریئس نے کابل شمالی ہند اور مغربی پنجاب کے اکثر علاقوں پر قبضہ کرلیا اور ریاست سیتھیا تھل کے تمام علاقے ان کے پاس تھے۔

اس علاقے میں پارتھی بادشاہوں کی حکمرانی کا سلسلہ تقریباً پہلی صدی عیسوی تک رہا جس کے آخری بادشاہ فروٹیس، ایک دوسری روایت کے مطابق گنڈ وفریس اور اس کا بھائی ابدگس مغربی پنجاب پر قابض تھا، انھی میں سے کسی ایک سے یونانی سیاح اپالونیس کی ملاقات ہوئی ہوگی۔ اسی بات کا جائزہ لینے کیلئے کہ متگر شہر کس مقام پر آباد تھا، ہم نے سیاح کے بیانات اور علاقے کی حد بندی کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ بقول سیاح قدیم متگر شہر واقع روڑاں کے مقام پر آباد تھا یا کہیں اور جگہ، اس مقصد کیلئے ہم نے پورے تھل کا بہت ہی قریب سے مشاہدہ کیا اور ہر اُس مقام پر گئے جہاں ہمیں کسی بھی قدیم بستی کے آثار اور کھنڈرات نظر آئے۔ اس بات کو سمجھنے کیلئے ہم دریائے سندھ اور جہلم کے درمیانی علاقہ تھل میں بہت کوشش سے کام کیا۔ میری معاونت میں جناب محمد حسن صاحب ڈائریکٹر انچارج ہڑپہ میوزیم اور زبیر شفیع غوری صاحب جنہوں نے اس علاقہ تھل پر ایک کتاب "تھل آف دی سندھ ساگر" THAL OF THE SINDH SAGAR لکھی ہے جس میں انہوں نے ۲۲۶ قدیم بستیوں کے نام دیے ہیں۔ ان کے علاوہ حبیب اللہ ساہو صاحب اسسٹنٹ ڈائریکٹر ملتان نے بھی اپنی کوششوں سے مجھے نوازا۔ ان سب کی تحقیق اور نظریات کے مطابق پورے تھل میں روڑاں سے بڑی بستی ہم نے نہیں دیکھی جبکہ حبیب اللہ ساہو کا تو بیان یہ تھا کہ ہم نے سکردو سے لے کر سمندر تک کے علاقوں کا وزٹ کیا لیکن ہم نے اس روڑاں جیسی اتنی

بڑی بستی نہیں دیکھی۔ خود راقم الحروف نے بھی ان تمام قدیم بستیوں کا وزٹ کیا۔ بلا شبہ ہم نے اتنی بڑی بستی نہیں دیکھی۔ تمام چھوٹی چھوٹی بستیاں معلوم ہوتی ہیں جبکہ روڑاں کے مقام پر پائے جانے والے کھنڈرات تقریباً ۳-۴ کلو میٹر تک پھیلے ہوئے ہیں جو اس بات کی واضح نشاندہی کرتے ہیں کہ واقعی قدیم شہر متگر اسی مقام یعنی روڑاں پر ہی موجود تھا۔ روڑاں کے کھنڈرات سے ملنے والے آثارِ قدیمہ سے میرے ان نظریات کو تقویت ملتی ہے کہ اس مقام پر جو آبادی قائم تھی اسے علاقے یا ریاست میں اہم اور مرکزی حیثیت حاصل ہوگی۔ اس مقام کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگا سکتے کہ روڑاں کے کھنڈرات سے ہزاروں کی تعداد میں سکے ملے ہیں۔ شاید پورے مغربی ہندوستان میں کوئی ایسا مقام نہیں ہوگا جہاں اتنی زیادہ تعداد میں سکے ملے ہوں۔ صرف راقم الحروف کو ۳ / ۴ ہزار کے قریب سکے ملے ہیں جو مختلف بادشاہوں کے ہیں۔ جبکہ ان کھنڈرات کو آج سے عرصہ ۱۵۰ سال قبل یعنی ۱۸ ویں صدی عیسوی کے اواخر میں پلین کر دیا گیا اور اس مقام پر نئی آبادی قائم ہوگئی۔ اگر مجھے اتنی تعداد میں سکے ملے ہیں تو اُس وقت کتنی تعداد میں سکے ملے ہو گے، اس کا محض اندازہ ہی لگایا جا سکتا ہے۔ ہم نے پوری ذمہ داری سے عقلی اور نقلی دلائل سے کوشش کی ہے کہ قدیم روڑاں کے کھنڈرات کی جگہ پر ضرور کوئی شہر موجود تھا جو کسی نہ کسی نام سے منسوب ہوگا۔ بدقسمتی سے پانچویں صدی عیسوی کے بعد سے اکثر تھل ویرانے کی سی صورت اختیار کر گیا۔ اس لیے جب چینی سیاح فاہیان نے ہندوستان کا سفر کیا، اس کے بیان کے مطابق، اس نے بھکر سے دریائے سندھ کو پار کرنے کی صورت میں چینی سیاح کو ویران صحرا سے گزرنا پڑا۔ سیاح کا بیان ہے کہ دریائے سندھ کے مشرق میں ریگزار اور وسیع کلر زدہ صحرا سے گزر کر وسطی ہند میں جانا پڑا۔ مزید ان کا بیان ہے کہ دریائے سندھ پار کرنے کے بعد ریت کے دریا سے گزرنا پڑتا ہے۔ ہندوستان کی قدیم تاریخ کی بنیاد یا تو مغربی اور یورپی سیاحوں اور مورخین نے رکھی یا پھر ۱۸ ویں صدی عیسوی میں برطانیہ نے جب برصغیر پر قبضہ کیا تو انہوں نے ہندوستان کی قدیم تاریخ پر کام کرنے کی غرض سے آثارِ قدیمہ نام کا ایک محکمہ بنایا اور برطانوی افسران نے

ہندوستان کی قدیم پر کچھ حد تک کام کیا لیکن بہت سارے علاقے جو ان نظر سے پوشیدہ رہے جن میں خاص کر تھل کا پورہ خطہ جہاں انگریزوں نے قدم نہیں رکھا۔ اسی لیے تھل کا علاقہ ہندوستان کی قدیم تاریخ سے غائب ہے۔ میں نے کتنی کوشش سے نظریات آپ کے سامنے پیش کیے ہیں کہ منگر نام کا شہر روڑاں کے مقام پر آباد تھا اور دریائے سندھ، جہلم کے تکونی خطہ پر سیتھیا نام کی ریاست قائم تھی، میں اپنے اس نظریے کو سچ ثابت کرنے میں حق منجانب ہوں۔

ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ چوتھی اور پانچوی صدی عیسوی تک علاقہ تھل ریاست سیتھیا کے نام سے منسوب تھا اور اس علاقہ میں مختلف قبائل آباد تھے جن کا ذکر آگے آئے گا لیکن پانچویں صدی عیسوی کے آخر میں اس شہر کو تباہ و برباد کر دیا گیا۔ اب اس شہر کی جگہ کھنڈرات اور ٹوٹے ہوئے مٹی کے برتنوں کے ٹکڑے ملتے ہیں جو اپنی ماضی کی یادیں اپنے سینے میں لیے درد بھری آہوں سے ہر آنے والے کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ مجھے اس مقام پر میاں میرؒ کی ایک نظم یاد آتی ہے، اُس کا ترجمہ کچھ اس طرح سے ہے کہ میاں صاحب ایک ویران جنگل سے گزر رہے تھے کہ ان کا پاؤں ایک بوسیدہ انسانی کھوپڑی سے ٹکرایا تو میاں نے عالمِ تصورات میں اس کھوپڑی سے سوال کیا کہ تم کس انسان کی کھوپڑی ہو اور تمہاری داستان کیا ہے؟ کھوپڑی نے جواب دیا جو دل ہلا دینے والے الفاظ ہیں کہ میں بھی آپ کی طرح ایک زندہ انسان تھا اور صاحبِ طاقت بھی تھا، علاقے کی سرداری اور حکمرانی میرے ہاتھ میں تھی، عوام میرے حکم کی اطاعت گزاری کیلئے میرے دروازے پر جمع ہوتے تھے لیکن افسوس کہ میں ہلاک ہو گیا یا ہلاک کر دیا گیا۔ میرے جسم کا گوشت حشرات الارض نے کھا لیا اور میری ہڈیاں زمین میں گل سڑ رہی ہیں۔ ہر راہ گزار میری طرف حیرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور یہی سوال کرتا ہے۔

اگر میں، راقم الحروف، یہ کہہ دوں کہ میاں میرؒ انہی روڑاں کے کھنڈرات سے گزرے تھے تو آپ مانیں گے؟ ممکن نہیں، لیکن حالات کچھ اس مقام پر بھی ایسے ہیں۔ میاں میرؒ کی نظم خیالی تھی۔ انہوں نے عالمِ تصورات میں یہ نظم لکھی ہو گی لیکن میرا اس مقام سے متعلق نظریہ حقیقی ہے کہ

متگر نام کا شہر روڑاں کے مقام پر آباد تھا اور یہ علاقہ تھل سیتھیا نام کی ریاست تھی۔ یاد رہے کہ ہزاروں سال پہلے کے واقعات سے متعلق کوئی نظریہ چاہے ہم جیسا کوئی نااہل شخص کا ہو یا کسی یورپی مورخ کا، ایک خیالی خاکہ ہے جس کو مصنف ایک تصویری شکل میں ڈھال کر ایک ثبوت کے طور پر پیش کرتا ہے جو حقیقت سے کسی حد تک قریب تو ہوتا ہے لیکن اس پر سو فیصد بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہی حال ہندوستانی قدیم تاریخ کا ہے جس کو صرف یورپی مورخین نے سائنسی ٹیکنالوجی کے ذریعے ایجاد کیا اور یہی قدیم ہندوستانی تاریخ کا راز ہے جس پر ہمیں مجبوراً بھروسہ کرنا پڑتا۔

ریاست سیتھیا کے قدیم آباد قومیں

ریاست سیتھیا کا دارالسلطنت متگر شہر جو روڑاں کے مقام پر آباد تھا، کے آباد کاروں کا تعلق کس قوم اور نسل سے تھا؟ اور یہ لوگ کس تہذیب وثقافت اور فن مذہب سے تعلق رکھتے تھے؟ یہ بات کافی مرتبہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ قدیم پاک و ہند کی آبادی ہمیشہ کثیر النسل اقوام پر مشتمل رہی۔ ۲ ہزار سال قبل مسیح آریہ کی آمد سے لے کر ۱۸ ویں صدی عیسوی برٹش اور فرانسیسی اقوام کی آمد تک کے درمیانی عرصہ میں کئی حملہ آور قومیں ہندوستان میں داخل ہوئیں اور پہلے سے آباد قبائل میں رچ بس گئیں۔ جس سے نسل و مذہب میں ایک بہت بڑا کراس پیدا ہو گیا۔ اسی طرح تھل کے قدیم علاقہ میں بھی آباد شہریوں کا تعلق ایک سے زائد قبائل سے تھا جس میں ہندی، یونانی، باختری، پارتھی اور ایرانی لوگ شامل تھے۔ موجودہ تھل کے علاقہ قدیم ریاست سیتھیا جس کا دارالسلطنت متگر نام کا شہر تھا، میں تین قسم کے لوگ یا گروپ آباد تھے۔ یہ علاقہ ان کے قبضہ میں تھا۔ ایک گروپ مقامی قبائل پر مشتمل تھا جن میں یونانی لوگ بھی شامل تھے (ہندی یونانی گروپ) جبکہ دوسرا گروپ باختری یونانی اور تیسرا پارتھی ایرانی گروپ تھے۔ یہ تمام قبائل آپس کی خانہ جنگی میں مصروف رہتے تھے۔ انہی گروہوں سے متعلق یونانی سیاح نے بیان کیا ہے کہ ریاست سیتھیا کے مختلف جنگجو قبائل جو آپس کی خانہ جنگی میں مصروف ہیں، تمام چھوٹے چھوٹے

راجواڑوں اور علاقوں پر قابض تھے۔ان کے علاوہ ایک اور چوتھا گروپ جو حاکمیتِ اعلیٰ کا دعویدار تھا، وہ کشان تھا۔کشان جو پہلی صدی عیسوی کے اختتام تک پشاور، ٹیکسلا، مغربی ہند اور پنجاب تا وادیٔ سندھ کے علاقہ موجودہ تھل پر بطور حاکم اعلیٰ قابض ہو چکے تھے۔ان چاروں گروپوں میں مختلف قوم کے لوگ شامل ہوں گے جیسا کہ کشان۔ یہ یوچی قبائل کی ایک شاخ تھی۔ یوچی ایک کثیر النسل قومی قبائل تھا۔

اسی طرح یونانیوں میں بھی بہت سارے قبیلے اور قوموں کے لوگ شامل تھے جو ہندی یونانی (ہندی سیتھی گروپ) مشہور تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جو چھٹی صدی ق م میں سائرس اعظم کے ہمراہ ہندوستان میں داخل ہوئے تھے اور ہندوستان میں رچ بس کر ہندی یونانی مشہور ہوئے۔ یہ گروپ دریائے سندھ کی وادی میں کافی حد تک طاقتور تھا اور اپنے آپ کو مقامی ہندوستانی سماج میں ڈھال چکا تھا اور علاقے میں کافی با اثر بھی تھا۔ یہی گروپ اپنے آپ کو اس ریاست سیتھیا کا اصل حقدار سمجھتا تھا اور اس گروپ کے لوگ اکثر باختری اور پارتھی قبائل سے اپنے علاقے کی خاطر جنگ کرتے رہتے تھے۔ان میں مصر، بابل اور یونان کے وہ قبائل شامل تھے جو چھٹی صدی ق م سے لیکر پہلی صدی ق م تک مغربی ہندوستان پر حملہ آور ہوتے رہے۔ یونانی سیتھی لوگوں کے علاوہ باختری اور پارتھی قبائل بھی کافی حد تک دریائے سندھ کے مشرقی میدانوں میں وارد ہو چکے تھے اور انہوں نے وادی کے کچھ حصوں پر قبضہ کر رکھا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ تمام قبائل ریاست سیتھیا کے علاقوں پر مقامی طور پر بطور حکمران تھے۔ ہر طبقہ اپنے اپنے علاقے پر کبھی خودمختیار تو کبھی اطاعت گزار کے طور پر حکومت کرتا تھا۔کبھی یہ قبائل ٹیکسلا کی مرکزی حکومت کی اطاعت کو قبول کر لیتے تھے اور جب موقع ملتا، خودمختیاری اعلان کر دیتے تھے۔ یہ تمام قبائل وادیٔ سندھ کی اس میدانی پٹی "تھل" میں اپنے اپنے ستر پ کے حکمران تھے اور ہر سردار اپنے نام کا مقامی طور پر سکہ بھی جاری کرتا تھا۔ان سرداروں کے سکے کافی تعداد میں روڑاں کے مقام سے ملے ہیں جو مختلف نام اور نشان کے ساتھ بنائے جاتے تھے۔

مذہب:

قبل از اسلام ہندوستان میں سب سے زیادہ پرچار ہونے والا مذہب ہندومت تھا۔اس مذہب کے لفظی معنی ہیں کہ ہندوسماج جبکہ عرفِ عام میں اس مذہب کو بت پرست یا بت پرستوں کا مذہب کہا جا سکتا ہے۔ ہندو مذہب قبل از اسلام ہندوستان کا اکثریتی مذہب تھا۔جس طرح ہندوستانیوں کا خاندانی سماجی اورقبائلی تعلق مغربی علاقوں،مصر، یونان،ایران اوروسطی ایشیا سے تھا اسی طرح یہ بت پرستی کا مذہب بھی انہی مغربی آقاؤں کی اطاعت گزاری کے صلے میں آیا۔ کیونکہ بت پرستی اور فرضی خداؤں کی پوجا سب سے پہلے مصراور بابل کے بت پرست بادشاہوں نے شروع کرائی تھی جیسا کہ حضرت موسیٰؑ کے زمانے میں مصر کے بادشاہ فرعونِ مصر (سائرس اعظم) جس نے خودکو زمینی خدا کے طور پر پیش کیااورلوگوں کواپنی پوجا کرنے کا حکم دیا۔یہی بادشاہ چھٹی صدی قبل مسیح میں ہندوستان پرحملہ آور ہوااور پوری ایک صدی تک اس نے ہندوستان پر حکومت کی۔اسی بادشاہ نے ہندوستان کو معاشی ،سماجی ،تہذیبی اورمذہبی تعلیم سے روشناس کرایا۔اپنی پوجا اور بت پرستی کی بھی تعلیم اسی بادشاہ نے دی۔اس بادشاہ نے ہندوستانیوں کواس طرح متاثر کیا کہ وہ انہیں اپنا فرمانروا سمجھنے لگے اور بطور دیوتا اس کی پوجا کرنے لگے۔اس بادشاہ کے بعد ایک یونانی النسل بادشاہ دیمیتریئس، ہندیوں کا بادشاہ، تقریباً ۱۹۰ ق م میں ہندوستان آیا۔وہ شام کے بدمعاش بادشاہ انٹی اوکس،جس نے تھیوس یعنی" خدا" کا لقب اختیارکیا،کا داماد تھا۔اس نے بھی ہندوستان میں بت پرستی کی تعلیم دی۔ ہندو مذہب کی بنیاد ہی بت پرستی پر استوار ہے۔اس سے پہلے آریہ جن کو ہندوستان کی سماجی اور مذہبی زندگی کے ارتقا میں بنیادی حثیت حاصل ہے، بھی بت پرست تھے اور وہ اپنے بادشاہ کی پرستش کرتے تھے۔اس کا نام اندر یعنی آگ اور پانی کا دیوتا ہے۔لیکن اس کے علاوہ ہندوستان کی قدیم مذہبی تحریروں میں ایک نام "ارم" کا ملتا ہے جس کو ہندوستان کی اکثریت اپنا رہبر سمجھتی ہے اوررام کو ماننے والے ہندوستان میں کثرت سے پائے جاتے ہیں۔وادئ سندھ کے میدانی علاقے "تھل" روڑاں کے اکثر کھنڈرات سے پائے جانے

والے آثارِ قدیمہ کے نمونے جن میں خاص کر دیوی اور دیوتا کی مورتیاں ملی ہیں، ان سب کا تعلق ہندو مذہب سے ہے۔شمالی ہند کے علاوہ وسطی ہند، پنجاب اور ریاست سیتھیا کے اکثر علاقوں میں ہندو مذہب نمایاں تھا۔ ان علاقوں سے ملنے والی تمام تر مورتیوں کا تعلق ہندو مذہب سے ظاہر ہوتا ہے۔ان مورتیوں میں آردخشو، آرتھوشو دیوی، لکشمی دیوی اور وشنو دیوتا شامل ہیں۔

جین مت:

یہ مذہب دوسری اور تیسری صدی ق م کے دوران وسطی ہندوستان میں کچھ عرصہ کیلئے آیا لیکن مذہب جین مت ہندوستان میں کوئی خاص مقام حاصل نہ کر سکا۔جین مذہب کو ماننے والوں کی تعداد بہت کم تھی اور اس مذہب کے بارے میں کوئی زیادہ تفصیل بھی بہم نہیں۔

بدھ مت:

اس کے علاوہ ۳۲۰/۲۱ قبل مسیح چندر گپت موریہ سے لے کر اشوک اعظم تک مغربی اور شمالی ہندوستان کا تیزی سے پھلنے پھولنے والا سرکاری مذہب بدھ مت تھا۔ میں نے اس کو سرکاری مذہب اس لیے کہا ہے کہ موریہ بادشاہ اشوک نے کلنگ کی جنگ کے بعد جس میں لاکھوں افراد قتل ہوئے تھے، اپنی پوری توجہ صرف اور صرف بدھ مذہب کی تبلیغ پر مرکوز کر دی تھی۔ ساتھ ہی اس نے اپنی فوج کو ملکی حفاظت کے ساتھ ساتھ بدھ کی تعلیم اور تبلیغ کی ذمہ داری سونپ دی اور اس سے آگے بڑھ کر خود شہزادوں کو بھی اس بات کا پابند کر دیا کہ وہ اپنے آپ کو بدھ مذہب سے وابستہ کر لیں۔ ایسا ہی ہوا جس سے تمام شمالی ہند سے لے کر چین تک بدھ مذہب کی شہرت پائی جاتی تھی۔ ہندوستان میں ٹیکسلا اس کا مرکز تھا جہاں بدھ مذہب کی ایک بہت بڑی درسگاہ اور یونیورسٹی قائم کی گئی تھی۔ یہاں پورے ہندوستان سے لوگ بدھ مت کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔

روایت:

اس روایت کے مطابق پہلی صدی عیسوی کے اوائل میں عیسائیت کے اشارے بھی ملتے ہیں۔عیسائی مذہب کے متعلق روایت کچھ یوں ہے کہ یونانی النسل ہندی بادشاہ گنڈوفریس نے

ایبک ہبان نامی ہندی سوداگر کو کہا کہ ایک ہوشیار اور کاریگر صناع کو لے آئے جو بادشاہ کے لائق محل تیار کر دیے۔ اس طولانی روایت کا خلاصہ کچھ یوں بیان کیا جاتا ہے جو سینٹ ٹامس کی کتاب جو شامی زبان میں تحریر ہے کہ جب حضرت عیسیٰؑ کے بارہ پیر کاروں نے عیسائیت کی تبلیغ کیلئے قرعہ اندازی سے پوری دنیا کو آپس میں تقسیم کیا تو ہندوستان کا ملک معروف بہ ٹامس کے حصہ میں آیا لیکن اس نے اس کام کیلئے ہندوستان کا سفر اختیار نہ کیا۔ مشرقی سفر سے واپسی پر ٹامس حواری کی دل برداشتہ خاطری دور کرنے کیلئے خود حضرت عیسیٰؑ سوداگر کو خواب میں ملے اور دوسرے حواریوں نے ٹامس کو بیس چاندی کے سکوں کے بدلے سوداگر کے ہاتھ بیچ ڈالا۔ اپنے مولا کے حکم کے مطابق سینٹ ٹامس سوداگر کے ہمراہ کشتی میں بیٹھ کر روانہ ہو گیا اور سفر کے دوران اپنے ساتھی ہبان کو یقین دلایا کہ وہ فنِ تعمیر اور لکڑی اور پتھر کے ہر قسم کے کام کا ماہر ہے اور پوری طرح واقف ہے۔ آخر کار وہ ہندوستان کے بادشاہ گنڈوفریس کے دربار میں پہنچا۔ ٹامس نے بادشاہ سے وعدہ کیا کہ وہ چھ ماہ کے عرصہ میں آپ کیلئے محل تیار کر دے گا لیکن جو رقم اس کو کام کی انجام دہی کیلئے دی گئی، اس نے تمام کی تمام خیرات کر دی۔ جب اس سے اس رقم کا حساب مانگا گیا تو اس نے کہا کہ میں تمہارے لیے بہشت میں محل تیار کروا رہا ہوں جو انسان کے ہاتھ سے تعمیر نہیں ہو سکتا۔

اس کے بعد ٹامس نے اس قدر جوش و خروش سے اپنے مذہب کی تبلیغ کی کہ خود بادشاہ، اس کا بھائی گڈا اور عوام جوق در جوق دینِ عیسائیت میں داخل ہو گئے۔ وی اے سمتھ نے اس روایت کے بارے میں اپنی کتاب قدیم تاریخِ ہند کے صفحہ ۲۸۹ / ۹۰ تحریر کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ تمام حکایت فرضی اور مصنوعی قصہ خیالی ہے۔ وی اے سمتھ مزید اس روایت کے متعلق لکھتے ہیں کہ یہ ہندوستانی مورخ کیلئے اتنی دلچسپی ہے کہ ایک یونانی ہندی بادشاہ گنڈوفریس نے اپنی موت سے قبل اپنا تعلق پاک رسول نبی سے جوڑ کر توحید پرستی کی ہوگی۔

زبانیں:

قدیم ہندوستان کثرت اقوام کی ساتھ ساتھ کثیر زبانوں کا بھی مرکز رہا ہے۔ ان زبانوں

میں سب سے قدیم زبان داوڑی، تلگو، سنسکرت، پالی، پراکرت، نگاری، بروہمی، خروشتی، گریک وغیرہ شامل ہیں۔ یہ سب زبانیں قدیم دور میں ہندوستان کے طول وعرض میں بولی جاتی تھیں۔ ان میں سب سے قدیم زبان دراوڑی ہے۔ یہ زبان وادیٔ سندھ کے اُن قدیم لوگوں میں بولی جاتی تھی جنہوں نے وادیٔ سندھ میں سماجی زندگی کی ابتدا کی۔ یہ تقریباً ۸ /۶ ہزار سال قبل سے لے کر ۲۰۰۰ سال ق م تک مقامی قبائل، جن کو دراوڑ کہا گیا ہے، استعمال کرتے تھے۔ ۲ ہزار سال ق م سے ایک اور قوم جو آریہ کے نام سے مشہور ہے، نے سنسکرت اور پراکرت، پالی اور نگاری زبانیں متعارف کروائیں اور تقریباً ایک عرصہ تک ہندوستان میں انہی زبانوں کا راج رہا۔ ہندوستان کے طول وعرض میں یہ زبانیں بولی جاتی تھی۔ سنسکرت آریہ سماج کی ایک طرح سے سرکاری زبان تھی جبکہ باقی تینوں زبانیں پالی، پراکرت، نگاری مختلف علاقوں میں ۵ /۶ ق م تک وسطی اور مغربی ہندوستان میں بولی جاتی تھیں۔ جس طرح آج کل سندھی، پنجابی اور بلوچی وغیرہ زبانیں بولی جاتی ہیں۔ سندھ کی اس وادی "تھل" کے اکثر علاقے مغربی پنجاب میں زیادہ تر نگاری زبان بولی جاتی تھی جبکہ سنسکرت ایک مرکزی اور سرکاری زبان ہونے کے ساتھ ساتھ گرائمر کی بھی حامل تھی۔ آریہ دور کی تمام تر تحریریں سنسکرت میں ہیں۔ سنسکرت کے مشہور مصنف پاننی یا پنی نے چاروں وید، رگ وید، یجر وید، اتھرو وید اور سام وید تحریر کیے۔ سنسکرت زبان کو ہندوستان میں کافی حد تک شہرت ملی جبکہ پالی اور پراکرت زبان سنسکرت کی ہی کوکھ سے پیدا ہوئیں۔ براہمی، خروشتی، نگاری وغیرہ زبانیں یونانی، فارسی اور چینی زبانوں کا خلاصہ ہیں اور ان حملہ آوروں کی آمد کے ساتھ ہی ہندوستان کے مختلف علاقوں میں رائج ہوئیں۔ ان مغربی بادشاہوں کی آمد سے مغربی ہند کے اکثر علاقوں میں یہ زبان بولی جاتی تھیں جس طرح یونانی باختری بادشاہ یوکرے ٹائیڈز، اپالوڈوٹس، سوٹرمیگس اور میوس وغیرہ کے تمام سکوں پر ایک طرف گریک اور دوسری طرف خروشتی رسم خط پایا گیا ہے۔ براہمی مقامی بادشاہوں کا رسمِ خط تھا۔ جس طرح یودھیا قبائل کے سکوں پر خروشتی زبان پائی گئی ہے۔ لیکن کچھ مقامی اور کشان بادشاہوں کے دور میں خروشتی کے ساتھ نگاری اور براہمی رسم

خط بھی پایا گیا ہے لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ گریک رسم الخط دوسری صدی ق م کے بعد سے اس علاقے کی سرکاری زبان بن چکی تھی کیونکہ ہم نے دیکھا کہ یونانی باختری بادشاہوں سے لے کر آخری کشان بادشاہ تک تمام کے سکوں کی ایک ایک طرف پر خروشتی/ براہمی یا نگاری ہے تو دوسری طرف گریک زبان تحریر ہے۔ اسی طرح روڑاں کے مقام سے ملنے والے تمام تر سکوں کے ایک رخ پر اگر گریک ہے تو دوسرے رخ پر زیادہ تر خروشتی زبان تحریر ہے۔ براہمی اور نگاری زبان اس علاقہ میں بہت کم حد تک استعمال ہوتی تھی۔ واسو دیو کشان کے سکوں پر گریک کے ساتھ براہمی تحریر بھی موجود ہے۔ اس کے بعد آنے والے آخری کشان بادشاہ کے دور میں جب دریائے جہلم کے دوسری جانب گپت خاندان برسرِ اقتدار تھا تو گریک کے ساتھ براہمی اور نگاری زبان بھی استعمال ہوتی رہی لیکن ان سب زبانوں کے ساتھ ساتھ گریک زبان کا استعمال لازمی رہا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ۸ سو سالہ دور یعنی دوسری صدی قبل مسیح سے لے کر پانچویں صدی عیسوی تک گریک زبان کو اس علاقہ میں ایک مرکزی سرکاری حیثیت حاصل تھی جبکہ پانچویں صدی عیسوی کے بعد ہندوستان کے مختلف علاقوں ہندی، پنجابی اور سرائیکی زبانیں رائج ہوئیں۔ یہ زبانیں اب بھی ہندوستان اور پاکستان میں بولی جاتی ہیں۔ ہندی، سرائیکی اور پنجابی زبانیں پالی اور پراکرت کی دوسری شکل ہیں۔ یہ مقامی زبانیں پالی اور پراکرت کے ملاپ سے وجود میں آئیں۔ ہندی سرائیکی اور پنجابی زبانیں پالی پراکرت اور تلگو زبانوں کا جز ہیں۔ خروشتی اور براہمی زبان غیر ملکی حملہ آوروں کے ساتھ آئی۔ خروشتی زبان کو زیادہ تر کشان استعمال کرتے تھے اور براہمی کو یونانی اور باختری بادشاہوں کے سکوں پر پایا گیا ہے۔

ذریعہ معاش:

قدیم ہندوستانی لوگوں کا ذریعہء معاش مویشی پالنا اور کھیتی باڑی کرنا تھا۔ سب سے پہلے وادیٔ سندھ کے قدیم آبادکاروں نے اپنی روزی روٹی کا ذریعہ مویشی پالنے سے کیا لیکن کچھ عرصہ بعد میں کسی حد تک کھیتی باڑی بھی شروع کر دی تھی لیکن سب سے پہلے انہوں نے مال مویشی کو پالتو

کرنے کا طریقہ اپنایا۔ ان قدیم آباد کاروں کا گزارا انہی جنگلی جانوروں پر ہوتا تھا۔ ان جانوروں میں اونٹ، گائے، بھینس، بکری اور گھوڑا وغیرہ شامل ہیں۔ ان میں اہم ترین جانور گھوڑا، اونٹ اور بیل وغیرہ تھے۔ ان تینوں جانوروں سے وہ لوگ دو تین کام لیتے تھے۔ ایک تو کاشتکاری، دوسرا مال برداری اور سواری جبکہ اونٹ اور گھوڑا لوگوں کی خاص سواری کیلئے بھی استعمال ہوتا تھا۔ قدیم ہندوستانی قبائل مال برداری اور سواری وغیرہ کیلئے گھوڑے، اونٹ اور خچر استعمال کرتے تھے جبکہ دودھ اور گوشت کی ضروریات کو پورا کرنے کیلئے گائے، بھینس، بھیڑ، بکری وغیرہ رکھتے تھے۔ یہ چھوٹے جانور جن میں بکری شامل تھی، تھل کے اکثر علاقوں میں بہت زیادہ تعداد میں پائے جاتے تھے۔ ریوڑ کے ریوڑ لوگوں نے پال رکھے تھے۔ ان چھوٹے جانوروں کو سماج میں بنیادی حیثیت حاصل تھی۔ اونٹ اور بھیڑ بکری علاقہ تھل کے مشہور جانور تھے اور ۱۹ ویں صدی عیسوی تک تھل لوگوں کا زیادہ تر گزارا اوقات انہی جانورں کو پالنے سے ہوتا رہا ہے۔ اگر ہم وادیٔ سندھ کی قدیم تہذیب اور تاریخ پر نظر ڈالیں کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ وادیٔ سندھ کے قدیم قبائل کا ذریعہ معاش صرف کھیتی باڑی یا مال مویشی پالنا نہیں تھا بلکہ وہ لوگ بہت جلدی تہذیب سے واقف ہو چکے تھے جس کا وہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ کس طرح ریاست مالوہ کے تجارتی جہاز جزیرہ نما عرب کی ریاست آ گیڈ کی بندرگاہ اُر، لاگاش اور ناشا میں آ کر رکتے تھے تو اس سے معلوم ہوا کہ وادیٔ سندھ کے لوگ مال مویشی اور کھیتی باڑی کے ساتھ ساتھ تجارت بھی ان کا اہم پیشہ تھا۔ تجارت کے ساتھ ہی یہ لوگ فن اور صنعت سے بھی واقف ہو چکے تھے کیونکہ ہم نے دیکھا کہ ایک ہزار سال قبل مسیح تک ان لوگوں نے فن کاری، سکہ سازی، ہاتھی دانت کی چوڑیاں بنانا، تانبے کے زیورات اور لوہے کے اوزار بنانا سیکھ لیے تھے۔ اب آہستہ آہستہ وادیٔ سندھ کی تہذیب ہندوستان کے دیگر مشرقی علاقوں کی طرف پھل پھیل رہی تھی اور ۷ / ۸ ویں صدی قبل مسیح تک پورا ہندوستان تہذیب کی دنیا سے آشنا ہو چکا تھا وادیٔ سندھ اور "تھل" کے لوگ بھی پہلی صدی عیسوی کے شروع ہونے تک تہذیب اور فن و ثقافت کے تمام رازوں سے واقف ہو چکے تھے اور اپنی غذائی

ضروریات پوری کرنے کیلئے مال مویشیوں کے ساتھ ساتھ کاشتکاری میں کافی حد تک مہارت حاصل کر چکے تھے۔ دریائے سندھ کے اس میدانی علاقے میں کاشتکاری شروع ہو چکی تھی جس میں گندم، چنا، باجرہ وغیرہ فصلیں کاشت کی جاتی تھیں۔ زیادہ تر فصلیں بارانی تھیں جبکہ کچھ حد تک مقامی لوگ گندم کی فصل کو برساتی ندی نالوں سے پانی نکال کر سیراب کر لیتے تھے۔ خاص کر ان لوگوں کا ذریعہء معاش مویشی پالنا تھا، اس کیلئے تھل قدیم کے قبائل اپنے جانوروں کے ریوڑوں کے ساتھ علاقے کی چراگاہوں میں پھرتے رہتے تھے اور جہاں ان کو جانوروں کیلئے چراگاہ مل جاتی تھی، وہاں جھونپڑی بنا کر ڈیرہ لگا لیتے اور ایک عرصہ تک وہاں قیام کرتے۔ اس طرح کی ہزاروں بستیاں دریائے سندھ کے مشرقی علاقہ تھل میں پائی جاتی ہیں۔ سماج میں ۵۰ فیصد لوگ خانہ بدوشی کی زندگی گزارتے تھے جبکہ ۵۰ فیصد لوگوں میں کچھ کا پیشہ تجارت اور صنعت کاری تھا۔ ایک اچھا خاصہ طبقہ جو سرداروں اور حکمرانوں کا تھا۔ ایک طبقہ جنگجو لوگوں کا بھی تھا جو علاقے کے مختلف سرداروں سے تنخواہ لیتے اور ان کیلئے لڑتے رہتے تھے۔ پہلی اور دوسری صدی عیسوی تک تھل کے تمام قبائل ترقی کی منزل تک پہنچ چکے تھے کیونکہ ہم نے دیکھا کہ قدیم روڑاں کے مقام پر پائے جانے والے کھنڈرات میں آثارِ قدیمہ کے نمونے ملے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُس وقت تک لوگ کافی مالدار ہو چکے تھے۔ یہاں سے ملنے والے آثارِ قدیمہ میں سکے، تانبے کے زیورات، عقیق، لاجرد کے نگ اور منکے، ہاتھی دانت کی چوڑیاں اور منکے وغیرہ اس بات کے مظہر ہیں کہ اس علاقے کے لوگ کافی حد تک مالدار اور خوشحال تھے۔

فن وثقافت:

ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں کہ وادیٔ سندھ کے قدیم قبائل ۲۰ ہزار سال قبل مسیح سے ہی تہذیب کی دنیا میں داخل ہو چکے تھے اور آہستہ آہستہ پورے ہندوستان میں تہذیب کا ارتقا اپنے منطقی انجام کو پہنچ چکا تھا۔ باقی ہندوستان کی طرح وادیٔ سندھ کے اس علاقے "تھل" جس میں پورا میدانی علاقہ شامل تھا، کے لوگ ہنر، فن اور ادب وثقافت سے واقف ہو چکے تھے۔ علم، تحریر اور

رسم الخط ان لوگوں میں عام تھا۔ ایک سے زیادہ زبانیں بولی جاتی تھیں۔ لوگ خروشتی کے علاوہ براہمی اور گریک زبان ساتھ ساتھ استعمال کرتے تھے۔ فن، کاریگری اور ہنر میں اس علاقہ "تھل" کے لوگ کافی تجربہ کار تھے۔ یہاں کے مٹی کے برتنوں کو وادیٔ سندھ میں خاص اہمیت حاصل تھی۔ ایک خاص قسم کے برتن یہاں تیار کیے جاتے تھے۔ قدیم روڑاں کے کھنڈرات سے ٹوٹے ہوئے برتنوں کے ٹکڑوں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ کاریگر برتن سازی میں ماہر تھے۔ نقش ونگار والے برتن اس علاقے میں عام طور پر تیار کیے جاتے تھے۔ برتنوں کے علاوہ مٹی کے بت اور مورتیاں جو مذہبی رسومات میں استعمال ہوتی تھیں، مقامی طور پر تیار کی جاتی تھیں۔ مٹی کے منکے اور ہاتھی، بیل اور پرندوں کی مورتیاں بھی قدیم روڑاں کے مقام پر تیار کی جاتی تھیں۔ اس کے علاوہ تابنے کے زیورات جن میں انگوٹھی اور چوڑیاں وغیرہ شامل تھیں، ہاتھی دانت کی چوڑیاں، منکے اور گلے میں پہننے والی تختیاں مقامی طور پر تیار ہوتی تھیں۔ ان سب سے اہم کام یہ تھا کہ فولاد لوہا یہاں مقامی طور پر تیار کیا جاتا تھا۔ روڑاں کے کھنڈرات سے بہت ساری بھٹیاں ملی ہیں جو اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ لوہا مقامی طور پر تیار کیا جاتا تھا۔ ان شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ اس علاقے کے لوگ فن، ادب وثقافت اور مذہب سے لے کر تحریر و تعلیم، ہنر اور کاریگری، الغرض سب کاموں سے واقف تھے۔ ہم نے دیکھا کہ برتن سازی ہو یا خام لوہے کی تیاری، تابنے کے زیورات ہوں یا سکہ سازی، کاشتکاری ہو یا تجارت، ان سب کاموں سے تھل کے مقامی باشندے واقف ہو چکے تھے۔

نوادرات:

ہم نے ان نوادرات کا جائزہ لیا جو ہمیں روڑاں کے مقام سے ملنے والے آثارِ قدیمہ کے نمونے جن میں سب سے زیادہ وہ سکہ جو مقامی حکمرانوں کے نام سے جاری کیا جاتا تھا، جو مختلف دور میں اس علاقہ تھل پر حکمران یا قابض رہے، اہم تاریخی ثبوت یا شہادت ہے جس کی مدد سے قدیم زمانے کی تاریخ وثقافت سے متعلق تمام حالات سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ سکہ ایک ایسی

تاریخی شہادت ہے جو گزرے ہوئے زمانہ سے متعلق آگہی دیتا ہے کیونکہ قدیم زمانے سے لے کر آج تک ہر بادشاہ کے دور میں اُس کے نام کا سکہ جاری کیا جاتا تھا۔ ہر بادشاہ کا نام اور مرتبہ اس پر کندہ ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ دوسرے نمبر پر وہ تحریری مواد جو کتبوں کی صورت میں ہندوستان کے تمام تاریخی مقامات پر پائے گئے ہیں، اہم شہادت گنی جاتی ہے جیسا کہ روڑاں کے کھنڈرات "بی" سے کچھ تحریر شدہ نمونے ملے ہیں۔ ساتھ ہی دیوی دیوتاؤں کے بت اور مورتیاں جو مٹی سے بنی ہوئی ہیں، جن کی تفصیل آگے آئے گی، جبکہ تابنے کے ٹوٹے ہوئے زیورات، ہاتھی دانت کی چوڑیاں، منکے، گلے کے ہار، مٹی کے منکے، ہاتھی، بیل اور پرندوں کی مٹی سے بنی مورتیاں، لاجرد اور عقیق کے منکے اور رنگ کافی تعداد میں پائے گئے ہیں۔ ان نوادرات کے علاوہ اس بات کے بھی ثبوت ملے ہیں کہ لوہا اور تانبا مقامی طور پر تیار کیا جاتا تھا۔ یہ بڑی مقدار میں ملا ہے۔ ہم نے دیکھا کہ وہ فولادی کوئلہ جس میں سے لوہا اور تانبا نکالا جاتا ہے، اس کیلئے قدیم روڑاں کے مقام پر سے ۵ / ٦ عدد بھٹیوں کے نشانات پائے گئے جہاں یہ کوئلہ پگھلایا کرتے تھے اور اس سے لوہا اور تانبا نکالتے تھے۔

سکہ جات:

قدیم تھل کے دیگر علاقوں اور روڑاں کے کھنڈرات اور اس کے آس پاس سے ملنے والے سکوں میں بہت سارے بادشاہوں کے دور کے سکے پائے گئے ہیں ۔ روڑاں اور تھل کے دوسرے مقامات سے ملنے والے سکوں کی نوعیت بھی کچھ ایک جیسی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ روڑاں کے مقام سے ملنے والے سکے تعداد میں بہت زیادہ ہیں جبکہ تھل کے باقی مقامات سے ملنے والے سکے تعداد میں کم۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ روڑاں کے کھنڈرات پر قدیم زمانے میں ایک بہت بڑا شہر آباد تھا جس کو اس علاقہ میں مرکزی حیثیت حاصل تھی جبکہ باقی تھل کے اکثر علاقے کی آبادیاں چھوٹی چھوٹی بستیوں پر مشتمل تھی جہاں سے یہ سکے ملے ہیں۔ ان کی مختصر تفصیل یہ ہے لیکن آگے ہم ان تمام سکوں کے علیحدہ نام اور تفصیل دیں گے۔ ان سکوں میں، جو ہمارے

پاس موجود ہیں، سب سے قدیم ترین سکہ یودھیا قبائل کا ہے۔ اس کے علاوہ یونانی باختری بادشاہوں میں اپالوڈوٹس، منندر، گمنام بادشاہ جسے سوٹرمیگس کا نام بھی دیا گیا ہے، اوران کے علاوہ کشان بادشاہ، کنشک، ہوکشک واشکا، واسو دیو اور آخری کشان بادشاہ جس کا نام گرمیئس بھی پڑھنے میں آیا ہے، جبکہ کچھ حدتک علاقہ تھل کے مقامی سترپ یاصوبیداروں کے بھی کچھ سکے ملے ہیں جن کی تفصیل اگلے باب میں آئے گی۔

یودھیا قبائل:

یودھیااقوام کے سکے بہت تھوڑی تعداد میں صرف روڑاں کی سائیڈ "اے" سے ملے ہیں۔ یہ قبائل ۳ / ۴ صدی قبل مسیح میں وادیٔ سندھ کے ان علاقوں پر حکمران تھے جس کو ریاست وہیکا کہا جاتا تھا۔ ان قبائل کے سکے کسی ایک نام سے نہیں، بلکہ ان اتحادی اقوام کے مشترکہ نام سے جاری کیے جاتے تھے جن کے ساتھ ان کا اتحاد تھا یعنی یودھیا جیوی۔ اس اتحادی سکے پر ایک طرف اتحادی قوم کا مشترکہ نشان تھا جس میں ایک سپاہی دائیں ہاتھ میں نیزہ لیے کھڑا ہے۔

اپالوڈوٹس:

قدیم روڑاں اور علاقہ تھل میں پائے جانے والے سکوں میں سب سے قدیم سکہ اپالوڈوٹس یونانی باختری بادشاہ کا ہے۔ وہ تقریباً ۱۵۵ / ۱۶۰ ق م کے قریب مغربی پنجاب تھل کے علاقوں پر حکمران رہا۔ یہ سکہ تمام سکوں سے سائز میں بڑا ہے۔ اس کا وزن ۲۵۵ گریس یونانی کے برابر ہے۔ سکہ کی ایک سائیڈ پر بادشاہ کی مورتی کے ساتھ گریک زبان میں بادشاہ کا نام جبکہ دوسری سائیڈ پر خروشتی تحریر موجود ہے۔

گم نام بادشاہ سوٹرمیگس:

یہ بھی یونانی باختری النسل بادشاہ تھا اور یوکرے ٹائیڈ کی فوج کا افسر تھا۔ یہ اپالوڈوٹس کے بعد مغربی پنجاب "تھل" کا حاکم بنا۔ سوٹرمیگس کے سکے بھی کافی تعداد میں تھل کے علاقے سے ملے ہیں۔ وزن اور سائز میں اپالوڈوٹس کے سکوں سے تھوڑے کم ہیں۔ سکے کی ایک سائیڈ پر

بادشاہ کی آدھی مورتی ہے جبکہ دوسری سائیڈ پر بادشاہ گھوڑے پر سوار ہے اور گریک رسم الخط میں بادشاہ کا نام تحریر ہے۔

کنشک :

یوچی قبائل میں پہلا بادشاہ کنشک تھا جس کے سکے روڑاں اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں پائے گئے ہیں۔ یہ سکہ وزن میں ۱۲۲ گریس کے برابر ہے۔ ایک سائیڈ پر خود بادشاہ کی مورتی اور گریک زبان میں بادشاہ کا نام تحریر ہے جبکہ دوسری سائیڈ پر آرتھوشوآگ کی دیوی بنی ہے جس کو وہ پوجا کیا کرتے تھے۔ ساتھ گریک زبان میں کندہ الفاظ انگریزی کے حروف (AQPO) سے ملتے جلتے ہیں جبکہ کنشک کے کچھ سکے جو شمالی گندھارا یا کابل کے علاقوں میں رائج رہے، ان پر مختلف مذہبی نشانات پائے گئے ہیں۔ ایک سکہ جو دوسرے سکوں میں سائز میں چھوٹا ہے، ایک رخ پر بدھ کی مورتی موجود ہے اور گریک میں (Boddo) تحریر ہے جبکہ ایک دوسرے سکہ پر آڈودیوی کی مورتی اور گریک میں نام (oado) تحریر ہے جبکہ ایک اور سکہ بھی ملا ہے جس پر ننواوشوا اور شوداد شنودیوتا کی مورتی اور نام درج ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ کنشک نے سیاسی حکمت عملی کے تحت اپنی سلطنت کو وسعت دینے اور تمام علاقوں کے عوام کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے ایسا کیا اور ہر علاقے کے مذہبی رنگ میں خود کو ڈھال لیا۔

ہوکشک، واشک :

ہوشک کشان بادشاہ کے سکے بہت کم تعداد میں روڑاں کی سائیڈ "اے" سے ملتے ہیں جو دوسرے مرکزی سکوں سے بہت مختلف ہیں۔ ان کی حالت اتنی خراب ہے کہ ان کی نشاندہی کرنا بہت مشکل ہے لیکن ہوشک کنشک کے بعد اقتدار میں آیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسری صدی عیسوی کے اول میں جنوبی مشرقی علاقوں کا حکمران تھا جبکہ واسودیو کے سکے روڑاں کی "بی" سے بہت زیادہ تعداد میں ملے ہیں۔ ان کا وزن ان کا ۱۲۲ گریس ہے اور ان میں کچھ بالکل اچھی حالت میں پائے گئے ہیں۔ ان کی نشاندہی سے واضح معلوم ہوتا ہے کہ فرنٹ پر کنشک بادشاہ کی

مورتی اور گریک میں نام تحریر ہے جبکہ بیک سائیڈ دوسرے کشان بادشاہوں سے مختلف ہے جو وشنو دیوتا اپنے بیل نندی کے ساتھ مورتی نقش ہے اور یونانی بیکٹیرین زبان میں نام تحریر ہے۔ جو سکہ واسودیو کا روڑاں کے کھنڈرات سے ملا ہے، اس کی بیک پر شوا دیو کی مورتی ہے۔ اس کے نندی بیل کے ساتھ پائی گئی ہے اور یونانی زبان میں کچھ الفاظ بھی تحریر ہیں۔

آخری بادشاہ:

آخری کشان بادشاہ کے مختلف نام سامنے آئے ہیں۔ ان میں ایک نام گریٹس کا ہے۔ وہ کشان بادشاہ تھا جس نے ۵ ویں صدی عیسوی میں ہندوستانی فوج کی کمان کرتے ہوئے ایرانی بادشاہ کی فوجی مہم میں آمدہ کے مقام پر رومی فوج کا محاصرہ کیا۔ آمدہ کا وسیع و عریض قلعہ جو دریائے دجلہ کے مشرقی کنارے پر واقع تھا جبکہ دوسرا نام کٹیلاگ میں تحریر (kipanada) ہے۔ فرنٹ پر دوسرے کشان بادشاہوں کے سکوں کی طرح بادشاہ کی مورتی اور گریک زبان میں نام تحریر ہے جبکہ بیک پر آرخوشو دیوی اور نگاری زبان میں تحریر موجود ہے۔

یاد رہے کہ آخری کشان بادشاہوں میں ایک سے زائد لوگوں کے حکمران ہونے کے اشارے ملتے ہیں۔ ان تمام حکمرانوں میں ایک سربراہ تھا جن کا نام سکوں میں کندہ ہے۔ اس کے نام (Latadas-kushan) کا سکہ چلتا تھا جو سونے اور چاندی کی دھات سے بنے ہوئے تھے۔ اسی بادشاہ کے نام کا ایک سونے کا ایک سکہ بھی روڑاں کے مقام سے ملا جس کا وزن آٹھ گرام تھا اور یہ خالص سونے کا تھا۔ اس کی تفصیل مونوگرام میں آئے گی۔

سترپ یا صوبیدار:

روڑاں اور گردونواح کے علاقے "تھل" میں ایک سے زائد مقامی سرداروں کے سکے بھی ملے ہیں جن میں کچھ سکے تو واسودیو سے مشابہت رکھتے ہیں جبکہ باقی پر مختلف نشان ہیں۔ سٹار کی طرح کے سکے جو وزن میں بہت کم ہیں اور ساخت اور سائز میں چھوٹے جیسے پاکستانی روپیہ ہے، ملے ہیں۔ یہ سکہ مقامی طور پر تیار کیا جاتا تھا اور مقامی سطح پر لوگ ان سے لین دین کیا کرتے

تھے۔ یہ سکہ کہیں گول تو کہیں مربعی شکل میں ہوتا تھا جو ریاست سیتھیا کے ہندی، یونانی باختری اور پارتھی سرداروں کے علاقوں میں رائج ہوتا تھا۔ یعنی اس کرنسی کو آپ دوسرے لفظوں میں جعلی کرنسی بھی کہہ سکتے ہیں۔

سکندر گپت:

سکندر گپت ایک مقامی ہندو راجہ تھا جس نے ایک عرصہ کے بعد اپنے آباؤ اجداد سے ورثہ میں ملی ہوئی سلطنت کو وسعت دے کر ہندوستان کے اکثر علاقوں کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ گورے ہنوں کا پہلا حملہ جس میں دریائے سندھ کے مشرق کے تمام علاقے "تھل" اور گندھارا ٹیکسلا تک تباہ کر دیے گئے، اسی عہد میں ہوا۔ جب ان حملہ آوروں نے دریائے چناب کو پار کیا تو ان کا راستہ ہندوستانی راجہ سکندر گپت نے روکا جس پر ان کو شکست خوردہ ہو کر واپس لوٹنا پڑا۔ اس کے بعد ۵۰۰ء تک شمال میں ٹیکسلا، پشاور اور مغرب میں دریائے سے آگے کے علاقوں کو اس نے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ اس ہندی بادشاہ کے سکے زیادہ تر منکیرہ اور پٹی بلندہ کے علاقہ جو روڑاں سے تقریباً دس کلومیٹر مغرب میں واقع ہے، ملے ہیں۔ ان علاقوں میں کافی قدیم آبادیوں کے آثار اور کھنڈرات پائے جاتے ہیں۔ ان میں دو مختلف اقسام کے سکے پائے جاتے ہیں۔

دیوی دیوتا کے بت اور مورتیاں:

بت اور مورتیاں تقریباً چار قسم کی پائی گئی ہیں جو زیادہ تر روڑاں کے کھنڈرات سے ملی ہیں۔ تمام مورتیاں مقامی طور پر سرخ مٹی سے بنی ہیں اور سائز میں چھوٹی ہیں۔ یہ صرف چہرے اور گردن تک ہیں۔ ان میں لکشمی آردخشو، آرتھوشو دیوی، وشنو، شوا دیوتا کی مورتیاں شامل ہیں۔ ہندومت کو ماننے والے ان کو مقامی طور پر تیار کرتے تھے اور ان کی پوجا کرتے تھے۔

حیوانوں کی مورتیاں:

بیل، ہاتھی اور گھوڑے کی مورتیاں بھی روڑاں کی کھنڈرات میں پائی گئی ہیں۔ یہ مورتیاں بھی مقامی سطح پر مٹی سے تیار کی جاتیں تھیں۔ ان کے علاوہ کچھ پرندوں کی ٹوٹی ہوئی مورتیاں بھی

ملی ہیں جن میں ممکن ہے کہ کوے اور کبوتر کی مورتیاں بھی شامل ہیں۔ ان میں بیل کو ہندو مذہب میں خاص مقام حاصل تھا۔ واسودیو کشان کے سکوں پر وشنو دیوتا کے ساتھ نندی بیل کی تصویر پائی گئی ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ بیل ہندو مذہب میں ایک مذہبی علامت سمجھا جاتا تھا جبکہ گھوڑا اور ہاتھی ممکن ہے کہ جنگجو سرداروں یا شہ سوار طبقہ کی علامت ہو یا بطور نمائش ان کی مورتی بنائی گئی ہو۔ اسی طرح کوے اور کبوتر کی مورتی بھی کسی خاص مقصد کے لیے تیار کی جاتی تھی۔ یہ سب کی سب مورتیاں خالص مٹی سے مقامی سطح پر تیار کی جاتی تھیں اور ممکن ہے کہ یہ مورتیاں دوسرے علاقوں یعنی مشرقی ہندوستان میں سپلائی بھی کی جاتی ہوں۔ علاقہ تھل میں مٹی کے علاوہ خام پتھر یا چونے کی بنی مورتیاں کہیں نہیں ملیں۔ یہاں صرف مٹی سے تیار کی ہوئی مورتیاں پائی گئی ہیں۔

مٹی کے برتن اور اوزار:

روڑاں کے کھنڈرات سے تین چار قسم کے ٹوٹے ہوئے برتنوں کے ٹکڑے ملے ہیں۔ ان میں سیاہ پالش والے، سرخ، روغنی، پتھری چورا اور مٹی کے برتن شامل ہیں۔ سیاہ پالش والے برتنوں کے ٹکڑے کم تعداد میں ملے ہیں۔ یہ اکثر روڑاں کی سائیڈ "اے" پر پائے گئے ہیں۔

یہ سیاہ پالشی برتن یونانی تہذیب کا حصہ ہیں اور قدیم زمانے میں استعمال ہوتے تھے۔ سر مورٹیمر وھیلر کے مطابق سیاہ پالشی برتنوں کی خصوصی صنعت انفرادی انداز میں لگ بھگ ۵۰۰ قبل مسیح سے بھی پہلے ہندوستان کے شمالی اور مغربی میدانوں میں پہنچ چکی تھی۔ چھٹی صدی ق م کے نصف تک سلطنت فارس کی توسیع سے اور اکائمیتی بادشاہوں نے مغربی ہند کے سرحدی علاقوں میں جو بستیاں بسائیں، ان کی وجہ سے نئے طریقوں اور تکنیک سے شمالی سیاہ پالش والے مٹی کے برتنوں کی صنعت وجود میں آئی۔ یہ وہ دور تھا جب ایرانی شہنشاہ دارا کی فوج، جس کی کمان رستم کر رہا تھا، ایک عرصہ تک مغربی ہند یا پنجاب کے میدانی علاقوں پر قابض رہی۔ میرے خیال میں سیاہ پالشی برتنوں کی صنعت دارا سے پہلے اکائمیتی بادشاہ سائرس اعظم کے ہندوستان پر قبضے کے وقت سے یہاں قائم ہو چکی تھی۔

پتھری چورا:

یہ نمونہ بھی مغربی تہذیب کا حصہ لگتا ہے۔ ممکن ہے کہ بہت کم تعداد میں ہونے کی وجہ بھی یہی ہو کہ یہ پتھری چورا ملے برتن کسی مغربی حملہ آور کی آمد کے ساتھ ساتھ یہاں تک پہنچے ہوں لیکن ان جیسے برتن اس علاقے میں تیار نہیں ہوتے تھے۔ جس طرح مقامی سطح پر سرخ اور روغنی برتن کافی مقدار میں تیار کیے جاتے تھے، ان کے مقابلے میں سیاہ پالشی اور سفید پتھری چورا ملے برتن بہت کم تعداد میں پائے گئے ہیں۔ اس کی وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ یہ دونوں قسم کے برتن کسی مغربی حملہ آوروں کے ساتھ ایک مختصر وقت کے لیے آئے ہوں اور جب وہ حملہ آور واپس گئے تو یہ سیاہ پالشی یا سیلیٹی رنگ کے برتن بھی بند ہو گئے۔

سرخ روغنی برتن:

یہ سرخ روغنی برتن خالصتاً مقامی تہذیب کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ ان برتنوں میں استعمال ہونے والی مٹی کو ایک خاص طریقے سے فلٹر کر کے اس میں سے ریت کو نکالا جاتا تھا۔ یعنی ایک گڑھا کھود کر اس میں مٹی بھر کر اوپر پانی سے بھر دیا جاتا تھا۔ جیسے جیسے پانی خشک ہوتا رہتا تو ریت نیچے اور مٹی اوپر تہہ بنا لیتی تھی۔ مزید پانی خشک ہونے کے بعد ریت کے اوپر سے مٹی کو علیحدہ کر لیا جاتا تھا۔ اس طرح سرخ مٹی کو سفید اور سیاہ ریت سے علیحدہ کرنے کے بعد پھر سے مٹی تیار کر کے برتن بنائے جاتے تھے۔ کچی مٹی کے برتن تیار کرنے کے بعد ان کے اوپر آدھے حصہ پر سرخ روغن کے ساتھ نقش نگاری کی جاتی تھی۔ مختلف قسم کے نقش و نگار جو تصویر میں نظر آ رہے ہیں، ان کو آگ میں پکایا جاتا تھا۔ ان میں ہر قسم کے برتن شامل تھے۔ بت اور مورتیاں بھی اس مٹی سے تیار کی جاتی تھیں۔

برتن سازی ایک صنعت:

برتن سازی کو تہذیب وادئ سندھ میں ایک خاص اہمیت حاصل ہے کیونکہ جب سے انسان نے سماجی اور تہذیبی زندگی کا آغاز کیا تو انسان کی معاشی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے تین کام

بہت ضروری تھے۔ان کے بغیر انسانی زندگی تہذیبی منازل طے نہیں کر سکتی تھی۔ان میں ایک برتن سازی، دوسرا مال مویشی پالنا اور تیسرا کاشتکاری تھا۔ چونکہ انسان کی غذائی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے اناج کی ضرورت تھی،اس لیے کاشتکاری بہت اہمیت رکھتی تھی۔دودھ، گوشت اور کاشتکاری کے لیے جانوروں کی ضرورت اہم تھی۔اس کے لیے مویشی پالنا بہت ضروری تھا۔قدیم ہندوستانی لوگ مال مویشی بہت زیادہ تعداد میں پالتے تھے۔جبکہ تیسری گھریلو ضروریات کے لیے برتنوں کا استعمال بھی اہمیت کا حامل تھا۔اس لیے زمانہ قدیم میں صرف مٹی کے برتن ہی استعمال کیے جاتے تھے۔قدیم ہندوستان میں مٹی کے برتنوں کی بہت زیادہ اہمیت تھی۔مٹی کے برتن کارواج عام تھا اور یہ بہت زیادہ مقدار میں تیار کیے جاتے تھے۔اس لیے برتن سازی کو ایک صنعت کی حیثیت حاصل تھی۔اس کا ایک ثبوت مہا بھارت کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے جس میں قدیم زمانہ میں ایک کمہار کا ذکر ملتا ہے جس کی مٹی کے برتنوں کی صنعت تھی اور اس کے پاس پانچ سو مزدور کام کرتے تھے جبکہ اس کا ایک اور ثبوت جوروڑاں کے کھنڈرات سے ملا ہے، وہ ایک مٹی کا اوزار ہے جس کو مقامی زبان میں "کونیرہ" کہا جاتا تھا۔ یہ مٹی کا کونیرہ کمہار کاریگر برتن بنانے کے لیے استعمال کرتے تھے۔اس قسم کے کونیرے مقامی کاریگروں کے استعمال میں بھی ہوتے تھے جو کہ کچھ تعداد میں روڑاں کے کھنڈرات سے ملے ہیں۔ان کونیروں پر خروشتی زبان میں مخصوص الفاظ بھی نقش کیے گئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کے برتن سازی ایک صنعت تھی اور باقاعدہ مقامی حکومت ان سے ٹیکس لیتی تھی اور ان کی رجسٹریشن بھی ہوتی تھی۔

مٹی کے منکے:

یہ منکا نما گول چبوترا جس کی اوپر کی سطح اندر کو دھنسی ہوئی جبکہ نچلی سطح باہر نکلی ہوئی ہے۔گول منکا نما شکل کے درمیان میں سوراخ پایا گیا ہے۔ یہ منکا بڑے سائز کا ہے،تقریباً ۳۸ گرام اس کا وزن ہے۔ممکن ہے کہ یہ منکا کسی اور کام کے علاوہ گلے کے ہار میں استعمال ہوتا ہو۔ یہ خالص سرخ اور سفید رنگ کی مٹی سے بنا ہے۔ یہاں عام اور خاص قسم کے منکے بھی پائے گئے ہیں۔معلوم ایسا

ہوتا ہے کہ زمانہ قدیم میں عام لوگوں کے ساتھ کچھ امیر گھرانے بھی ایسے مٹی کے منکے گلے کے ہار میں استعمال کرتے تھے۔اس لیے دوقسم کے منکے بنائے جاتے تھے۔ یہ منکے سیکڑوں کی تعداد میں پائے گئے ہیں۔ایک اور بات جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسے مٹی کے منکے صرف متگر قدیم روڑاں کے مقام پر آباد لوگ استعمال کرتے تھے۔ یہ منکے کسی اور جگہ سے دریافت نہیں ہوئے۔

زیورات:

روڑاں کے آثارِ قدیمہ میں ایک سے زائد نمونے پائے گئے ہیں جن کی تفصیل پہلے آچکی ہے۔ان آثارِ قدیمہ کے نمونوں میں کچھ زیورات تو زنگ شدہ صحیح حالت میں ہیں جبکہ کچھ ٹوٹے ہوئے ہیں۔ان میں تانبے اور تھوڑی مقدار میں ہاتھی دانت سے بھی بنے ہوئے ہیں۔ جو ہاتھی دانت سے بنے زیورات ہیں، وہ چوڑیاں، کنگن ٹوٹے ہوئے جبکہ منکے اور تختی وغیرہ اصل حالت میں پائے گئے ہیں۔ ہاتھی دانت کے علاوہ تانبے سے بنے زیورات کی تعداد زیادہ ہے جن میں چوڑی، چھلا، انگوٹھی اور گلے کی تصویر نما تختی چوڑی اور انگوٹھی اکثر زنگ شدہ ٹوٹی ہوئی ہیں۔انگوٹھی کی اوپر والی جگہ پر نقش نگاری کے علاوہ کہیں کہیں مسخ شدہ تحریریں معلوم ہوتی ہیں۔تانبے کی انگوٹھی اور چھلا ہر سائز میں بچے بڑے اور عورت تمام استعمال کرتے تھے۔ان میں ممکن ہے عام وخاص کا فرق ضرور حائل ہوگا۔ان زیورات میں مٹی کا بڑے سائز کا منکا جو بہت زیادہ تعداد میں پایا گیا ہے۔ممکن ہے تمام لوگ یا مزدور لوگ یا مزدور طبقہ کی عورتیں گلے کے ہار پہنتی ہوں گی۔

نگینہ (پتھر کے منکے):

نگینہ جو خاص کر انگوٹھی اور گلے کے ہار میں استعمال ہوتا ہے، اس میں دوقسم کے پتھر دریافت ہوئے ہیں۔ایک لاجرد جبکہ دوسرا عقیق۔ ان کے علاوہ بہت تھوڑی تعداد میں نیلے اور سرخ لال رنگ کے چھوٹے منکے بھی پائے گئے ہیں۔ان کی شناخت تو نہیں ہوسکی، ممکن ہے کہ لال سرخ یاقوت اور نیلے نیلم پتھر ہوں، مگر عقیق اور لاجرد کے چھوٹے اور بڑے منکے بہت زیادہ تعداد میں ملے ہیں۔ لاجرد کا تو ایک ہی رنگ ہے جبکہ عقیق دو تین رنگوں میں ملا ہے۔ لال اور سفید۔ یہ

سب کے سب منکے ہیں۔اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ گلے میں منکوں کا ہار پہننے کا رواج عام تھا۔لوگ اپنی بساط کے مطابق پتھر، ہاتھی دانت اور مٹی کے منکوں کے ہار استعمال کرتے تھے۔ عقیق اور لاجرد کے علاوہ ہاتھی دانت اور مٹی کے منکے بھی بہت زیادہ تعداد میں پائے گئے ہیں۔یہ گول اور بڑے جبکہ ہاتھی دانت کے منکے چھوٹے ہیں۔لاجرد کے منکے گول، چورس، چھوٹے اور بڑے سائز میں لیکن عقیق کے منکے گول اور چھوٹے بڑے سائز میں ہیں۔اس کے علاوہ ہاتھی دانت کی گول اور چورس گلے کے ہار میں استعمال ہونے والی تختی جس کے درمیان میں کہیں ایک تو کہیں دوسوراخ ہیں، بھی ملی ہے۔معلوم ہوتا ہے کہ منکوں کے ساتھ ساتھ گلے کے ہار میں یہ تختی استعمال کی جاتی تھی لیکن انگوٹھی میں استعمال ہونے والے عقیق اور لاجرد کا کوئی خاص نگینہ نہیں ملا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایسے پتھر کو گلے کے ہار میں استعمال کرتے تھے نہ کہ انگوٹھی میں۔

چوڑی یا انگوٹھی:

یہ زیورات زیادہ تر تانبے میں پائے گئے ہیں۔ان میں زنگ شدہ ٹوٹی ہوئی چوڑی کم اور زیادہ تر انگوٹھی اور گول چھلے زیادہ ہیں۔قدیم متگر روڑاں کے باشندے تانبے کی انگوٹھی کا استعمال زیادہ کرتے تھے۔اس کی اوپر کی سائیڈ گول اور چورس جس پر کچھ نقش نگاری یا تحریر نقش ہوتی تھی۔اب جو ہمارے پاس اس کے نمونے موجود ہیں، وہ بالکل ٹوٹے ہوئے زنگ شدہ ہیں جن کی شناخت کرنا کافی مشکل ہے۔جو نوادر ہمارے پاس موجود ہیں، ان کو صاف کر کے تصویر جاری کی ہے۔تانبے کے علاوہ ہاتھی دانت کی چوڑی کا رواج بھی ہندوستان کے قدیم باشندوں میں عام تھا۔اس کا ذکر تہذیب وادئ سندھ کے باب میں ہم کر چکے ہیں۔باقی ہندوستان کی طرح مغربی ہند کے ان علاقوں ریاست وہیکا یا سیتھیا قدیم تھل کے باشندے بھی ہاتھی دانت کی چوڑی اور کچھ دوسرے زیورات جن میں منکے وغیرہ شامل تھے، کا استعمال کرتے تھے۔

اوزار:

روزمرہ میں استعمال ہونے والے اوزاروں میں مٹی اور پتھر دونوں قسم کے نمونے ملے

ہیں۔اس میں برتن، مٹی کا کونیرا جس کے ذریعے برتن کو اندر سے برابر کیا جاتا ہے، باٹ وزن کرنے والے سیر، آدھا سیر، پاؤ یا آدھ پاؤ، یہ سب کے سب پتھر کے ہیں۔ان کا وزن پاؤ دوسو گرام کے برابر ہے جوممکن ہے کہ یونانی گریس کے برابر ہو۔ باٹ گول پتھر کے ہیں جو چھوٹے اور بڑے سائز میں موجود ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ باٹ یونانی گریس میں ہیں۔ممکن ہے کہ اس زمانے میں ناپ تول یونانی گریس میں ہوتا ہو کیونکہ ہم نے دیکھا ہے کہ سکوں کا وزن یونانی گریس کے مطابق تھا۔کونیرا ایک ایسا مٹی کا اوزار ہے جو مٹی کے برتن بنانے میں استعمال ہوتا ہے۔اس کو برتن بنانے والے کاریگر استعمال کرتے تھے۔ یہ گول مٹی کا ایک ڈھیلا ہے مگر ایک لحاظ سے بہت اہمیت کا حامل ہے۔ کاریگر اس اوزار کی مدد سے نرم مٹی کے برتن کو گول اور اس کو باریک کرتے تھے۔ دوسرا یہ گول کونیرا اس لیے اہم ہے کہ قدیم زمانے میں برتن سازی کو صنعت کی حیثیت حاصل تھی۔اس لیے اس کونیرا پر برتن بنانے والے مالک یا فرم کا نام (کوڈ) تحریر ہے۔اس پر خروشتی زبان کے تین حرف پائے گئے ہیں۔جیسے آجکل انگلش میں CCB-BBC وغیرہ۔اسی طرح کے تین حرف اس مٹی کے ڈھلے پر نقش ہیں۔

خام لوہا:

روڑاں کے کھنڈرات سے پتھر نما سیاہ رنگ کے ٹکڑے جو لوہے سے ملتے جلتے ہیں، بہت زیادہ مقدار میں پائے گئے ہیں۔ جب ان پتھر یا لوہے نما ٹکڑوں کو اکٹھا کیا گیا تو ان کی تحقیق سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ پتھری کوئلہ ہے جس سے لوہا تیار کیا جاتا تھا۔ان سیاہ ٹکڑوں کو آگ میں گرم کرنے اور الیکٹرونکس ویلڈنگ راڈ کے ذریعے سے گرم کرنے پر پتہ چلا کہ یہ واقعتاً خام لوہا ہے جو درآمد شدہ پتھری کوئلہ سے مقامی طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ان مقامات کی بھی نشاندہی کی گئی ہے جہاں یہ لوہا تیار کیا جاتا تھا۔ان پتھری سیاہ کوئلوں کو برتن پکانے والی بھٹی، جو زمین میں گڑھا کھود کر بنائی جاتی تھی، میں استعمال کیا جاتا تھا۔ایک کونے میں کوئلہ رکھ کر اوپر آگ ڈال دی جاتی تھی۔ یہ کوئلہ کئی دن تک آگ میں رہتا تھا پھر مقررہ وقت پر سیاہ لوہے کی شکل اختیار کر لیتا تھا۔جس

کوممکن ہے کہ بعد میں دوبارہ کسی دوسری دھات کے ساتھ شامل کر کے نرم کیا جاتا ہو لیکن اس سے آگے معلوم نہیں کہ ان سیاہ ٹکڑوں کو کہاں اور کس مقصد کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ خالص لوہا تیار کیا جاتا تھا یا صرف اس خام مال کو باہر کے علاقوں میں برآمد کیا جاتا تھا، یہ علم نہیں ہو سکا۔ یہ تحقیق شدہ بات ہے کہ کوئلے سے لوہا تیار کرنے کی صنعت یہاں موجود تھی۔ اس کوئلے کو زمین کے اندر گڑھے میں بند کر کے پگھلایا جاتا تھا۔ پگھلا ہوا کوئلہ (لوہا) کافی مقدار میں پایا گیا ہے۔

تھل کے آثارِ قدیمہ

روڑاں کے قدیم کھنڈرات اور قدیم انسانی آبادی کے آثار کے علاوہ تھل کے بہت سے اور بھی قدیم بستیوں اور قصبوں کے نشانات اب کھنڈرات یا ٹوٹے ہوئے مٹی کے برتنوں کے ٹکڑوں کی شکل میں میدانوں اور ریت کے ٹیلوں میں مدفون پڑے ہیں۔ یہاں سے اب بھی تاریخی مواد حاصل کیا جا سکتا ہے جیسا کہ سکے، مورتیاں اور برتن وغیرہ۔ ایسے مقامات تھل کے طول و عرض میں بکھرے ہوئے ہیں۔ روڑاں کے جنوب میں تحصیل چوبارہ کے علاقہ جبکہ شمال میں تحصیل منکیرہ کے ریگستان جہاں بہت سے ایسے مقامات ضرور ملیں گے۔ ان مقامات میں چوبارہ کے قریب لوڈے والا، لبیراں والا، ہزارے والا، نواں کوٹ اور بٹ والا وہ مقامات ہیں جن کا تاریخی تعلق وادیٔ سندھ کی قدیم تاریخ سے ہے۔ ہڑپہ میوزیم کے انچارج حسن صاحب نے ان مقامات پر تحقیق کی ہے۔ ان کے مطابق ان تمام مقامات کا تاریخی تعلق دوسری صدی قبل مسیح سے لے کر پانچویں صدی عیسوی تک ہے۔ اس دور میں بہت ساری اندرونی اور بیرونی اقوام جن میں یونانی، باختری، پارتھی، ایرانی، یوچی کشان اندھرا اور گپت خاندان کے لوگوں نے ان علاقوں پر حکمرانی کی۔ یہ وہی دور تھا جب تھل کا علاقہ ریاست وہیک اور سیتھیا کے نام سے مشہور تھا۔ خاص کر سیتھیا ریاست تھل پر جب مختلف اقوام کا قبضہ تھا۔ ان میں ہندی، سیتھی، باختری اور پارتھی قومیں شامل تھیں۔ یہ پہلی صدی تا تیسری صدی عیسوی کا دور تھا۔ اس وقت اس علاقے تھل میں جگہ جگہ لوگوں

کی چھوٹی بڑی بستیاں قائم تھیں جن کے آثار اب بھی تھل میں دستیاب ہیں اور یہ تھل کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے ہیں۔ان مقامات سے کچھ حد تک ان بادشاہوں کے سکے جو اس زمانے میں حکمران تھے، پائے گئے ہیں اور کچھ دوسری اشیاء جن میں مٹی کے برتنوں کے ٹکڑے یا مذہبی نمونے دیوی اور دیوتا کی بت مورتی، پائی گئی ہیں۔

کچھ چیزوں کی تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دوسری صدی ق م سے لیکر چوتھی اور پانچویں صدی عیسوی صدی تک کا زمانے شامل ہیں۔اب ان تھل کے مقامات کے متعلق تاریخی بیان اور تحقیق وشواہد کو منظر عام پر لانے سے پہلے ہمیں ان حالات و مسائل کا بھی ذکر کرنا پڑے جن کی مشکلات کی وجہ سے پریشانی میں مبتلا ہیں۔ وہ یہ کہ اس پورے تھل دریائے سندھ کا تکونی خط جو کسی زمانے میں قدیم ہندوستان کی شہ رگ تھا۔اس میں ایک تو یہ کہ وہ تمام آثار جن پر بہت عرصہ پہلے ریسرچ اور تحقیق کی جانی تھی، نہ ہوسکی اور اس کی بہت ساری وجوہات ہیں جو میں پچھلے باب میں تحریر کر چکا ہوں جبکہ دوسری بڑی وجہ یہ ہے کہ تھل گریٹر کینال کے منصوبے کی وجہ سے مغربی تھل کا وہ حصہ جو دریائے سندھ کے مشرقی کنارے کے ساتھ ساتھ تھا اور سب سے زیادہ آثار قدیم کے مقامات بھی اس علاقے میں تھے، وہ رقبوں کی تیاری اور پانی کے لگاؤ سے وہ تمام نشانات مٹ گئے۔اب بندۂ ناچیز نے کچھ حد تک علاقہ تھل کے ان قدیمی مقامات کے متعلق تحقیق ریسرچ شروع کی جن میں خاص کر روڑاں کا مقام شامل ہے۔ جب میں نے روڑاں کے آثارِ قدیمہ پر کام شروع کیا تو بہت مشکلات تھیں۔ایک تو بہت دیر ہو چکی اور دوسرا میری تعلیم اور وسائل کم تھے لیکن میں کچھ دوستوں کی وجہ سے اور اللہ کے فضل سے کچھ حد تک کامیاب ہو گیا۔

تھل کے اہم قدیمی مقامات

ویسے تو موجودہ تھل کی تاریخ کی اہمیت کا اندازہ آپ خود لگا سکتے ہیں جس کی تفصیل آپ کو (قدیم تاریخ تھل) میں مل سکتی ہے۔ یہ علاقہ کبھی تہذیب وادئ سندھ کا ارتقائی مقام تھا۔

ہندوستان میں وارد ہونے والی پہلی حملہ آور قوم آریہ کی ابتدائی آبادیاں، کبھی سکندر رومی کی آماجگاہ، کبھی ریاست وہیکا اور چینی کشان قوم کا مرکز اور کبھی باختری سرداروں کی ریاست سیتھیا۔ مغربی ہندوستان یا پنجاب کے اس علاقہ تھل کو ہر دور میں مرکزی مقام حاصل رہا ہے لیکن ۱۶ ویں اور ۱۷ ویں صدی عیسوی کے بعد یہ علاقہ مرکز سے بالکل کٹ کر رہ گیا جس کی وجہ سے تھل کے تاریخ مقامات کو اہمیت حاصل نہ ہوسکی۔ اس کے قدیم تاریخی مقامات تھل صحرا، ریگستان اڑتی ہوئی گرم ریت اور طوفانوں سے بننے والے ٹیلوں کی نذر ہو گئے۔ ان اہم تاریخی مقامات کے ثبوت اور نشانات ابھی تک اس علاقہ میں موجود ہیں جن میں سے ایک مرکزی مقام روڑاں کے آثار قدیمہ ہیں۔ اسی طرح کچھ ایسے مقام جو ۶ ویں اور ۷ ویں صدی عیسوی کے بعد آباد ہوئے، جو ابھی تک علاقے کے مرکزی شہروں میں شمار ہوتے ہیں، موجود ہیں۔ ان میں لیہ، منکیرہ، حیدر آباد تھل اور کروڑ لعل عیسن۔ یہ تمام قدیم شہر جو تقریباً ۷ ویں صدی عیسوی کے قریب آباد ہوئے، ان کی تفصیل آگے موجود ہے۔ ان مقامات کو زبیر شفیع غوری صاحب نے اپنی کتاب میں تفصیل سے نام دیے ہیں۔ ان مقامات کی تعداد ۱۶۰ کے قریب ہے۔

تھل کے قدیم قلعہ جات اور آبادیاں

قلعہ منکیرہ:

منکیرہ مغربی پنجاب کے علاقوں میں اہم مقام رکھتا ہے کیونکہ یہ ریاست کا صدر مقام ہونے کے ساتھ ساتھ یہاں ایک قدیم قلعہ ہے جو وسیع رقبہ پر پھیلا ہوا ہے۔ یہ تقریباً چھٹی صدی عیسوی گپت عہدِ حکومت میں تعمیر ہوا۔ ۱۹۰۰ء صدی عیسوی تک کئی سرداروں اور حکمرانوں کا مسکن رہا لیکن ۲۰ ویں صدی عیسوی کے شروع میں انگریز دور میں اس کی ریاستی حیثیت ختم کر دی گئی۔ ہم پہلے بھی قدیم تھل کی ریاست سیتھیا کا ذکر کر چکے ہیں جو ہنوں کے حملوں کی وجہ سے افراتفری کا شکار ہو گئی تھی۔ مزید گپت خاندان کے نرسمھ گپت اور سمدر گپت کمار گپت کے تمام مغربی ہند پر قبضہ

اور کنٹرول کی وجہ سے تھل میں ایک نئی ریاست کا قیام عمل میں آتا دیکھائی دیتا ہے جس کا صدر مقام روڑاں (متگر) کے بجائے اس کے شمال میں ۱۸ / ۲۰ میل کے فاصلے پر آباد ہونے والا نیا شہر منکیرہ تھا۔ ممکن ہے کہ اس شہر کا قدیم نام کوئی اور ہو۔

"تاریخ ریاست منکیرہ" کے مصنف دوست محمد کھوکھر کا بیان جو قابل بھروسہ تو نہیں ہے کہ ملوئی قوم کے ایک راجہ، جس کا نام وہ راجہ مل تحریر کرتے ہیں، نے تھل کے علاقے پر گپت خاندان کے عہدِ حکومت میں ایک چھوٹی سی مل کھیڑ یا کھیرہ نام کی حکومت قائم کی جس کے صدر مقام کا نام بھی مل کھیڑ کوٹ تھا۔ جبکہ ایک دوسری عام مقامی روایت ملتی ہے کہ منکیرہ جس مقام پر آباد ہے، یہاں پہلے ایک جھیل ہوا کرتی تھی جس کے دونوں اطراف میں ریت کے ٹیلے تھے اور گرمیوں کے موسم میں اس جھیل میں ٹیلوں سے ریت گرتی رہتی تھی، اس لیے اس مقام پر آبادی کا نام بھی اس جھیل کے نام "منکری" سے منسوب تھا جو بعد میں منکیرہ مشہور ہو گیا۔ یا پھر مل کھیڑا ریاست کے نام سے منسوب یہ شہر آباد ہوا جو بعد میں مل کھیڑا، ملکھیڑا، منکھیڑا اور پھر منکیرہ مشہور رہا۔

منکیرہ نام سے متعلق تمام تر بیان زبانی یا تاریخ منکیرہ کے مصنف جو نا قابلِ بھروسا ہے، سے استفادہ کیا گیا ہے۔ لیکن مورخ یعقوبی اور بلاذری، جو عرب سپہ سالار محمد بن قاسم کے ہمراہ ہندوستان آئے تھے، کا کہنا ہے کہ ملتان کے شمال میں واقع تھل کا علاقہ خوشاب تک چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹا ہوا تھا اور ان تمام ریاستوں پر ہندو راجے حکمران تھے۔ ان میں کچھ حاکم ملتان کے تحت اور کچھ خود مختیار تھے جبکہ خود صوبہ ملتان سندھ کے طاقتور حاکم راجہ داہر کے ماتحت تھا۔ اسلامی فوجوں کی آمد سے قبل تھل چار یا پانچ ریاستوں میں تقسیم تھا۔ شمال میں خوشاب یا چنیوٹ، جنوب میں اوچ، دریائے سندھ کے مشرقی کناروں کے ساتھ ساتھ ریاست کروڑ قدیم نام کہیر کوٹ جبکہ چوتھی صدی کا بربریکان اور وسطی تھل کی ریاست مل کھیڑا موجودہ نام منکیرہ۔ ریاست کروڑ پر للہیا نام کا ہندو برہمن راجہ حکمران تھا جس نے لیہ شہر کو آباد کیا جبکہ وسطی ریاست پر مل کھیڑا نام کا راجہ حاکم تھا۔ عرب تاریخ دان یعقوبی صفحہ ۲۵۶ اور تاریخ سندھ کے مصنف مولانا عبدالحکیم

صفحہ ۵۶ کے مطابق اسلامی افواج ۷۱۲ء تک پورے تھل پر قابض ہو چکی تھیں۔ تمام علاقوں پر کنٹرول حاصل کرنے کے بعد محمد بن قاسم نے اپنے گورنر مقرر کیے جن میں ملتان کے شمال کے علاقہ کا گورنر احمد بن خزیمہ بن عبتہ کو مقرر کیا جس نے منکیرہ ہی میں ۷۱۵ء کو وفات پائی اور یہاں دفن ہوا۔ اس کا مزار قلعہ منکیرہ کے مغربی کونہ میں اب بھی موجود ہے۔ ایک عرصہ کے بعد جب اسلامی سلطنت شام کے حالات اندرونی خلفشار اور جنگ وجدل کی وجہ سے بگڑی اور کمزور ہوئی تو ۹ ویں صدی عیسوی کے اول میں قنوج کے راجہ نے تمام علاقہ تھل اور مغربی ہندوستان پر قبضہ کر لیا۔ فخر مدیر مبارک شاہ اپنی کتاب "آداب الحرب والشجاعت" میں تحریر کرتے ہیں کہ قنوج کے راجہ جس کا نام مندر پال تھا، ۷۷۵ سے ۹۸۶ء تک حکمران تھا۔

یہ راجہ قنوج کے طاقتور بھٹی راجپوت خاندان سے تھا۔ اس نے دریائے سندھ کی وادی تک اکثر علاقے یعنی ہندوستان کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا جبکہ قدیم تاریخ ہند کے مصنف وی اے سمتھ صفحہ نمبر ۴۰۷ باب ۱۵ میں بیان کرتا ہے کہ ۱۰ ویں صدی عیسوی کے آخر میں دوبارہ اسلامی فوج جو پہلے کی نسبت کثیر تعداد میں تھی، پہنچ گئی۔ یہ فوج سبکتگین کی سربراہی میں ہندوستان پر حملہ آور ہوئی تو اس وقت مغربی ہند پنجاب کے علاقہ اور تھل پر قنوج کے راجہ وجے پال حکمران تھا۔

ایک دوسرے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ امیر غزنوی سبکتگین نے جب مغربی ہند اور پنجاب پر حملہ کیا تو اس وقت ریاست منکیرہ پر میکن اقوام کے لوگ حکمران تھے۔ اس قوم کے کسی بادشاہ کا نام معلوم نہیں۔ میکن قوم ایک لمبے عرصہ تک تھل کے علاقوں پر حکمران رہی۔ اس نے ۱۲۶۵ء کے قریب غیاث الدین بلبن کے دور میں بابا فرید گنج شکرؒ کے ہاتھوں اسلام قبول کیا جبکہ اس کے آخری دور کے سردار نواب بہاؤ خان کا نام سامنے آتا ہے۔ اس کے بعد ایک طویل عرصہ تک ریاست منکیرہ اور تھل کے متعلق کوئی بھی معلومات نہیں ملتیں۔

۱۶ ویں صدی عیسوی میں مغل بادشاہ ہمایوں کے دور میں چاکر خان رند کے خاندان کے ایک سردار یا صاحبزادے میر رند خان نے نواب غازی خان کو منکیرہ اور بھکر کی حکومت عطا کی۔

رند خان کی وفات کے بعد اس کے چھوٹے بھائی میر داؤد خان نے اس علاقے پر قبضہ کر لیا جو کچھ سالوں تک برقرار رہا مگر میر محمد داؤد ایک بہادر نوجوان تھا۔ اس لیے ڈیرہ اسماعیل خان کے ہوت حکمران اور ڈیرہ غازی خان کے میرانی نواب اس کے خلاف ہو گئے۔ جب وہ داؤد خان کو قابو میں نہ لا سکے تو انہوں نے متفقہ مغل بادشاہ اکبر سے داؤد خان کی سرکوبی کے لیے امداد کی درخواست کی جس پر عمل کرتے ہوئے شاہی لشکر نے داؤد خان پر حملہ کر دیا۔ اس جنگ میں داؤد خان مارا گیا۔ میر داؤد خان نے ہی میرانی اور ہوت سرداروں سے ناچاقی کے دوران قلعہ منکیرہ کو اپنا مسکن بنا لیا تھا۔ اس نے اس مقصد کے لیے قلعے کی مرمت اور اس کو وسیع بھی کیا۔

۱۸ ویں صدی عیسوی کے اختتام تک بلوچ قوم کے کئی سردار ریاست منکیرہ پر قابض رہے اس لیے یہ قلعہ کبھی قلعہ بلوچاں کے نام سے بھی مشہور رہا۔ آخری بلوچ نواب محمد خان سدوزئی ۱۷۸۰ء تک ریاست منکیرہ کا حکمران رہا۔ اسی دوران نواب مظفر خان والیءِ ملتان نے تیمور شاہ درانی کے حکم پر ۱۷۹۳ء میں عبدالنبی کلہوڑا کو تھل کے علاقے کا حکمران بنا دیا جو بیک وقت منکیرہ اور لیہ کے علاقوں پر قابض رہا۔

جب تیمور شاہ کی وفات کے بعد زمان شاہ درانی افغانستان کا بادشاہ بنا تو نواب مظفر خان نے منکیرہ، بھکر اور لیہ کے علاقوں پر محمد خان سدوزی المعروف نواب سربلند خان کو حاکم بنایا اور عبدالنبی کلہوڑا کو بے دخل کر دیا۔ سکھوں کے حملہ ۱۸۰۵ء تک ریاست منکیرہ پر نواب سربلند خان حکمران رہا۔

نواب سربلند خان کی وفات کے بعد نواب کے نواسے اپنے والد حافظ احمد خان کی سرپرستی میں منکیرہ اور ڈیرہ اسماعیل خان کا حکمران مقرر ہوا کیونکہ نواب سربلند خان اولادِ نرینہ سے محروم تھا۔ اس لیے نواب شیر محمد خان کو ولی عہد بنایا گیا جو نواب صاحب کا نواسہ تھا۔ رنجیت سنگھ نے جب پنجاب پر حملہ کیا تو ریاست منکیرہ بھی سکھوں کے حملے سے نہ بچ سکی اور رنجیت سنگھ نے بالآخر نواب خاندان کو شکست دے کر منکیرہ پر قابض ہو گیا۔

پٹی بلندہ:

پٹی بلندہ تحصیل منکیرہ اور ضلع بھکر کا قدیمی قصبہ ہے۔ یہ قصبہ روڑاں کے شمال مغرب میں دس کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔اس کی اچھی خاصی آبادی ہے۔ پٹی بلندہ نام کی وجہ تسمیہ جو زیادہ تر مشہور ہے وہ یہ کہ یہ علاقہ ایک بہت بڑی میدانی پٹی تھااور بارش کے پانی سے یہاں گھاس اور پانی سارا سال دستیاب رہتا تھا۔نواب محمد خان سدوئی زئی عرف نواب سربلند خان کے دور میں یہ میدانی پٹی نواب کے گھوڑوں کی چراگاہ تھی جس کی وجہ سے یہ پٹی سربلند خان کے نام سے منسوب ہوگئی تھی۔ بعدازاں یہ پٹی بلند خان اور پھر وقت کے ساتھ ساتھ نام تبدیل ہوا اور پٹی بلندہ کے نام سے مشہور ہوگئی۔ اگر ہم اس کی قدامت اور تاریخ کو دیکھیں تو اس موجودہ قصبہ کے جنوب مشرق میں ۲ / ۳ کلومیٹر فاصلے پر قدیم آبادی کے آثار اور نشانات پائے جاتے ہیں۔ یہ کھنڈرات تقریباً ایک کلومیٹر کے علاقہ پر پھیلے ہوئے ہیں۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس پر اچھی خاصی آبادی تھی۔

یہاں سے جو سکے ملتے ہیں یا ملے ہیں، ان سے واضح ہوتا ہے کہ اس آبادی کا تعلق ہندو شاہی دور یا اس سے پہلے گپت خاندان کے بادشاہ سکندر گپت اور سمدر گپت جن کا زمانہ چھٹی صدی عیسوی سے ساتویں صدی عیسوی تک تھا۔قدیم پٹی بلندہ کے کھنڈرات سے معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اس مقام پر ۸ ویں صدی عیسوی تک لوگ آباد رہے پھر بیرونی حملہ آوروں کے خوف سے یہ نقل مکانی کر کے منکیرہ کے مقام پر چلے گئے۔ اسلامی افواج جو محمد بن قاسم کی کمان میں مغربی ہندوستان پر حملہ آور ہوئیں تو ان کے ساتھ کچھ عرب مورخ بھی تھے۔ان میں سے دو ناموں کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں۔ان میں سے ایک یعقوبی تھا جو اپنی "تحریر" نامی کتاب کے صفحہ ۲۵۶ پر لکھتا ہے کہ ملتان کے شمال میں پورے تھل کا علاقہ خوشاب تک ۴ / ۳ ریاستوں میں بٹا ہوا تھا جن پر تمام تر ہندو راجے حکمران تھے جو سندھ کے راجہ داہر کے ماتحت تھے۔اس بات سے ظاہر ہوتا ہے کہ پٹی بلندہ کے مقام پر آبادی جس میں اکثریت ہندو تھی، وہ مسلم حملہ آوروں کے خوف یا

ان کی وجہ سے نقل مکانی کر کے شمال میں ۱۵ کلومیٹر کے فاصلے پر آباد مرکزی شہر منکیرہ منتقل ہو گئی۔ ان کھنڈرات سے ملنے والے آثارِ قدیمہ کے نمونوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ تمام تر آبادی اور حکومت ہندو مذہب سے تعلق رکھتی تھی۔

قلعہ حیدر آباد تھل:

یہ قلعہ ریاست "اموانی" کا صدر مقام تھا۔ منکیرہ سے مشرق کی طرف تقریباً ۱۲ میل کے فاصلے پر عین تریموں گھاٹ کے راستے پر واقع تھا۔ کچھ روایات کے مطابق یہ قلعہ اموانی میکن قوم کے ایک سردار نے ۹۹۰ء میں تعمیر کروایا لیکن ایک دوسری روایت سے پتہ چلتا ہے کہ یہ قلعہ بلوچ خاندان کے ہوت قبیلہ جو ڈیرہ اسماعیل خان میں حکمران تھا، نے تعمیر کروایا۔ جلال الدین محمد اکبر مغل بادشاہ کے دور میں محمد اسماعیل خان ہوت نے اپنے ایک بیٹے یا کسی قریبی رشتہ دار کو بطور جاگیر عطا کیا تھا جبکہ ایک بیان یہ بھی پڑھنے کو ملتا ہے کہ ہوت و میرانی بلوچ کے اتحاد نے جسکانی بلوچ نواب محمد خان سے ناراضگی کے بعد حیدر خان ہوت کو ایک حفاظتی چوکی تعمیر کرنے کا حکم دیا جس پر انہوں نے اپنے نام پر قلعہ حیدر آباد تعمیر و آباد کیا جو بعد میں حیدر آباد تھل کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ قلعہ پختہ اینٹوں سے تعمیر کیا گیا تھا۔ قلعہ قدیم پانچ ایکڑ رقبہ پر محیط ہے۔

اب اس قلعہ کی حالت خراب ہو چکی ہے۔ کسی زمانے میں اس کی رونق پورے آب و تاب میں ہوا کرتی تھی۔ اس قلعہ کا دروازہ مغرب کی طرف کھلتا تھا۔ اس کی چار دیواری کے ساتھ تین تین برج تھے جو قلعے کی حفاظت کے لیے بنائے گئے تھے۔ قلعے کے اندر ایک پانی کا کنواں بھی تھا جو پانی کی اندرونی ضرورت پوری کرتا تھا جبکہ قلعہ کے باہر چاروں طرف کنویں تھے جو خندق کو پانی سے بھرنے کے لیے مدد دیتے تھے۔ اس وقت قلعہ حیدر آباد تھل کھنڈرات اور ڈھیر کی شکل اختیار کر چکا ہے۔

انگریزوں کے دور میں اس کی پختہ اینٹیں اتار کر جھنگ تا بھکر سڑک کو پختہ کرنے کے لیے سولنگ تعمیر کیا گیا۔

لیہ (قدیم نام لیھہ):

لیہ جنوبی وسطی پنجاب کا ایک ضلع ہیڈ کوارٹر ہے اور تھل کا مرکز ہونے کے ساتھ ساتھ ایک قدیم شہر بھی ہے۔ لیہ کے ساتھ بہت ساری قدیم تہذیب وثقافت کا تعلق جوڑا جاتا ہے۔ اس سے متعلق بہت ساری تاریخی روایات بھی دیکھنے کو ملتی ہیں جو لیہ شہر کی آبادی اور نام کی وجہ تسمیہ کے بارے میں تحریر کی گئی ہیں۔ ان میں ایک بیان جو جدید تاریخ لیہ کے مصنف نے تحریر کیا ہے کہ لیہ شہر جس جگہ کو بیان کیا گیا ہے یہاں "لیاں" کافی تعداد میں اگی ہوئی تھیں، یعنی لیاں کا جنگل، جس کو کاٹ کر لیہ شہر آباد کیا گیا تھا۔ ایک دوسری روایت جو "بلوچ قوم اوران کی تاریخ" کی کتاب صفحہ نمبر ۳۶۲ پر رقم ہے کہ نواب غازی خان دوئم میرانی کے چار بیٹے تھے۔ ہر ایک بیٹے نے اپنے نام کا ایک شہر آباد کیا۔ ان میں ایک کمال خان میرانی جس نے ایک شہر دریائے سندھ کے مشرق کنارے شہر آباد کیا۔ یہ شہر" کوٹ کمالیہ" کے نام سے مشہور ہوا۔ کچھ عرصہ بعد یہ شہر" کمالیہ" اور مابعد صرف "لیہ" مشہور ہو گیا۔

اس کے علاوہ اور بہت ساری زبانی روایت ملتی ہیں جن سے لیہ شہر کو منسوب کیا جاتا ہے مگر ان ساری تاریخی تحریری یا زبانی شہادتوں میں حقیقت بہت کم پائی جاتی ہے۔ ایک تیسری تاریخی شہادت جو خاصی قدیم تحریروں میں پائی گئی ہے اور اس میں حقیقت کا پہلو بھی نمایاں طور پر نظر آتا ہے وہ " قدیم تاریخ ہند" وی اے سمتھ کی کتاب باب ۱۴ صفحہ نمبر ۶۲ ۴ جس میں مصنف نے تحریر کیا ہے کہ ہندوشاہیہ خاندان کا ایک برہمن "للہیا" راجہ چچ کے ملتان، کروڑ، خوشاب، تھل پر حملہ آور ہوا اور ۷ ویں صدی عیسوی ۶۳۰ - ۴۰ کے بعد تھل دریائے سندھ کے مشرقی خطہ میں برسر اقتدار آیا۔ خود چچ بھی ہندو برہمن خاندان سے تھا۔ چینی سیاہ ہون سانگ جو ساتویں صدی عیسوی کے وسط میں ہندوستان آیا، کا کہنا ہے کہ دریائے سندھ کا تکونی علاقہ سندھ کی سلطنت کا ایک صوبہ ہے جس پر ہندو برہمن قابض ہیں۔

سیاح اس علاقے کو "او۔ تین۔ پو۔ چی۔ لو" کا نام دیتا ہے جبکہ " تاریخ سندھ" میں بحوالہ چچ

نامہ قلمی کے لکھا ہے کہ ۶۲۷ء کے قریب راجہ چچ نے ملتان پر حملہ کیا تو ملتان کا حاکم اعلیٰ مع اپنے اہل وعیال کسی نا معلوم مقام کی طرف بھاگ گیا جس کے بعد ملتان پر چچ کا قبضہ ہو گیا۔ وہاں اس نے ایک ٹھاکر کو نگران مقرر کیا اور خود کروڑ اور برہما پور، دریائے سندھ کی تکونی ریاست اور علاقے کو مطیع اور فتح کیا۔ ان میں قدیم تھل کی اہم ریاست کروڑ بھی شامل تھی۔ ممکن ہے اس ریاست کا صدر مقام بھی کروڑ شہر ہی ہو۔ اسے بھی فتح کرنے کے بعد راجہ چچ نے یہاں ایک برہمن "للیا" کو حاکم مقرر کیا جس نے بعد میں دریائے سندھ کے مشرقی کنارے ایک شہر کی بنیاد رکھی جو کہ اس راجہ کے نام سے "للہیا" سے منسوب تھا۔ بعد میں وقت کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتا ہوا آج لیہ مشہور ہے۔

لیہ شہر تقریباً ساتویں صدی عیسوی کے آخر میں آباد ہوا کیونکہ ۸ ویں صدی ء کے شروع تک چچ خاندان برسر اقتدار رہا۔ للیا اور اس کا خاندان عربوں کی آمد تک اس علاقے پر حاکم رہا۔ وی اے سمتھ نے اپنی کتاب قدیم تاریخ ہند میں للیا برہمن کو ہندو شاہی خاندان کا ایک فرد لکھا ہے اور للہیا برہمن کا حملہ مغربی پنجاب پر ۹ ویں صدی عیسوی میں تحریر کیا ہے۔

مصنف مزید تحریر کرتا ہے کہ للہیا کا خاندان ۱۰ ویں صدی عیسوی تک حکمران رہا۔ اس یورپی مورخ نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ دریائے سندھ کے کنارے للہیا برہمن نے اپنے نام سے منسوب ایک شہر تعمیر کرایا اور اس خاندان کا خاتمہ بھی مسلمان حملہ آوروں نے کیا۔ سبکتگین امیر غزنوی اور محمود غزنوی کی فوج کے ہاتھوں ان ہندو ریاستوں کا خاتمہ ہوا۔ ۱۱ ویں صدی عیسوی میں لیہ، کروڑ مسلمان حکمرانوں کے قبضہ میں رہا۔ کبھی ملتان کے سدوزئی نواب حکمران ہوئے تو کبھی ڈیرہ غازی خان کے میرانی اور کبھی جسکانی بلوچ سردار اس علاقے پر حکمران رہے۔ تھل کا آخری مضبوط قلعہ منکیرہ جس کا آخری حکمران نواب سر بلند خان سدوزئی تھا، ۱۷ ویں صدی تک حکمران رہا اور آخر کار رنجیت سنگھ نے اس علاقے پر قبضہ کر لیا۔ سکھوں کے بعد انگریزوں نے ان سے یہ علاقہ چھین کر برصغیر میں شامل کر لیا۔

کروڑلعل عیسن :

قدیم لفظ کرور اور جدید شہر کروڑلعل عیسن دریائے سندھ کے مشرقی کنارے واقع ہے۔ جبکہ تھل کے مغربی کنارے وادیٔ سندھ کے قدیم شہروں میں کروڑ کو ایک حیثیت اور اہم مقام حاصل ہے۔ اس کو ہر دور میں باقاعدہ ایک تاریخی اور سیاسی حیثیت حاصل رہی۔ کبھی تجارتی بندرگاہ تو کبھی ریاست کا صدر مقام یعنی ہر دور میں یہ شہر رونق، آبادکاری اور تباہی و بربادی کے مناظر و مراحل سے گزرتا رہا۔ تھل کے تمام قدیم مقامات میں سے جن میں لیہ، جو اس وقت ضلعی ہیڈ کوارٹر ہے، بھکر، منکیرہ اور باقی جدید شہر چوک اعظم اور فتح پور، ان سب سے کروڑ زمانہ ماقبل تاریخ سے آباد چلا آ رہا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ اس کا مقام مختلف ادوار میں تبدیل ہوتا رہا ہو لیکن زیادہ فاصلہ کی دوری نہیں ہوئی ہوگی۔ کروڑ کا سابقہ نام جو اکثر کتب میں تحریر ہے، وہ کرور ہے۔ ہندو مت کی قدیم تحریر مہا بھارت میں مغربی ہندوستان کے علاقے میں ایک کوروکشتر نام کی ریاست کا ذکر آیا ہے جبکہ جدید نام کروڑ ہے جو بہت تھوڑی تبدیلی کے ساتھ مشہور ہوا۔ لعل عیسن کے اضافے سے کروڑلعل عیسن پکارا جانے لگا۔

کروڑ کو لعل عیسن کا خطاب جناب حضرت شیخ محمد یوسف المعروف مخدوم لعل عیسنؒ جو ۱۲ ربیع اول ۹۵۰ ہجری اور ۱۵۴۲ء میں یہاں تشریف لائے، اور ان کا مقبرہ بھی کروڑ شہر میں ہی ہے، کی نسبت سے یہ نام ملا۔ کروڑ کی قدیم تاریخ کے بارے میں ابھی تک کوئی واضح تحقیق سامنے نہیں آئی۔ صرف کچھ کتب میں بطور روایت یا واقعہ کے تحریر کیا گیا ہے۔ ان میں تاریخِ سندھ، چچ نامہ، بلوچ قوم اور اس کی تاریخ، البیرونی کی کتاب الہند، جبکہ ایک قدیم تحریر پری پلس کے نام سے منسوب کتاب جو پہلی صدی عیسوی کے آخر میں لکھی گئی، میں ذکر ملتا ہے۔ اس کا مصنف دریائے سندھ کے کنارے ایک تجارتی بندرگاہ کے متعلق کہتا ہے کہ بربریکان نام کا یہ شہر ریاست سیتھیا کی تجارتی بندرگاہ ہے۔ پہلی صدی کے بعد یہ شہر کرور یا کروڑ کے نام سے منسوب ہوا اور ریاست کے صدر مقام کی حیثیت سے سامنے آیا۔ وہاں ایک قدیم قلعہ بھی موجود ہے جس کے اب صرف آثار

اور ٹوٹی پھوٹی دیواریں نظر آتی ہیں کیونکہ جس طرح تھل کے دوسرے قدیم مقامات قلعہ منکیرہ، حیدرآباد، بھکر، خوشاب ویران ہو کر اپنا تہذیبی وثقافتی اور تاریخی حیثیت کھو چکے ہیں، اسی طرح کا حال کروڑ کا ہے۔ کچھ تو محکمہ آثارِ قدیمہ کی غفلت کی وجہ سے ان مقامات کا اصلی رنگ وروپ سامنے نہ آ سکا اور کچھ غیر ذمہ دار مصنفین اور تاریخ دانوں نے حقیقت کو بدل ڈالا اور ان کے ناموں کو اس طرح مسخ کر دیا کہ اب ان کی پہچان کرنا بھی مشکل ہو گئی ہے۔ جیسا کہ کروڑ لعل عیسن کو ایک سے زائد نام دے کر اس کی تاریخی حیثیت کو تبدیل کر دیا گیا۔ کروڑ کو کہیں دیپال گڑھ، کہیں دیپالپور اور کہیں کہبر کوٹ نام دیا گیا۔ حالانکہ تمام قدیم تاریخوں میں اس کا نام صرف کرور یا کروڑ رہا ہے۔ البیرونی نے بھی یہی نام دیا ہے جبکہ تاریخ سندھ اور چچ نامہ میں بھی لفظ کرور آیا ہے اور آج تک کروڑ ہی پکارا جاتا ہے۔

کروڑ کسی زمانے میں اس علاقے کی ریاست کا صدر مقام تھا لیکن اب ضلع لیہ کی تحصیل ہے۔ ۱۹۵۵ء میں تھل کینال پروجیکٹ کے آنے سے کروڑ کے آس پاس کے علاقے چالیس میل تک آباد اور سیراب ہو چکے ہیں جس کی وجہ سے تمام قدیمی مقام اور آثارِ قدیمہ کے نمونے غائب ہو گئے ہیں۔

کوٹ چوبارہ:

چوبارہ ضلع لیہ کی تیسری بڑی تحصیل ہے جو کہ تھل کے عین وسط میں واقع ہے۔ یعنی یہ صحرا میں گھرا ہوا قلعہ چوبارہ جو ایک چھوٹا سا کوٹ نما قلعہ تھا جو اب بالکل منہدم ہو چکا ہے۔ اب اس مقام پر تھانہ چوبارہ کی عمارت تعمیر ہو چکی ہے۔ چوبارہ کے مقام پر ایک چھوٹے سائز کا قلعہ تعمیر کیا گیا جو دوسرے لفظوں میں ایک حفاظتی چوکی تھی۔

ایک روایت میں آتا ہے کہ حاکم ملتان سید خضر شاہ جو امیر تیمور کے قبضہ ہندوستان ۱۴۰۹ء میں امیر تیمور کی طرف سے صوبہ ملتان کا حاکم مقرر کیا گیا، نے ان علاقوں میں حفاظتی چوکیاں تعمیر کروائی تھیں جن میں گڑھور، چوبارہ اور لیہ کے عارضی قلعے شامل تھے۔

دوسری روایت میں ہے کہ بھکر اور منکیرہ کے بلوچ سرداروں نے صوبہ ملتان کے حاکم کے ڈر سے یہ حفاظتی چوکیاں تعمیر کروائی تھیں جن میں چوبارہ، نواں کوٹ اور مہرے والا کوٹ شامل ہے۔ میرے خیال کے مطابق کوٹ چوبارہ سید خضر شاہ حاکم ملتان نے تعمیر کروایا جبکہ نواں کوٹ کی چوکی منکیرہ کے بلوچ سرداروں نے تعمیر کرائی تھی۔ چوبارہ اور نواں کوٹ کے درمیان ۲۲ کلو میٹر کا فاصلہ حائل ہے۔ یہاں صوبہ ملتان کی عمل داری کو روکنے کے لیے بلوچ سرداروں نے نواں کوٹ میں ایک چھوٹا سا قلعہ تعمیر کروایا جہاں عارضی طور پر کچھ فوج رکھی جاتی تھی۔ جیسا کہ اب سرحدوں پر بارڈر فورس رکھی جاتی ہے۔

نواں کوٹ:

نواں کوٹ ایک چھوٹا سا قلعہ نما کچی اینٹوں سے بنا ہوا تھا جس میں ۲ / ۳ برج جن کی اونچی تقریباً دس میٹر، یعنی ۳۰ سے ۴۰ یا ۵۰ فٹ اونچائی، بنے تھے۔ ان برجوں میں پچاس فوجیوں کے رہنے کی جگہ تھی اور برجوں کو آپس میں حفاظتی دیوار سے بند کیا گیا تھا۔ یہی طریقہ چوبارہ قلعہ کا بھی تھا لیکن قلعہ چوبارہ سائز میں نواں کوٹ سے تھوڑا بڑا تھا۔ اور اس میں نواں کوٹ کی بجائے زیادہ فوج رہنے کی جگہ تھی۔ چوبارہ اور نواں کوٹ کے قلعے اب منہدم ہو چکے ہیں۔ قلعہ چوبارہ کے آدھے رقبہ پر تھانہ چوبارہ کی عمارت تعمیر ہو چکی ہے اور آدھے رقبہ پر لوگوں نے قبضہ کر کے گھر تعمیر کر لیے۔ قلعہ نواں کوٹ کے مقام پر بھی مقامی زمیندار قوم مگسی نے قبضہ کر لیا ہے۔ قلعہ کی عمارت کو گرا کر گھر تعمیر کر لیے گئے ہیں۔ اسی طرح جیسے قلعہ منکیرہ کو منہدم کر کے لوگوں نے گھر تعمیر کر لیے ہیں، پورے تھل میں آثارِ قدیمہ کے ورثے کو برباد کر کے رکھ دیا گیا ہے۔ کوئی بھی پوچھنے والا نہیں ہے۔ ہمارے تاریخی مقامات ایک ایک کر کے صفحہ ہستی سے مٹتے جا رہے ہیں۔ اس لیے ہم نے کوشش کی ہے کہ کسی حد تک ان تاریخی مقامات کی مکمل نہیں تو سرسری تاریخ قلم بند کریں۔

مہرے والا کوٹ:

مہرے والا کوٹ ایک حفاظتی چوکی تھی جہاں چوبارہ و نواں کوٹ کی طرح حفاظتی اور مخبر فوج

رہتی تھی۔ مہرے والا کوٹ موجودہ شہر فتح پور اور منکیرہ کے درمیان واقع تھا جہاں TDA کی وجہ سے زمین آباد ہوگئی تو چوبارہ نواں کوٹ کی طرح یہ کوٹ بھی کسانوں نے ویران کر دیے۔ جس مقام پر مہرے والا کوٹ موجود تھا، ۱۸۷۰ء میں یہ زمین ایک کسان کو الاٹ کر دی گئی جس کی وجہ سے یہ تاریخی ورثہ برباد ہو گیا۔ ان کوٹوں کے متعلق ہمیں جو تاریخی مواد ملتا ہے، ان میں دو طرح کی رائے پائی جاتی ہے۔ ایک تو یہ کہ یہ کوٹ امیر تیمور لنگ نے جب ہندوستان پر حملہ کیا تو ملتان اور اس کے آس پاس کے علاقوں پر سید خضر شاہ کو مقرر کیا اور یہ کوٹ بھی سید خضر شاہ نے تعمیر کروائے جبکہ دوسری روایت میں معلوم ہوتا ہے کہ میر داؤد خان رند بلوچ نے ڈیرہ اسماعیل خان ہوت سردار اور ڈیرہ غازی خان کے میرانی سرداروں سے اختلاف کی وجہ سے یہ کوٹ تعمیر کروائے۔ جو معلومات ہمارے پاس ہیں ان کے مطابق یہ کوٹ میر داؤد خان رند نے ہی تعمیر کروائے تھے۔
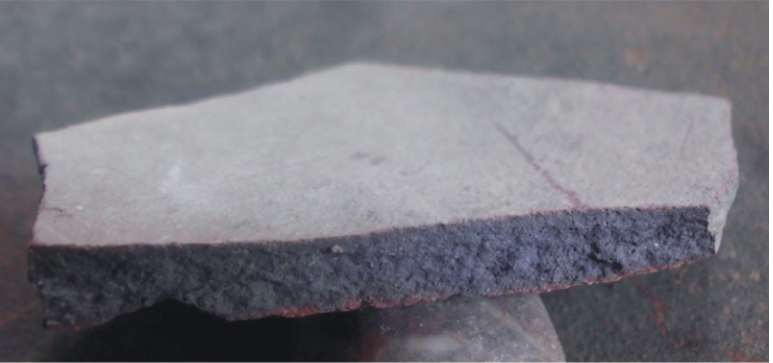
سیاہ سلیٹی رنگ کے برتنوں کے ٹکڑے جو یونانی تہذیب سے ملتے جلتے ہیں

وادیٔ سندھ کے قدیم باسیوں کی محنت کش زندگی کا ایک منظر
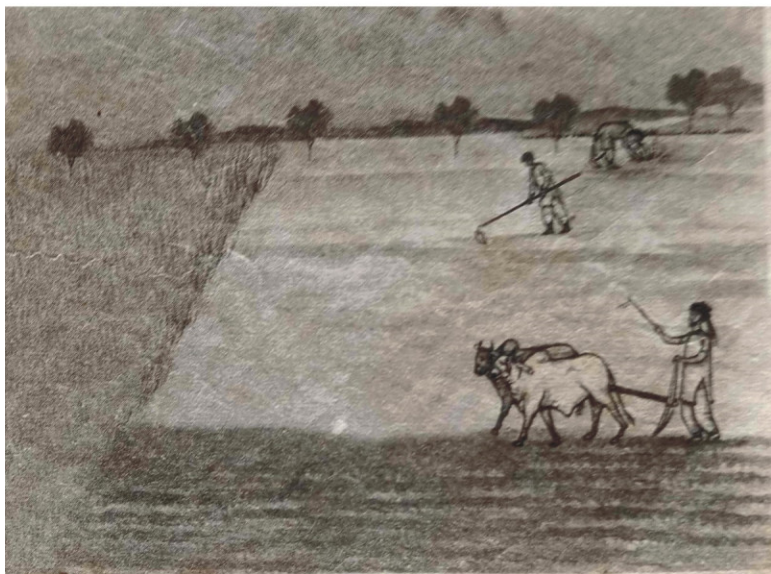
وادیٔ سندھ میں کاشتکاری کا قدیم طریقہ

روڑاں سائیڈ اے کے کھنڈرات

روڑاں سائیڈ بی کے کھنڈرات
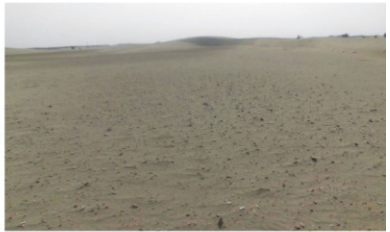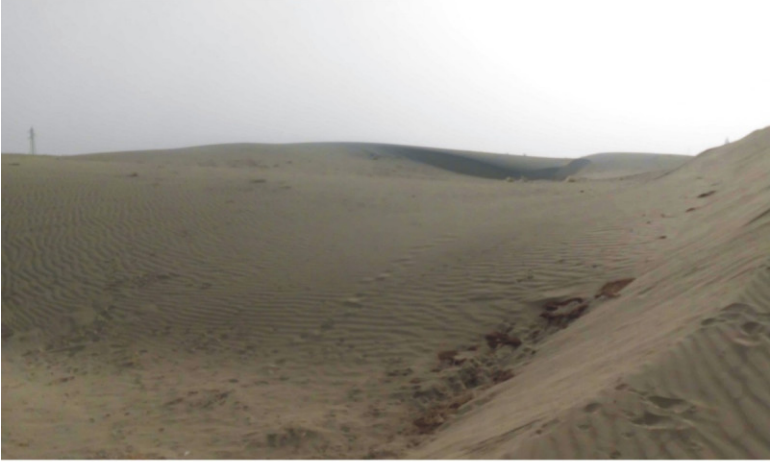
تھل کا اہم قدیمی قصبہ روڑاں

قدیم تاریخِ تھل
اور
روڑاں کے آثارِ قدیمہ
ملک محمد شفیع